العلم

سہ ماہی

کراچی



• علامہ اقبال علی گڑھ میں •

مکتوبِ علامہ اقبال

(بنام سر سید راس مسعود مرحوم)

لاہور ۲۶ جون ۳۶ء

ڈیر مسعود - تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اب خدا کے فضل و کرم سے بالکل اچھے ہو کیونکہ خط میں تم نے اپنی صحت کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

ضربِ کلیم یا اعلانِ جنگ زمانۂ حاضرہ کے خلاف، افسوس کہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ یہ میرا قصور نہیں، پریس کا قصور ہے۔ اب چار جولائی کا وعدہ ہے۔ اگر ۴ جولائی کو کتاب واقعی ختم ہو گئی تو advance کاپی ارسال کر دوں گا۔

۳ اپریل کی رات کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمہارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمد للہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو

[illegible]

• عطیہ: پروفیسر خلیل احمد قدوائی •

ٹیلیفون نمبر
دفتر ۶۱۱۱۹۶
مکان ۶۱۱۳۶۹

رجسٹرڈ نمبر جی - ۳۶۳

العلم کراچی

اقبال نمبر رح

سالانہ قیمت ۱۲ روپے۔ شمارہ خصوصی اقبال نمبر ۸ روپئے

جلد ۲۵ | جولائی تا دسمبر ۱۹۷۷ء | نمبر ۱ و ۲

فہرست مضامین

طابع: ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی۔ ایڈیٹر و ناشر: سید الطاف علی بریلوی (علیگ) مقام اشاعت: صدر دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱۵/۶۲ ڈی-۱ ناظم آباد کراچی

علامہ اقبال علی گڑھ میں!

سرورق کی تصویر علامہ کے تشریف آوری علی گڑھ کے موقع کی ہے، اور نایاب ہے۔ اسے پہلی بار 'العلم' میں شائع کیا جا رہا ہے۔ کرسی نشین حضرات میں داہنے سے بائیں (۱) مسٹر ہارن پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی ہیں جن کے فراموش شدہ حالات یہ ہیں کہ پہلے پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے بعد ۱۹۲۹ء میں سر سید راس مسعود (نبیرۂ سر سید علیہ الرحمۃ) یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے اُن کو علی گڑھ بلوایا اور اسٹیشن خود لینے گئے۔ مسٹر ہارن کا بڑا کام رحمت اللہ تحقیقاتی کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں اور ہالنگ کو روبہ عمل لانا تھا۔ اس اہم فرض کو انہوں نے شبانہ روز محنت کرکے انجام دیا اور اس سلسلہ میں وہ علی گڑھ کی سخت گرمی کے موسم میں بھی ٹھہرے رہے۔ جو اُن کو راس نہ آیا۔ ٹائی فائڈ میں مبتلا ہوئے اور پھر اُن کو لُو لگ گئی۔ اسی میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور علی گڑھ میں انگریزوں کا جو قبرستان 'سمیع منزل' کے قریب واقع ہے۔ اس میں دفن ہوئے۔

مسٹر ہارن کے برابر (۲) سر سید راس مسعود صاحب، ان کے بعد (۳) حضرت علامہ اقبال۔ علامہ کے دائیں جانب (۴) علی گڑھ کے نامور پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب ہیں۔ (۵) آخر میں مسلم یونیورسٹی راؤنڈنگ اسکول کے کپتان بیٹھے ہوئے ہیں۔ بقیہ سب نوجوان راؤنڈنگ اسکواڈ کے ہیں۔ علی گڑھ میں جب بھی کوئی عظیم شخصیت قدم رنجہ فرماتی گھوڑ سواروں کا دستہ باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتا تھا

علی گڑھ میں آمد چنانچہ جب حضرت علامہ تشریف لائے تو اسٹیشن سے وہ اُن کے ہمرکاب رہا۔ جیسا کہ جناب محمد عالم مختار حق صاحب نے "نقوش" اقبال نمبر بابتہ ستمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر فرمایا ہے۔ اور جس سے ہم نے بھرپور استفادہ کیا ہے حضرت علامہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کی رات لاہور سے فرنٹیر میل میں سوار ہوکر علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی شریک سفر تھے۔ ۱۸ر نومبر کی دوپہر کو علی گڑھ پہونچے۔ اسٹیشن پر اساتذہ معززین یونیورسٹی ٹاؤن اور طلبا صفیں باندھے اور پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے۔ حضرت علامہ گاڑی سے اترتے ہی سب سے ملے۔ پھر طلبا نے ان کے گلے میں ہار ڈالے۔ اتنے ہار کہ حضرت کا چہرۂ مبارک پھولوں سے چھپ گیا۔ استقبال کرنے والے طلبہ میں راقم (سید الطاف علی بریلوی) بھی تھا۔ میں نے اس وقت علامہ کو پہلی بار دیکھا۔ سر پر پگڑی۔ نیچی قمیص۔ ہاف کوٹ اور شلوار زیب تن تھی۔ پنجابی جوتا پہنے ہوئے تھے۔ میانہ قد۔ بھرا ہوا جسم، چہرہ انتہائی پرکشش لیکن اس پر طویل سفر کی تکان کے اثرات نمایاں تھے۔

اسٹیشن سے حضرت علامہ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے بنگلے پر گئے جو مسلم یونیورسٹی میں فلسفے کے چیرمین تھے۔ علی گڑھ میں انہیں کے ساتھ قیام رہا۔ ان دنوں سید سر راس مسعود صاحب کسی ضروری کام سے بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ ۱۹ر کو واپس آنے والے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب حضرت علامہ سے ملنے آئے اور اپنی تالیف "اسلامی ہیئت" (جو شائع نہ ہو سکی) کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ پروفیسر خلیل مراد صاحب (مرحوم) نے علامہ کو یونیورسٹی کی سیر کرائی۔ شام کو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے معزز مہمان کے اعزاز میں اساتذۂ یونیورسٹی اور دوسرے اکابر کو چائے کی دعوت دی۔

مولانا عبدالعزیز صاحب میمن کے ساتھ علوم مشرقی کے متعلق دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ رات کو پروفیسر خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج کے ہاں دعوتِ طعام تھی۔ لیکچر سر راس مسعود صاحب کی عدم موجودگی کے باعث نہ ہو سکا۔

۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء کو صبح ہی سے علامہ اقبال کے شیدائیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں پروفیسر شیخ عطاء اللہ (مسٹر ممتاز مسعود کے والد جنہوں نے خطوط اقبال مع مقدمہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرتب کر کے شائع کئے) اور مولانا نظیر شاہ وارثی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میزبان ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے بعد شام کو علامہ کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا انتظام کیا۔

اسٹریچی ہال میں جلسہ — پہلا خطبہ

اسی روز سر سید راس مسعود بھوپال سے واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ۱۸ نومبر کو علی گڑھ میں موجود نہ ہونے کے متعلق حضرت سے معذرت کی۔ ساڑھے چھ بجے شام اسٹریچی ہال میں لیکچر کا وقت تھا۔ وقت مقررہ پر علامہ کے وہاں پہنچنے سے پیشتر سارا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔

ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پہلے لیکچر کے صدر تھے۔ آپ نے تقریر خیر مقدم میں فرمایا۔ "تم سب اقبال اعظم" کو جانتے ہو۔ مجھ سے بہتر جانتے ہو میں ان کا کیا تعارف کراؤں۔ میرا تعارف "تعریف معروف بالمجہول" کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد سر سید راس مسعود نے حضرت علامہ کے متعلق تعریفی کلمات ارشاد فرمائے جن کا بیشتر حصہ انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں دورانِ سفر یورپ ایک موقع پر بیمار ہو کر ہسپتال میں پہونچ گیا۔ تو وہاں میری تسکین کا سامان حضرت علامہ کے وہ ایک ہزار اشعار تھے جو مجھے زبانی یاد تھے۔

اس کے بعد حضرت علامہ اپنا خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ابتدا میں وقت کی ضروریات کے لحاظ سے شریعت اسلامی پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنا پہلا خطبہ سنایا۔ جو جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس میں سنایا جا چکا تھا۔ حاضرین نے سارا خطبہ انتہائی غور و توجہ سے سنا۔ جلسہ ۶½ بجے سے شروع ہو کر آٹھ بجے تک جاری رہا۔ اور پھر صدر جلسہ نے حضرت علامہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

راقم (سید الطاف علی بریلوی) اس جلسہ میں بھی موجود تھا۔ یونیورسٹی کے کافی اساتذہ اور شعبۂ فلاسفی کے طلبہ کاپیاں اور قلم لے کر آئے تھے۔ مگر موضوع کے انتہائی ادق ہونے کے باعث کچھ بھی نوٹ نہ کر سکے۔ پیچھے کی صفوں میں بیٹھے ہوئے نوجوان طلباء نے اپنا ذہنی تکان دور کرنے کے لئے آخر میں حضرت علامہ سے درخواست کی کہ کچھ کلام ارشاد فرمائیں۔ اس درخواست کی پرزور تالیوں سے تائید ہوئی۔ جس پر علامہ دوبارہ مائیک پر آئے لیکن کلام سنانے کے بجائے نہایت تلخ لہجہ میں فرمایا کہ

"آپ لوگ کب تک شعر و شاعری کے دلدادہ بنے رہیں گے۔ میں شاعر ضرور ہوں لیکن عام شعرا جیسا نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ چھپ چکا ہے اُسے پڑھ لیجئے۔ ملک و ملت انتہائی نازک دور سے گذر رہے ہیں اور جو اہم مسائل درپیش ہیں وہ سخت محنت اور غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ تضیع اوقاتِ عزیز اور محض دماغی عیاشی کے تمام رجحانات ترک کر دئے جائیں۔ میں اس سفر میں اپنا کلام پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ لہٰذا معاف فرمائیے۔"

یہ کہہ کر علامہ ڈائس سے اُتر آئے۔ اور بکثرت مداحوں کے جھرمٹ میں اپنی قیام گاہ روانہ ہو گئے۔

علامہ کے مزید پانچ لیکچر اسٹوڈینٹس یونین ہال میں ہوئے۔ ایک ہفتہ قیام رہا۔ اور اس کل مدت میں مسلسل عصرانے اور کھانے کی دعوتیں رہیں۔ اس سے قبل یونیورسٹی میں شاید ہی کبھی کسی دوسرے معزز مہمان سے اس قدر اظہارِ عقیدت کیا گیا۔

ڈاکٹر سردار احمد خان

اقبال کا نظریۂ تعلیم

اقبال کے نظریۂ تعلیم پر کچھ کہنے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ تعلیمات اقبال کے مآخذ متعین کر لیے جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے فرمودات کی بنیاد کیا ہے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ اقبالیات کے طالب علموں کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شائقین اقبال مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں اور متضاد رائیں پیش کرتے ہیں۔ خیالات کی اس افراط و تفریط میں کسی متوازن اور صائب رائے کا قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور میں پرستارانِ اقبال کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کو کسی مغربی مفکر کے مقابلہ میں پیش کریں یا اقبال کی عظمت ان کے نزدیک اس بات میں ہے کہ ان کے خیالات کہاں تک دوسرے مغربی مفکرین سے مستعار ہیں یا ان پر کس حد تک اقبال نے ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ مذہب علم و ادب میں یہ فعل جس قدر کافرانہ، رفاستغانہ اور خاجرانہ ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اقبال کو کسی مغربی مفکر کے برابر لانا ایسا ہی ناممکن فعل ہے جیسے مشرق کو مغرب سے ملا دینا۔ اقبال کی ناموری اس میں نہیں ہے کہ وہ فلسفی ہیں یا مفکر ہیں یا مردِ حکیم ہیں بلکہ ان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ قرآن پاک اور حدیث مبارکہ کے مفسر ہیں، مبلغ ہیں اور معلم ہیں۔ ان کے نظریات کے مآخذ قرآن پاک اور حدیث پاک ہے اور جو شخص ان سے فیض اٹھائے گا وہ کسی اور کا خوشہ چیں کیوں کر بن سکتا ہے۔ ان کی تعلیمات اسلام کے ناقابل ترمیم اصولوں پر قائم ہیں، اسی لیے وہ بھی مضبوط، مستحکم اور غیر لچکدار ہیں۔ اقبال کا تفکر، تدبر، تفحص اور تعلّم جو کچھ بھی ہے وہ اسی دستور برحق کی تشریح و توضیح ہے۔ ہر وہ اصول جو اس کسوٹی پر پورا اترے اقبال کے ہاں محمود ہے ورنہ مردود اور مطرود۔ ساقیٔ کوثر ﷺ نے انہیں شراب لاالٰہ عطا کی ہے اور جو رند میکدۂ حقیقت سے سیر ہو کر نکلے وہ علم کائنات کے سرچشمۂ حیواں سے کیا پائے گا۔ تقدیس لاہوتی سے متصف ذات دنیا کے سمندر کی گہرائیوں میں موتی کی طرح اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہ اِلَّا ھُو

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیٔ طینت سے ہو گہر کا وضو

جب یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اقبال کی تعلیمات اسلامی عقاید اور روایات کی تشریح ہیں تو ظاہر ہے کہ اقبال کا نظریہ تعلیم بھی خالص اسلامی اقدار کا حامل ہوگا۔ اب غور یہ کرنا چاہیے کہ اسلام علم کا کیا مفہوم پیش کرتا ہے۔ نزولِ قرآن پاک کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کی ذات بابرکت کا وہ پہلو اجاگر ہوتا ہے جس میں آپ ایک معلم کی شکل میں جلوہ فرما ہیں اور قرآن پاک کے احکامات کی تعلیم دینے میں مصروف کار۔ اور یہ ایک عجیب تماشہ ہے کہ ایک اُمّی کے حضور میں وہ لوگ زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے ہیں جو علوم دنیوی میں دستگاہ بھی رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیاوی علوم جاننے کی بنا پر کسی کو عالم نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن پاک کے نزول کے وقت دنیا میں بے شمار علماء و عقلا موجود تھے لیکن قرآن نے ان کو عالم تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ان کو جاہل، ناواقف اور نادان کہا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام صرف اس کو عالم سمجھتا ہے جو اس کے پیش کیے ہوئے اصولوں پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جو قرآن کے بتائے ہوئے علم سے بے بہرہ ہے وہ خواہ دنیاوی علوم کا کتنا بڑا ماہر کیوں نہ ہو حقیقی معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

قرآن پاک نے بنی نوع انسان کو جس علم کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا وہ علم توحید و رسالت ہے۔ اسی علم کو ہم اسلام کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ قرآن پاک اس علم کو نسل انسانی کے لیے بنیادی اور اساسی علم قرار دیتا ہے۔ علم توحید و رسالت وہ کلیدی علم ہے جس سے آگاہی کے بعد کائنات کی تخلیق کی غرض و غایت معلوم ہوتی ہے۔ عام دنیاوی زندگی میں جب ہم کوئی مشین خریدتے ہیں تو اس کو استعمال کرنے میں مدد دینے کے لیے ایک ہدایت نامہ بھی ملتا ہے۔ جب ہم کوئی ادارہ قائم کرتے ہیں تو اس کے کچھ اصول مقرر کرتے ہیں۔ اگر ہمارا کسی شعبہ سے تعلق ہوتا ہے تو ہمیں وہاں کے جملہ ضوابط سے آگاہ کیا جاتا ہے اور جو حقوق و فرائض مقرر کیے جاتے ہیں ان کی بجا آوری خود اہل معاملہ کے لیے کارآمد ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی دنیا تو انسان کے تابع کر دی ہو لیکن اس کو چلانے اور ہمیں زندگی بسر کرنے کے طریقے نہ بتائے ہوں جبکہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو برتنے کے اصول ہوتے ہیں تو اتنی بڑی دنیا کے نظام کو چلانے اور زندگی بسر کرنے کے قواعد نافذ کرنا کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ نسل انسانی کے باہم روابط قائم رکھنے اور اشیائے کائنات سے مستفید ہونے کے لیے ایک عظیم طریق کار کی ضرورت لابدی ہے ورنہ ساری کائنات اختلال محض میں گرفتار ہو جائے۔ اس انتشار گمراہی سے بچنے کے لیے ایک دستور، ایک منشور اور اصول زندگی نازل کیا گیا جس کو قرآن کہا جاتا ہے اور اس کی فکری عملی تشریح رسول پاکؐ کی ذات گرامی نے فرمائی۔ اس دستور حیات نے انسان کو اس کے صحیح مرتبہ سے آگاہ کیا۔ اپنی محدود عقل و دانش کی وجہ سے وہ جن رموز کو نہ سمجھا تھا ان کی وضاحت کی گئی اور بتایا گیا کہ مظاہر کائنات میں سے کوئی چیز بھی انسان پر فوقیت نہیں رکھتی، سب اس کے محکوم اور تابع ہیں اور خدا کے علاوہ کسی کو خالق سمجھنا اور اس کی پرستش کرنا علم و آگہی کے منافی ہی نہیں بلکہ سراسر انسان کی توہین ہے۔ احکام الٰہی سے روگردانی کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ عاقبت کے احتساب کے خوف اور خدا کے قہر کی ہیبت نے بداعمالی کا سدباب کر دیا اور اس طرح جو معاشرہ وجود میں آیا وہ دیانت، امانت، صداقت، طہارت اور اطاعت سے معمور تھا۔ اس طریقۂ زندگی کو ہم اصطلاحاً علم دین کہتے ہیں۔ اور اس علم کے حاصل کرنے کے بعد ایک "بہتر انسان" کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ بہتر انسان اپنی پاکیزگی نظر اور طہارت قلبی سے جب کار جہانبانی سرانجام دیتا ہے تو عالمگیر فلاح کا دور دورہ ہوتا ہے۔

یہ "بہتر انسان" جس کو اقبال پیار سے کبھی براہیم کہتے ہیں، کبھی کلیم، کبھی صاحب فقر اور کبھی مرد مومن! جب نوع انسانی کی تہذیب و اصلاح کے لیے علوم کی تدوین کرتا ہے تو علم تاریخ کی بنیاد صداقت پر رکھی جاتی ہے۔ علم سیاسیات کی داغ بیل باہمی اخوت اور اپنائیت پر قائم ہوتی ہے۔ علم قانون ایک عام شہری کی شکایت پر مقتدر اعلیٰ کو عدالت میں کشاں کشاں لے آتا ہے۔ علم اخلاق و معاشرت آقا کے ہاتھ میں سوار غلام کے اونٹ کی مہار دے دیتا ہے۔ فلسفہ و حکمت نور ایمان کی چھاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔ ایجادات و اختراعات کی دنیا میں خشکیوں پر جہاز چلتے ہیں۔ علوم و فنون کا شوق سیاحت کو رواج دیتا ہے۔ طبیب مریض کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ معاشی منصوبہ بندی ایسی مکمل ہوتی ہے کہ زکوٰۃ لینے والے میسر نہیں آتے۔ علم جمادات و نباتات انسانی وسائل کو تقویت دیتے ہیں۔ علوم تن کی پرورش کا ذریعہ نہیں من کی آسودگی کا سبب بنتے ہیں۔ صرف ایک علم دین تمام دنیاوی علوم میں پاکیزگی اور صدق و خلوص کا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ صدیوں اس طرز تعلیم نے انسانیت کی خدمت کی لیکن

سولہویں صدی سے اس اسلامی نظام تعلیم میں کوتاہیاں پیدا ہونے لگیں اور علوم دنیاوی میں علم دین کی آمیزش کا عنصر کمزور ہونے لگا۔ اسی عنصر کو اقبال اپنی مخصوص اصطلاح میں عشق کے نام سے پکارتے ہیں اور اپنے دور میں وہ اسی جوہر کے متلاشی ہیں۔

لا پھر اک بار وہی بادہ جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

یہیں پر اقبال کے ہاں علم اور عشق، عقل اور بے خودی کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ اقبال کا عشق عقل پر حاوی ہے اور ان کی بے خودی علم پر حکمرانی کرتی ہے۔ عقل اور علم حقیقت کو پالینے کے لیے سرگرم رہتے ہیں جبکہ عشق یا بے خودی جسے ایمان اور وجدان کہہ سکتے ہیں حقیقت کو پالینے کا نام ہے۔ یہ جذبہ اور کیفیت خود تلمیذ الرحمٰن ہے۔ یہ خدا کے نور اور بندہ کے شعور کے مابین اک قدر مشترک ہے۔ یہ ایک دانش نورانی ہے جو دانش برہانی سے ارفع ہے کیونکہ دانش برہانی حیرت کی فراوانی ہے۔ علم مبتلائے حیرت ہے اور حیرت وہ حجاب ہے جو حقیقت کو سمجھنے میں مانع ہے جبکہ ایمان اور وجدان یا اقبال کی اصطلاح یعنی عشق سے کائنات کی نبض حرکت میں ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

انگریزی تسلط کے بعد میکالے رپورٹ کے تحت ہندوستان میں جو نصاب تعلیم رائج ہوا وہ مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج تھا کیونکہ اس نصاب تعلیم کی روح ہماری قومی اقدار کی ضد تھی۔ اس تعلیم کی خوبی یہ تھی کہ وہ خوئے غلامی کو مستحکم کرتی تھی۔ یہ مغرب کا ایک مکارانہ حربہ تھا۔ اس نظام تعلیم کے خلاف ہندوستان کی دیگر اقوام میں کسی قسم کی بے چینی پیدا نہیں ہوئی صرف مسلمان ہی تھے جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طریقہ تعلیم کی بنیادیں الحاد پر قائم تھیں گویا یہ باطل کی چیرہ دستی تھی جس کا مقابلہ صرف حق ہی کرسکتا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

لیکن ۱۸۵۷ء میں مسلمانانِ ہند کو جس تباہی ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کا شاید آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ سیاسی

احساس کمتری کی بدترین شکل اختیار کرگئی ...ت ایسی تہذیب تھی جس نے نفسیاتی طور پر تمام صلاحیتوں کو پامال کر دیا تھا۔ فاتحین کی برتری اور اپنی کم مائیگی ... ایک طرف مادی تقاضے تھے دوسری طرح مذہبی رشتے اور ان دونوں کے درمیان اس دور کا مسلمان کش مکش میں مبتلا تھا۔ بقول غالب

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

تعلیم، اصلاحات، قومی ترقی، آزادی، تہذیب و معاشرت کے تانے بانے بُنے جا رہے تھے جو بظاہر تو دلکش تھے لیکن حقیقت میں ایک ایسے جال کی مانند تھے جن سے رہائی ممکن نہ تھی۔ غالب نے کتنا بہتر تجزیہ کیا ہے۔

سبزہ و گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ اس باغ میں صیاد نہیں

ایسے حالات میں معمولی سی ترغیب پوری مسلم قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی تھی۔ غالب کی روایت کے بموجب

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں!

اس سوچ بچار میں دوسری قومیں جدید تعلیم حاصل کر کے انگریزی حکومت کی مشین کے کل پرزے بن چکی تھیں۔ مسابقت کے شدید احساس نے سرسید کو میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو لبیک کہا اور مسلمانوں کو تعلیم جدید حاصل کرنے پر زور دیا۔ سرسید خالص سیاسی رہنما تھے اور اگرچہ ان کو مذہبی رہنما نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم یہ قدیم تعلیم کا اثر تھا کہ علی گڑھ کالج میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کے ایک ہاتھ میں انہوں نے قدیم علوم و فنون دوسرے ہاتھ میں جدید فلسفہ و سائنس اور سر پر کلمہ لا الٰہ کا تاج ہونا پسند کیا تھا۔ لیکن انگریزی حکمت عملی نے نئی تہذیب کا جو جادو جگایا تھا۔ وہ سر پر چڑھ کر بولا جس کے راوی اکبر الہ آبادی ہیں۔

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقلِ مسلم سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
ترقی پائے گی قوم آپ کی پھر دورِ گردوں میں
عجب کیا ہے کہ پھر بہنے لگے اقبال کا دھارا
قیامت کر گئی قومی ترقی گردشِ مسلم میں
لگا کہنے زہے نعمت اگر حاصل شود مارا
اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بچشمِ مست او بخشیم تسبیح و مصلیٰ را
مصلیٰ کو غرض تہہ کر کے اٹھا عابدِ مشرق
جو طاقت آگئی تھی دل میں اس طاقت سے للکارا

ادھر تحریر، ادھر اسپیچ، ادھر سازش ادھر بندش
نے جوڑا، اسے توڑا، اسے گانٹھا اسے مارا
ڈنر، عہدے، تبسم، مشورے، وعدے، بنے گیسو
وہ گیسو، جس سے پھیلی ہر طرف عنبر سارا
وہ نوٹس، یہ کمیٹی، وہ چندے، یہ چٹ، ان کو طیش آیا
نہ ایماں میں رہی طاقت نہ دل میں ضبط کا یارا
نہ حالی کی مناجاتوں کی پرواہ کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا
نہ تھا یہ مطلب سید کہ اس رخ پر بہے دھارا
حباب آسا جو آسانی سے ٹوٹا گنبد مذہب
تو کیا اقبال و عزت کا ادھر بہنے لگا دھارا؟
کہیں تحقیر مذہب کی کوئی تنظیم کرتا ہے
بجھا کر نور دل کو کب ہے چمکا بخت کا تارا
بٹھایا کیوں نہیں جاتا یہ نقش جاں فزا دل پر
کہ روحانی ترقی میں ہو لڑکا عرش کا تارا

گویا جدید طریقہ تعلیم کا بنیادی نقص یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کی قومی اور مذہبی خوبیاں چھوٹ رہی تھیں اور یہی حیات قومی کی موت تھی۔ اقبال بھی اسی چیز کو محسوس کرتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

عقاید کی خرابی ایک ایسا حادثہ تھا جس کو آسانی سے برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بزرگوں نے جو کچھ کیا تھا وہ مصلحت وقت اور تقاضائے وقت کے اعتبار سے تھا۔ ان کی کوششیں پرخلوص تھیں لیکن جب فرنگی معاشرت ہی میں فساد ہوا اور اس کی روح ہی ضعیف نہ ہو تو اس میں مصلحین قوم کا کوئی قصور نہ تھا۔ ان کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بدقسمتی سے وہ ہاری ہوئی تھکی ہوئی قوم کے رہنما تھے لیکن اقبال نے ان کو تشرمند

ہونے نہیں دیا۔ تاہم ت کر دار پر ہمہ وقت نظر رکھنے والے اکبر تو نوجوان اقبال کی تعظیم ایک پیر دانا کی طرح کرتے تھے

دعوئ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آگیا

اقبال نے ماضی اور حال کو سامنے رکھ کر مستقبل کی تعمیر کی۔ مسئلہ تعلیم پر انہوں نے جو کچھ کہا وہ صرف ان کے محسوسات ہی نہ تھے بلکہ ذاتی مشاہدات اور تجربات تھے۔ وہ اپنی کشت ویراں سے ناامید نہ تھے وہ جانتے تھے کہ مٹی اگر ذرا نم ہو تو بہت زرخیز ہے۔ انہوں نے نہایت بے باکی سے مغربی تعلیم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کو دین و مروت کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم، ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف۔ انہوں نے اس طریقہ تعلیم کے خلاف جو فردِ جرم لگائی وہ کافی طویل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تعلیم ایسا تیزاب ہے جو کندن سے کندن قوم کو راکھ کر دیتی ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
بدن میں گرمیٔ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقہ آب وجد سے نہیں ہے بے زاری
جسور و زیرک و پُردم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری

فرنگی تعلیم اور اس کی تہذیب نجس ہے۔ اگر روح پاکیزہ نہ ہو تو نہ ضمیر پاک ہو سکتا ہے نہ بلند خیالی بیدار ہو سکتی ہے اور نہ ذوق لطیف کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ رُوح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ رُوح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند ذوق لطیف

انہوں نے کہا ہندوستان کے مکتب دوہری خرابی کا شکار ہیں۔ ان کی روح افرنگی ہے اور جسم ہندی۔ افرنگ لادینی افکار میں مبتلا ہے اور مشرق بے ربطی افکار سے پراگندہ ہے ان دونوں کے تال میل سے جو ذہن تیار ہوتے ہیں۔ ان میں پختگی نہیں ہوتی۔ عقل شتر بے مہار بن جاتی ہے اور افکار و خیالات میں کوئی سلیقہ اور تنظیم نہیں ہوتی۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی　　　اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کر دیتا ہے　　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق　　　عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

درس گاہوں میں جو اساتذہ ہیں وہ لکیر کے فقیر ہیں جو علم کی دولت انہوں نے حاصل کی ہے اس کو ایک بخیل انسان کی طرح سینہ کے صندوق

... یہ ... نہ اس دولت کو خرچ کرتے ہیں اور نہ اس میں اضافہ کرتے ہیں ہر چند کہ ان میں اہلیت ہے کہ کوئی اجتہادی کام سر انجام دیں ... مگر کے افلاس نے انہیں درماندہ بنا دیا ہے۔ ایسے لوگوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ نوجوانوں کی سیرت کو بنا سکتے ہیں۔

مقصود ہو گر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندے میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

طریقہ تعلیم سے بیزار ہو کر، مدرسوں سے نا امید ہو کر اور طالب علموں سے مایوس ہو کر اقبال نے ایک ذہنی قلبی اور فکری انقلاب برپا کرنے کی مہم شروع کی وہ اپنے جوانوں سے بالکل مایوس نہ تھے، انہیں اندازہ تھا کہ اگر ان میں جسارت اور غیرت پیدا ہو جائے تو شانِ قلندری رشک اوج سکندری ہو جائے۔

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

انہوں نے براہ راست جوانوں کو مخاطب کر کے وہی قدیم اسلامی نظریہ تعلیم پیش کیا جس میں فیضانِ نظر کی کارفرمائی تھی، مکتب کی کرامت نہ تھی۔

یہ فیضان نظر تھی یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

انہوں نے طریقۂ کار کی خامیوں کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے کہا کہ جوانوں کی نگاہ محدود اور ہاتھ کوتاہ ہیں ان کی دستگاہ اگر علم کے بلند شجرِ ثمردار تک نہیں تو یہ خود ان کا قصور نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی درویش کوئی اہل دل ان کی راہنمائی کرے۔

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ،
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

دوسری جگہ پھر اہلِ دانش کے مقابلہ میں اہلِ نظر کی تلاش کرنے پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ اس مرد خود آگاہ خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز۔ اقبال آگاہ کرتے ہیں کہ مدارس کے اساتذہ کی حیثیت ماچس کی سی ہے اور طالب علم کی کتاب بجلی کے بلب کی ہم

ماچس سے بلب کو روشن کرنے کوشش کتنی ہی کیوں نہ کریں بلب اس وقت تک روشن نہ ہوگا جب تک کہ اس میں برقی رونہ دوڑائی جائے۔ اگر طالب علموں کو شروع ہی سے اسلامی تعلیم دی جائے اور کچھ اللہ والے ان کی تربیت کریں تو وہ علم کی دولت سے مالا مال ہو جائیں گے۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اہل دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اقبال مرحوم کتابی بننے کو پسند نہیں کرتے بلکہ ادراک و شعور کو کام میں لانے پر زور دیتے ہیں۔ کتابی علم اجتہادی نہیں ہوتا وہ اس گندے تالاب کی طرح ہے جس میں توجہ نہ ہونے کی وجہ سے پانی سڑ گیا ہو۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

اقبال تلاش و تحقیق پر زور دیتے ہیں وہ وجدان صحیح کو روبہ کار لانے کو لازمی سمجھتے ہیں جب تک تعلیم نظریات کی تشکیل نہ کرے وہ مہمل ہے۔ علم کو اگر حصول معاش کا ذریعہ سمجھا جائے تو خودکشی کے مترادف ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اس نظریٔ جستجو علم کے حصول کی پہلی کڑی ہے اور دوسری کڑی اقبال نے خلوت کدہ و بیابان کو قرار دیا ہے۔ جس میں مشاہدۂ کائنات اور غور و فکر کی اہمیت کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ غور و فکر انسان کی عملی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور نامساعد حالات کی شب تاریک میں بہتر مستقبل کے دھندلکوں کو دیکھنے کے لیے تیز نگاہی اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو چراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ
فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نگاہ کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق ایسا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

اس مرحلہ پر پہنچ کر خودی کی تربیت مکمل ہوتی ہے۔ انسان کو اپنی صلاحیت پر اعتماد ہوتا ہے۔ اقبال سرکلیمی کو واشگاف کر دیتے ہیں۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

نظریۂ تعلیم کے حدود کی وضاحت کے بعد اپنے زمانے میں گزر کرنے کا نظریاتی طریقۂ کار قابلِ غور ہے۔

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر و ماہ نہیں
فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں
سنیں گے مری صدا خانزادگاں کبیر
گلیم پوش ہوں میں صاحبِ کلاہ نہیں

اقبال کے تجویز کردہ طریقِ تعلیم سے جونسل تعمیر ہوگی اس کی تصویر اقبال کے تصور کے پاکیزہ پردہ پر یوں جلوہ گر ہے۔

وہی جواں ہے قبیلہ کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہو کاری

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہو ہمہ ساز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلہ داری

اقبال کے نظریۂ تعلیم کے بنیادی اصولوں کو اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہی نظام کامیاب ہوسکتا ہے جس کی پشت پناہی مذہب کرے کیونکہ علم کے پیدا کردہ تشکیک و شبہات کا ازالہ روحانی بصیرت سے ممکن ہے۔

وہ علم بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا حکیم

۲۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اسلام کی ہمہ گیری ہر تقاضہ کو پورا کرتی رہے گی۔ اس لیے جدید دور کے تقاضوں کو بہانہ بنا کر ان کا تعلق اسلام سے توڑا نہیں جا سکتا کیونکہ ازل سے لے کر اب تک حیات کا سلسلہ قائم ہے، اور کائنات بھی وہی ہے اس لیے جدید و قدیم کی بحث فضول ہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

۳۔ اقبال علم کو نظری حدود تک محصور نہیں کرنا چاہتے بلکہ علم کے بعد عمل کے قائل ہیں۔ اصولوں کے بموجب جب تک سیرت کو نہ ڈھالا جائے تعلیم کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

۴۔ تمام علوم کا سرچشمہ عرفانِ ذات ہے۔ اسی سے دل میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے جو صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

۵۔ علم کا فروغ اور قیاس خود ساختہ اصولوں سے ممکن نہیں، علم سے اگر عرفان کو نکال دیا جائے تو وہ مُردہ ہو جاتا ہے، اس لیے علم کے لیے عرفان اور فکر و مشاہدہ ضروری ہے۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہداتِ حکیم

آخیر میں ایک سوال خواہ مخواہ ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اقبال جس کو ہم حکیم الامت کہتے ہیں اور ہمارا یہ خیال نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ اقبال کے پیغامات سے جدید اسلامی دَور کی تعمیر ہوئی ہے اور پاکستان ان کے خواب کی تعبیر ہے۔ پھر اس مردِ قلندر کے نظریۂ تعلیم کو ہم رواج کیوں نہیں دیتے۔ کیا ہم کو اب آنے والے زمانے کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جوانوں کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا موجودہ طریقِ تعلیم ہماری نسل کی تعمیر کے لیے موزوں ہے؟ اب جو نسل ابھر رہی ہے کیا وہ گزری ہوئی نسل کی صحیح جانشین ہے؟ بہت نازک مسئلہ ہے۔ غور کرنے کے قابل بھی اور حل کیے جانے کے لائق بھی۔

اِسلام آباد میں تعلیمی کانفرنس اور اُردو

ادھر کئی سال سے ہمارے رہنما اور دانشور قومی تشخص کی تلاش میں ہیں لیکن قومی سطح پر ہم نے ایک ایسی چیز نے جس کا تعلق بنیادی ہے، جو ہمارے تشخص کے اجزائے ترکیبی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، راہ دی ہے۔ وہ ہے اُردو زبان کا مسئلہ۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ ہماری قومی اور تعلیمی زبان وہی زبان ہو سکتی ہے جو ہماری روایات، احساسات اور جذبات کی پوری طرح سے ترجمانی کر سکے۔ مزید یہ کہ وہ ملک میں مختلف بولیاں بولنے والے انسانوں کے درمیان رابطہ کا کام بھی دیتی ہو۔ ظاہر ہے کہ پاکستان میں یہ اعزاز صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے۔ کہ وہ نہ صرف پاکستان میں بسنے والے لوگوں کے درمیان رابطہ کا کام دے رہی ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی وحدت کا نشان بھی ہے اور ہماری مذہبی، ثقافتی اور تاریخی وراثت کی امین ہے۔ گزشتہ دو سو سال میں ارباب نظر نے اپنی فکری تحقیقات کے لیے اس زبان کو اختیار کیا اور آج یہ اس مقام پر کھڑی ہے جہاں برصغیر کی کوئی دوسری علاقائی زبان خواہ بنگالی ہو یا گجراتی، سندھی ہو یا تامل، اُردو زبان کے مقابلے میں نہیں آتی۔ چنانچہ اُردو زبان کی اس منفرد پوزیشن کے پیش نظر جو اسے فطرت نے عطا کی ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان میں قومی وحدت کا سوال ہو یا تعلیمی معیار کو بلند کرنے کا مسئلہ۔ ملی تشخص کی بات ہو یا قومی خود اعتمادی کو بحال کرنے کا نکتہ، غرضیکہ ہمیں اپنے تعلیمی اور قومی بحران پر قابو پانے کے لیے اُردو زبان کا سہارا لیے بغیر چارہ نہیں۔ گزشتہ تیس سال کے واقعات نے یہ بتا دیا ہے کہ تعلیمی مسائل کا حل تعلیم کے نئے تقاضوں کو تسلیم کرنے میں مضمر ہے۔

...... مسرت کا مقام ہے کہ اسلام آباد تعلیمی کانفرنس میں ان مسائل پر غور و فکر کیا گیا اور ماہرین کی مرتب کردہ سفارشات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ الف۔ اے تک اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ ہر چند کہ یہ اس سلسلہ میں پہلا قدم ہے، لیکن اس سفارش پر فوری طور پر عمل کرنا چاہیئے، کیونکہ اگر ٹیکسٹ بکس لکھوانے کے بہلنے سے اس ادھوری سفارش کو ملتوی کیا گیا تو نتیجہ وہی برآمد ہوگا جو پہلے ہوا کہ ہم تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اس کے بعد تعلیمی معیار کی پستی یا اسلامی اور اخلاقی روایات سے دوری کا شکوہ فضول ہوگا۔ کیونکہ وقت کسی کی خاطر اپنی رفتار نہیں بدلتا اور تاریخ کسی کے لئے اپنا فیصلہ نہیں روکتی۔ جب ہم ان دونوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ تو پھر ہمیں ان سے گلہ کرنے کا حق بھی نہیں رہتا۔ (ماخوذ)

قطعاتِ تاریخ وفات

ڈاکٹر سر محمد اقبال رح

حکیم ظہیر الدین احمد فرشتی ۔ ویلور

وا دریغا سوے عقبیٰ زیں سرای　　ڈاکٹر "اقبال" گشتہ رہگرای
زود شد خلد بریں اقبال راہ　　تافتہ رو زیں جہانِ تنگنای
۱۳۵۷ھ

صاعقہ افتاد بر دل خوں بریخت　　خبرِ مرگ روح فرسا غم فزای
پنجشنبہ نوزدہ ماہ صفر　　جنت الماویٰ برفت "اقبال" وای
۱۳۵۷ھ

گفت "فرشتی" از دل رنجور سال　　انتقالِ ڈاکٹر اقبال ہای
۱۳۵۷ھ

دیگر

پنجشنبہ و بست و یک اپرل　　شور افتاد ناگہاں بہ جہاں
وقف ماتم شدہ است شرق چہ غرب　　وای "اقبال" رفت باغ جناں
۱۹۳۸ء

دیگر

دریغا بست و یک اپرل ہم پنجشنبہ بہ ناگاہ　　بفردوس ڈاکٹر علامہ "اقبال" رفتا آہ
۱۹۳۸ء

مسیحی سال "فرشتی" از دل رنجور گفت آں گاہ
سر علامہ محمد ڈاکٹر "اقبال" رفتا آہ
۱۹۳۸ء

بشکریہ رسالہ "اردو" اقبال نمبر ۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء

اقبال کا بنیادی خیال

از جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب رکن کانفرنس

"اقبال کی شخصیت میں ایمان، عشق اور فلسفہ اس طرح حل ہو کر ایک جان ہو گئے ہیں کہ ان کو جدا کر کے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ اندازہ لگانا ناممکن ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عقل سے بہت سا کام لیا ہے۔ گو کہ ہمیشہ اس کے خیالات میں جذبات اور حسن ادا اِک شورِ محشر بپا کرتے رہے ہیں۔ یہ اس کی شخصیت ہی کی کیفیت ہے کہ اس کا بنیادی خیال فلسفیانہ بھی ہے اور والہانہ بھی وہ تڑپاتا بھی ہے اور تسکین بھی دیتا ہے۔ صدہا جذبات اٹھ اٹھ کر اپنی نیرنگیوں سے اس کو گہرے اور ارفع احساسات کی طرف بڑھاتے ہیں مگر عقل اس کو جذبات میں بہ جانے سے روکتی ہے۔ وہ بے چین ہو ہو کر ہر طرف دیکھتا ہے کہ کوئی میرا ساتھ دینے والا بھی ہے یا نہیں۔ اس کو پروانے تو بہت نظر آتے ہیں۔ مگر کوئی بھی ساتھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ فریاد کرتا ہے کہ ۔ ۔ ۔

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست

پھر خود اس کا عالم رنگ و بو اور کائنات کے شور شغب میں اپنے ہی اندر ایک صلاحیت نظر آتی ہے جو بلا کی طاقتور ہے۔ یہ ذوقِ ایجاد اور اختراع ہے۔ وہ پہچان لیتا ہے کہ یہ ذوق و شوق قضا و قدر کی طرف سے ہر انسان کے لئے ایک انعام ہے جو اس کے خمیر میں موجود ہے۔ اس لگن کو دیکھ کر وہ حیران بھی ہوتا ہے اور ممنونِ احسان بھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ قوت کارخانۂ عالم میں بھی ہر طرف موجود ہے چنانچہ کہتا ہے کہ ——

اگر ایں خاکداں را واشگافی — درونش بنگری خونریزیٔ عشق

اسی قوت سے دنیا کے دور ترقی کی طرف بدل رہے ہیں اور خود انسان میں تبدیلیاں لا رہے ہیں۔ یہ قوت قدرت کی تخلیقی طاقت کا ایک عکس ہے، اسی لئے ہر چیز میں نمایاں ہے۔ مگر اس کی ہمہ گیر خاصیت کو پہچاننے میں بڑے بڑے عاقلوں نے غلطی کی ہے۔ اگر وہ اس کو پہچان لیتے تو اقبال کے ہمنوا ہو کر کہہ دیتے کہ —— ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

مگر انسان نے کل زندگی پر ایک جامع نظر ڈالنے کی بجائے یہ کیا کبھی اجزائے عالم کی طرف دیکھتا رہا تو کبھی فقط اپنے دل کی طرف کبھی ایک طرف ڈھل گیا تو کبھی دوسری طرف۔ اس کو خیال نہیں آیا کہ جب سارے عالم میں یہ خاصیت یکساں کارفرما ہے تو لازمی ہے کہ ہمہ گیر بھی ہو۔ اگر انسان کو احساس ہو جائے کہ قوت ایجاد کائنات میں تلاطم برپا کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرور ایک واحد طاقت ہو گی جس کا مقصد ارتقائے ہمہ رنگ ہی ہو سکتا ہے تو وہ کائنات میں متحد ہو کر اس کا روپ بدل دے۔

یہی ذوق انسان کو اتحادِ حقیقی کی طرف لے جائے۔ اور خود انسان کا عشق باکمال ہو جائے۔ اقبال نے یہ خیال طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ یہی خیال اس کا جذبۂ شعر بھی ہے اور یہی فلسفہ بھی۔ ؎

زشعر دلکش اقبال می تواں دریافت ۔۔۔ کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

باقی جو کچھ اقبال کے بیان، سحر آفرینی اور خیالات میں ہے وہ سب اسی نکتہ کی صراحت اسی کے اصول اور اسی راز کے سراغ ہیں جو ہم رنگی اور ہم آہنگی اس نے خود دیکھی اس کی تائید غیب سے اس کو اسلام کی تعلیم میں ملی اور پھر وہ فلسفہ، شعر اور ایمان کے اعدد زینہ پر چڑھتا ہوا عالم بالا کا رخ کرتا ہے اور کائنات پر سے گذرتا ہوا عرش تک پہونچنے کا مدعا رکھتا ہے یہ تفصیل اور اصول بہت اہم ہیں۔ کیونکہ ان سے یہ کھلتا ہے کہ کس طرح فرد کا ذوق اس کو ملت کے ضمیر میں ملا دیتا ہے اور پھر ملت اختراع میں مشغول ہو کر تسخیر کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اور اپنے ضمیر میں زیادہ سے زیادہ وسعتیں پیدا ہوتے دیکھتی ہے۔ یہی وسعتیں پھر فرد کے ضمیر کو متاثر کرتی ہیں اس طرح فرد اور جماعت کے سارے اختلاف بھی مٹ جاتے ہیں۔ اور دونوں ایک جان ہو جاتے ہیں فرد، جماعت اور عالم سب کی راحت و تکلیف کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ مادے اور روح کے تصادم کا حل ملتا ہے یہاں تک کہ موت اور حیات کی حقیقت کھل کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی ایک کوشش ناتمام ہے جس میں درد اور مصیبت تو ایک طرف موت بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

فرد میں جو قدرت نے تخلیق اور عمل کا عشق بخشا ہے۔ اس کو، اس کے ظہور اور اس کے عجائبات کو اقبال اسرارِ خودی کہتا ہے اور فرد کا جماعت کے ساتھ مل کر ایک مجموعۂ صفات پیدا کرنے کو جبکہ جماعت کی مسلسل زندگی جو صدیوں تک جاری رہتی ہے اور اپنی وسعتوں میں نئے نئے مقاصد کو حاصل کرنے میں مشغول رہتی ہے اور ان ہی وسعتوں سے پھر فرد کے سیراب ہونے کو رموزِ بیخودی کہتا ہے۔ ان اسرار اور رموز کے بغیر تخلیق کا عشق اقبال کے خیالات کا سنگ بنیاد تو رہتا ہے مگر اس بنیاد پر جو دلفریب اور شاندار عمارت تعمیر ہو سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس تعمیر کے نہ در نظر آتے ہیں۔ نہ دیوار، نہ بلند منزلیں نظر آتی ہیں اور نہ مینار۔

اس سے پہلے کہ ان اصولوں کی طرف اشارہ کیا جائے جو اقبال کے خیالات اور فلسفہ کی بلندیوں میں شامل ہیں یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کا نظریہ جب سارے انسانوں اور سب جماعتوں کے لئے ہے تو پھر اقبال اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے کلام کو اکثر و بیشتر کیوں محدود کرتا ہے۔ یہ سوال خود بخود ذہن میں آتا ہے کہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور وحدت خداوندی کی طرف وہ کیوں رخ کر لیتا ہے؟ اپنے خیالات کی رو کو وہ تردان کی طرف موڑ کر خالص روحانی ذریعہ سے اس کے راز کھولتا ہے وہ خالص عالم عقلی کی طرف بڑھ کر افلاطون کی ہمنوائی کرتا ہے اور نہ مادیت کی طرف مڑ کر مارکس کے انداز میں عقدہ کشائی کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال کے دل نے غور و فکر کے بعد یہ پایا کہ انسان کا خمیر جن عناصر سے بنا ہے ان میں روحانیت بھی ہے، مادیت بھی اور علم و عقل بھی۔ اس لئے کسی ایک طرف جھک جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ جب کبھی انسان نے ایسا کیا یا کرے گا تو فطرت کے تقاضوں اور ازلی آدابِ حیات سے اس کا ٹکراؤ ہوگا۔ اور اس کا ذوقِ تخلیق و تسخیر یا تو جلد ہی ناکامیاب ہو جائے گا یا مدت تک عارضی

کھیا بیول کے دھوکے میں پڑا رہے گا۔

اقبال نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور افلاطون کو یہ کہہ کر پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ عقل کا پتلا تو ہے، مگر اس میں ذوقِ عمل کی کمی ہے۔ اس عشق اور جستجو کی اس کو خبر نہ تھی، جہاں سے ارتقا کی سوتیں نکلتی ہیں۔ اس کی ہدایت پر عمل کیا جائے تو کائنات کی تسخیر کرنے کی بجائے انسان ایک راہب اور بزدل گوشہ نشین بن جائے گا۔ جس زندگی میں عملی جستجو نہیں وہ سنبھلنے اور سدھرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس نے افلاطون کے متعلق کہا ؎

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود　　　جان او رفتۂ معدوم بود

خالص روحانیت کی مثال اس نے بہت سے صوفیاء میں پائی۔ ان کی دلچسپیوں میں دنیا سے فرار پایا۔ ان کو لذتِ احساس سے محروم دیکھا اور معنی آفرینی کا مقصد پایا جس میں تخلیق اور تسخیر کی بجائے انتظار نظر آیا۔ اس کا پیغام ان کے نام یہ ہے ؎

زمن گو صوفیان باصفا را　　　خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم　　　کہ با نور خودی بیند خدا را

اقبال نے مغرب کا مطالعہ بھی کیا۔ وہاں مادیت کی جلوہ گری بھی دیکھی۔ کھوٹے اور کھرے کو پرکھا اور یہ سمجھا کہ عقل نے مادے پر حاوی آکر بڑی بڑی ایجادات تو کی ہیں، چنانچہ مغرب اپنی کیمیاگری سے ریگِ رواں کو زر تو کر سکتا ہے مگر اس کے دل سوختہ میں اکسیر محبت کم ہے۔ بغیر اس عشق کے جو ہمہ گیر ہے نہ اس کی بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور نہ اس کے حدود وسیع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس پر یہ راز کھل گیا کہ ؎

دل بیدار ندارند بہ دانائے فرنگ　　　ایں قدر ہست کہ چشم نگرانے دارند

یہ تو صحیح نہیں کہ اقبال نے تلاش اس طرح کی ہو کہ اس کا دل اسلامی تہذیب سے قطعی ناآراستہ ہو کیونکہ وہ روایاتِ اسلامی اور عقائدِ مسلمانی سے ہمیشہ سرشار رہا ہے۔ بچپن ہی سے اس کے دل میں اسلام کی تعلیم گھر کر چکی تھی۔ البتہ وہ گہرائیاں جن کی اس کو تلاش تھی، وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی تھیں اور وہ بیتاب ہو کر پکارتا تھا کہ ؎

نا امید استم زیارانِ قدیم　　　طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

وہ کائنات کے جزو کل کو دیکھنا تھا کہ ان کی تہ میں ایسا راز مل جائے جس سے وہ سارے تار جو ٹوٹے ہوئے نظر آرہے تھے، ایک ترتیب کے حامل اور ایک ہی بربط کے تار ہو جائیں۔ اس نے خود اپنی عقل کو استعمال کیا۔ اپنے فلسفہ داں دماغ سے کام لیا۔ اور اپنے اس دل سے صلاح کرتا رہا جو دردمند بھی تھا، حق شناس بھی اور قدرتی لگن سے بیچین بھی۔ اس بیچینی میں مولانا روم کی مثنوی کی دلآویزی نے، ان کے ذوق بیتابی نے، ان کی نظر راز شناس نے اس کی دستگیری کی اور ہمت بخشی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں بھی اس نور کی ایک جھلک ہے جس میں ایک نرالی ضیا ہے۔ اس کی نظر بھی سلاسلِ پنہاں کو دیکھ رہی ہے۔ نور بھی وہی ہے، جذبات بھی وہی ہیں۔ بس ان ہی کو عمل کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

یہ ابتداً خود اس کی تخلیق ہے۔ چنانچہ اسی نظم میں جس میں رومی سے ملاقات کا ذکر کرتا ہے یہ بھی کہتا ہے کہ ؎

ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت　　ہم چو فکر من در معنی نہ سفت

یہ اس کا نفسیاتی ارتقا تھا جس ترتیب سے اس کو اوپر بیان کیا گیا وہ تاریخی نہیں بلکہ خیالی ہے مقصد یہ ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے کہ اقبال نے مولانا روم کی تقلید ہی میں اپنے فلسفۂ عمل کو پایا۔ اسی طرح اس غلط فہمی کے امکان کو بھی دور کرنا مقصود ہے کہ اقبال کے احساسات اور عرفان کی ابتدا بعض فلسفیوں کی طرح خالص دماغی جستجو سے ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عقل کو اس نے اس سے زیادہ درجہ نہیں دیا کہ ؏

چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس کی روشنی میں تلاش ضرور کی، مگر جو بصیرت اس کو نصیب ہوئی اس میں اس کی عقل رسا کے ساتھ دل سوزمند اور اسلام کی تعلیم کا فیضان بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ؎

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم　　گرد پائے ملت بیضاستم

اس کی طفولیت اور نوجوانی کے ماحول اور تعلیمی اثرات کا اس کے دل و دماغ پر جو بھی اثر ہوا ہو اس سے تو وہ بچ نہیں سکتا تھا مگر اپنی طرف سے غیر جانب دارانہ تلاش اس کا مطمح نظر تھا۔ اسی تلاش میں اس کو اسلام کی دولت مل گئی چنانچہ سید عبدالوحید نے اپنی کتاب موسومہ "اقبال" میں بیان کیا ہے کہ اقبال نے ایک یورپین عالم کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ میری فارسی کی نظمیں اس غرض کی آئینہ دار نہیں ہیں کہ میں اسلام کی طرفداری کرتا ہوں بلکہ میں تو اس کا خواہش مند ہوں کہ بہتر سے بہتر نظام تمدن کی تلاش کر لوں۔ اگر مجھے ایسا ہمہ گیر نظام موجود مل جائے جس میں رنگ، ذات اور قوم کا فرق معدوم ہو تو میں اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسا نظام اس کو اسلام کی تعلیم میں ملا۔

وطنیت کا جو نقشہ اقبال نے مغرب میں دیکھا اس سے اس کو انسانیت کے مٹ جانے کا خوف ہوا جمہوریت کا چرچہ تو بہت سنا مگر دیکھا کہ ادھورے ادھورے اصولوں کو شافی اور کافی سمجھ کر سراہا اور پھیلایا جا رہا ہے حالانکہ ایک طرف تو وطنیت سے مخلوقِ خدا قوموں میں تقسیم ہو رہی ہے اور انسانیت کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف جذبہ تفریق کو اصول بنا کر پیش کرتے بنے ہوئے فرقے آپس میں ٹکراتے ہیں مگر مخلوق کی تباہی کے اس منظر کو تجارت کی زرگری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے اور اس طرح مقامی مادی اور نسلی مفاد پر خدا کے بندوں کو قربان کیا جا رہا ہے۔ ان قوموں اور فرقوں کی آنکھوں پر ایک اور پردہ اس موہوم تصور کا ڈالا گیا کہ گویا سب انسانوں کے ساتھ برابر کا سلوک ہے۔ سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور برابر عزت اور توقیر کے حق دار ہیں۔ مگر برابری کہاں رہی جب ایک قوم دوسری قوم کو زیر کرے، اس پر حاوی آئے اور اپنا مطلب پورا کرنے کے ہر وقت در پے ہے۔ خود ایک قوم میں بھی برابری نام کو ہے۔ کیونکہ برابری کا کوئی پکا اصول ان اقوام کے پاس موجود نہیں ہے فقط کہنے کی باتیں ہیں۔ روسو نے اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" کے پہلے باب کو اس فقرے سے شروع کیا کہ "ہر ایک انسان آزاد پیدا ہوا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے"۔ مگر یہ قول حقیقت میں شروع

ہماسے غلط ہے کہ ہر ایک انسان آزاد پیدا ہوا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' مگر یہ قول حقیقت میں شروع ہی سے غلط ہے۔ کہ ہر ایک انسان آزاد پیدا ہوا کیونکہ ہر ایک انسان اپنے گرد و پیش تمدن، ماحول اور سیاسی طاقت سے مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک فرد عقل، طاقت، وجاہت بلکہ شعور تک میں بھی برابر نہیں ہوتا۔ اصل برابری جو قائم اور دائم ہے یہ ہے کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں خواہ وہ کوئی ہوں اور کسی حالت میں ہوں چنانچہ اصول برابری خدا کی بندگی میں ہے کیونکہ خدا کے حضور میں شاہ و گدا، محمود و ایاز ایک ہیں۔ یہی اصول حقیقی برابری کا ہے اور برابری کی پختہ اور لازوال بنیاد ہے۔ باقی سب کچھ افسانہ و افسوں ہے جو کہ ایک غیر معمولی انسان کی پیدائش سے جیسے نپولین اور ہٹلر جیسے پاش پاش ہو سکتا ہے کیونکہ جمہوریت اور فسطائیت دونوں خیالی اصول ہیں۔ اسی طرح قوموں کے بے بنیاد ٹکراؤ سے انسان اور انسانیت تباہ و برباد ہوتے ہیں اور فقط خود غرضی باقی رہ جاتی ہے قوموں کی خود غرضی ایک قسم کی بت پرستی کا رنگ اختیار کر چکی ہے اقبال یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اس مساوات کو یاد کرتا ہے جس کی بنیاد وحدانیت خداوندی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں   مجھے ہے حکم اذاں لا الہ اللہ

اقبال نے جمہوریت کی برائی کی ہے کبھی اس کو ''مغز دو صد خر'' کہا ہے اور کبھی ایسی طرز حکومت بتایا ہے جس میں ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے''، مگر اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ مشاورت یا رائے عامہ کا بذریعہ ووٹ معلوم کرنا اور اس رائے کو قابل پابندی تصور کرنا غلط یا قابل اعتراض بات ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک جائز طرز اور تدبیر ہے۔ مگر غلطی یہ ہے کہ اس کو ایسی اصلیت مان لیا جائے کہ گویا اس کے اصول سچے اور دوامی ہیں۔ طرز کو طرز ہی سمجھنا چاہیے نہ کہ ایک متبرک اور ہر لحاظ سے قابل صد تقلید شئے۔

کائنات میں طرح طرح کے اختلافات اور ٹکراؤ اس کی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ مگر جب وہ ان پر اسلام کی کشفانہ روشنی ڈالتا ہے تو سب افتراق اور سارے تضاد اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے سورج کی روشنی میں شبنم کے قطرے معدوم ہو جائیں اس کی سب سے گہری نظر اس حقیقت پر پڑتی ہے اور پورے انہماک سے جمی رہتی ہے کہ خدائے کائنات کی صفات میں سے ایک بڑی واضح صفت اس کی قوت اور ذوق تخلیق ہے جب اس نے انسان پیدا کیا تو کہا کہ انی جاعل فی الارض خلیفۃ یعنی میں نے زمین پر اپنا نائب مقرر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا یعنی انسان کی فطرت اللہ کی فطرت پر ہے چنانچہ انسان کا تجربہ یہ ہے۔ کہ سب سے زیادہ خوشی اور اطمینان اس کو اس وقت میسر آتا ہے جب وہ کوئی ایجاد کرتا ہے۔ کوئی چیز اختراع کرتا ہے یا کچھ تخلیق کرتا ہے۔ یہی اس کا شوق و ذوق اور یہی اس کا اصلی منبع عشق ہے۔ خدا تعالیٰ نے کائنات بنائی اور انسان نے اس کو اپنے کام کا اور اپنے ذوق کا بنایا۔ اقبال کی ایک مشہور نظم میں انسان خدائے برحق سے کہتا ہے۔ ؎

بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم

انسان کی تخلیقی صلاحیت بے کنار ہے جتنا اس کو استعمال کیا جائے اتنے ہی نئے نئے امکانات نظر آتے جاتے ہیں چنانچہ عمل کا شوق اور اس کی لگن انسانیت کا جوہر بھی ہے اور طاقت خداداد بھی۔ یہی اس کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس شوق

کو اور اس عمل کو روبکار لانے سے انسان میں احساسِ خودی بھی بڑھتا ہے کیونکہ اپنی کوشش اپنی کامیابی اور اپنے کام کے نتائج سے اپنی ذات کے وجود کی خبر ہوتی ہے۔ یہ خبر احساس نو ہے اور پھر یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ احساس خودی اقبال کے نزدیک زندگی کا راز ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

چوں خبر دارم ز سازِ زندگی با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورت گوہر زدن پس ز خلوت گاہ خود سر برزدن

عمل اور ایجاد کا شوق اور اس شوق کی والہانہ تکمیل میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، وہی سوز و سازِ زندگی ہیں۔ وہ غم مضراب زندگی ہیں۔ ان تکالیف سے انسان کی خودی کا گوشہ گوشہ اس طرح گونج اٹھتا ہے جیسے گھنٹہ پر چوٹ لگانے سے اس کا ذرہ ذرہ بولنے لگتا ہے۔ اس لئے جتنا شوق بڑھتا ہے اتنی ہی خودی مستحکم ہوتی ہے اور اتنا ہی جوشِ عمل زیادہ ہوتا ہے۔ بقول اقبال

از محبت اشتعال جوہرش ارتقائے ممکنات مضمرش

جب امکانات کی حد نہیں تو کسی حد پر رکنا فطرتِ انسانی اور جوہرِ خودی کے خلاف ہے اسی واسطے اقبال کہتا ہے کہ ؎

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
آئے جو آپ بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کوششِ ناتمام زندگی کے وجود کو قائم رکھنے کا راز ہے۔ انسان کا کام نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرنا اور اپنی حالت سے غیر مطمئن رہ کر ترقی کی آرزو کرنا ہے اور آرزو کے لئے نگ و تاز کرنا اور پھر نئی آرزوئیں پیدا کرنا ہی ہے۔ بقول غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

فطرت کی بیتابی کو پورا کرنے اور قائم رکھنے کے لئے ایک مقصدِ اعلیٰ کا تعین ضروری ہے۔ تاکہ اس کے ماتحت ہر قدم کا ایک رخ ہو کیونکہ بغیر مقصد کے تخلیق ہمیں محض اضطراب اور انتشار ہی میسر آسکتا ہے۔ انتخابِ مقصد کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو بنانے کے بعد ایک مقصد تو یہ فرما کر متعین کر دیا تھا کہ وعلم آدم الاسماء کلھا جس کی تفسیر اقبال نے یہ کی ہے کہ اشیاء کا علم حاصل کرنا انسان کا فرض ہے۔ خدا نے یہ بھی فرمایا کہ والارض لآیات لقوم یعقلون۔ یعنی زمین میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور یہ بھی کہ سخر لکم ما فی السماوات والارض جمیعا یعنی ہم نے تمہارے لئے جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے اس کو قابو میں کر دیا ہے۔ اور یہ بھی کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ یعنی انسان کو سوائے اس کی کوشش کے پھل کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کے لئے علوم و فنون کا حاصل کرنا بلکہ فطرت کی تسخیر کے لئے کوشاں رہنا ایک طرف تو اس کی اپنی صفتِ تخلیق ہی سے ہے، اور دوسری طرف اس کی خودی، خودی کے

راز ہائے ـ لفریب اور حیاتِ کامل کے حصول کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ علوم وفنون کی تحصیل اور تسخیر فطرت اس کی روحانی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اس طرح سے دنیوی زندگی اور روحانی ترقی میں ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔ یہی فطرت بھی ہے اور ذریعہ سرور تسکین بھی۔ اسلام نے ان اصولوں کے ذریعہ نہ دین و دنیا کی تقسیم باقی رکھی ہے اور نہ مادے اور رُوح کے جھگڑے کو باقی چھوڑا ہے۔

یہ کتنی بڑی امانت انسان کو اللہ کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے! کیا تعجب ہے کہ بقول حضرت حافظ شیرازی "آسمان بارِ امانت نتوانست کشود" آسمان وزمین میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ ارادتاً تخلیق میں خدا کا ساتھ دیتے ان میں تو اس چیز کا شعور ہی نہ تھا۔ فرشتے ایک کل کے پرزے ہیں۔ وہ کوشش اور تسخیر سے ارتقا حاصل کرنے کے کہاں قائل ہیں۔ پھر ان کا امتحان کہاں کہاں ہے کہ برائی کا مقابلہ کرکے بھلائی کو حاصل کریں۔ شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور راندۂ درگاہ ہوا۔ مگر دنیا میں انسان کی روحانی تربیت کا ذریعہ بنا۔ ورنہ انسان بھی ایک رٹا ہوا سبق ہی جانتا۔ اس کی روحانی استطاعتیں اور صلاحیتیں کیونکر اجاگر ہوتیں۔ اب تو کائنات انسان کے لئے ایک میدانِ عمل ہے جس میں اس کو اپنی بے حساب صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ہے۔ انسان کی مخالفت قوتوں سے جنگ بیک وقت دنیاوی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اگر انسان کو اپنے مقاصد پر پورا یقین ہو اور اس کا دل نورِ ایمان سے منور ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ اس کی قلبی اور جسمانی طاقت کے حاصل کرنے کا تصور میں نہیں آتا۔

اقبال کا ہم پر اور سارے مسلمانانِ عالم پر احسان ہے کہ اس نے ایک نرالا اندازِ نظر پیدا کیا۔ عشقِ ازلی کو فطرت کا راز ہونا سمجھایا۔ ایک نئے اور دل نواز انداز میں دین و دنیا کے سنگم کو نمایاں کیا۔ فرد اور جماعت کا روحانی ارتباط بتایا۔ ذوق وشوق کے ساتھ راہِ عمل اختیار کرنے کا کرشمہ ظاہر کیا۔ دنیا کی تکلیفوں کو خودی کے استحکام اور تسخیر فطرت کے مقصد کا لازمہ قرار دیا۔ یہ سب اصول اور خیالات اس کے علم شعور اور یقین کامل سے اس پر آشکارا ہوئے وہ خود علم الیقین اور عین الیقین سے آگے بڑھ کر حق الیقین کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس کا دل اس کو گواہی دیتا تھا کہ اسلام ہی ہر تکلیف، ہر درد، ہر نفاق اور ہر تضاد کا حل بھی ہے۔ اور ہر کامیابی کا ذریعہ بھی۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ؎

ولایت بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

ان سب کارناموں کے ساتھ اس نے تشکیل الٰہیات اسلامی کا ایک جدید ڈھنگ بطور نمونے کے بھی پیش کر دیا ہے جو بجائے خود ذوقِ تخلیق کی ایک گراں قدر مثال ہے۔

~~~~~~~
~~~~~~~

اقبال ـــــ شاعرِ مستقبل

از سید الطاف علی بریلوی (علیگ)

اقبال کو بجا طور پر ایک پیغامبر شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری بعض جذبات کی عکاسی ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعہ انھوں نے بنی نوع انسان کو عموماً اور ملت مسلمہ کو خصوصاً ایک ایسا پیغام دیا جو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عظیم انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ پیغام دنیا کے لئے نیا نہیں ہے بلکہ وہی پیغام ہے جو اب سے چودہ سو سال پہلے محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے تیرہ و تار سمندر میں ڈوبی ہوئی نوعِ انسانی کو دیا تھا۔ اور جس کے قبول کرنے والے پوری دنیا پر چھا گئے تھے۔

چونکہ اقبال کا پیغام بعض عالمگیر صداقتوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس کو کسی مخصوص طبقہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کو اپنا کر دوسرے بھی وہی تاثرات حاصل کر سکتے ہیں جو کسی ایک طبقہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے اقبال کو مسلمانوں کا شاعر کہہ کر اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا سراسر کوتاہ نظری ہے۔ اس بات کی طرف اپنے ایک مکتوب میں سر تیج بہادر سپرو نے بھی اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کو لکھا۔

> "اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت ناانصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک "ملٹن" کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا "کالیداس" کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو نہ محدود کیا۔ اور نہ اور مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں۔"

اس حقیقت کو ماننے کے باوجود کہ اقبال کا پیغام پوری نوعِ بشر کے لئے ہے ان کو بنیادی طور پر ملّی شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُن کے پیغام کی بنیاد کلیتہً قرآنی تعلیمات پر ہے۔ اور جب وہ ایک اعلیٰ نصب العین حیات

پیش کرتے ہیں تو وہ خالص اسلامی ہوتا ہے۔

ویسے تو اقبال کے مخاطب سب ہی لوگ تھے لیکن چونکہ ان کے زمانہ میں تقریباً پوری ملت جسمانی اور ذہنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے پس رسیدہ لوگوں سے قدرتی طور پر یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اس پیغام کو اپنائیں گے جو آزادی کا متقاضی ہے۔ اقبال غلامی کو افراد اور ملت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ غلام، ذوقِ حُسن وزیبائی سے قطعاً محروم ہوتا ہے اس لئے نہ وہ صحیح بات سوچ سکتا ہے اور نہ صحیح عمل کرسکتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

غلامی کیا ہے ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی ۔۔۔ جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

دوسری جگہ غلامی کو یقین کی ضد قرار دیا ہے۔ اس لئے جو شخص کسی طرح کی بھی غلامی میں جکڑا ہوا ہو وہ کبھی بھی یقین کی دولت حاصل نہیں کرسکتا۔ اور اس لئے یقین سے حاصل ہونے والے نتائج سے بھی محرومی رہتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں ۔۔۔ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اقبال کے نزدیک غلامی کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان اسیر امتیاز ما و تو رہے اس لئے کہ آزادی یگانگت و محبت سے حاصل ہوتی ہے۔ ؎

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں ۔۔۔ غلامی ہے اسیر امتیازِ ما و تو رہنا

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر اقبال ضروری سمجھتے تھے کہ سب سے پہلے غلامی کی زنجیریں توڑی جائیں چنانچہ مسلمان کے لئے خصوصیت سے ان کا پیغام یہ تھا کہ اگر تو خود کو مسلمان کہتا ہے تو سب سے پہلے جسمانی اور ذہنی آزادی حاصل کر۔ اُن کے نزدیک مسلمان فطرتاً آزاد ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ کسی نوع کی بھی غلامی پر راضی ہوگیا تو پھر وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن ۔۔۔ تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

لیکن آزادی کا جو تصور آجکل عام ہے اس کو اقبال فرد اور قوم دونوں کے لئے مہلک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

اُس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک ۔۔۔ جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ ۔۔۔ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

دورِ حاضر کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنے جائز معاملات و ضروریات میں انسان جتنا اس وقت مجبور رہے اتنا تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوا۔ اس کے باوجود فکر و عمل کی آزادی کا ڈھنڈورا سب سے زیادہ اسی زمانہ میں پیٹا جا رہا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو آزادی تو دی مگر یہ آزادی مذہب، اخلاق

اقدار، سماجی روایات اور اُن سب چیزوں سے ہے جو انسان کو تہذیب و شائستگی اور حُسنِ معاشرت کے دائرے میں رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہی وہ آزادی ہے جس پر آج کا انسان فخر کر رہا ہے لیکن اقبال نے اس کو بجا طور پر ابلیس کی ایجاد سے تعبیر کیا ہے۔

اپنی نسل کے لوگوں کی ایسی ہی کمزوریوں کی اقبال نے جگہ جگہ نشان دہی کی ہے۔ اور ان ہی کی بنا پر وہ اس نسل سے مایوس تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ غلامی سے متنفر نہیں ہیں اور نہ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ اپنی اس حالت سے قطعاً مطمئن ہیں تو وہ پریشان ہو کر یہ کہہ گزرتے تھے۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا		رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو		لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے		جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ اس قوم سے کیا اُمید رکھی جائے جو کسی اچھی بات کو سننے اور نیک مشورے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک لطیف استعارہ کے ذریعہ اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو		کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اُن کے نزدیک قوم بے حسی کی اس منزل سے بھی بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ جس پر نہایت دردمندی کے ساتھ انہوں نے یہ تک کہہ دیا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا		کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبال جدید تعلیم کو بھی اپنے زمانہ کے مسلمانوں کی گمراہی کا ایک اہم سبب قرار دیتے تھے۔ یہ خیال عام ہے کہ مسلمانوں میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی اور مسلمان نے اُس کے بعد سے جو ترقی کی وہ کلیتہً تعلیم جدید کا نتیجہ ہے بعض حضرات تو اس معاملہ میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر جنگِ آزادی کے بعد ہندی مسلمان جدید تعلیم کو نہ اپناتا تو وہ اب تک من حیث القوم فنا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اس سلسلہ میں اپنے ملی شاعر کی رائے بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر		لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم		کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما		لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"		(ملا عرشی)

ایک اور مقام پر علوم مغربی، فلسفۂ یورپ اور تہذیب جدید کے اثرات کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

مدرسہ خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را　　ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر نہ دارد

اقبال کے نزدیک اُن کی نسل کے لوگوں کی بدبختی یہی نہیں تھی کہ وہ خود بلند نظری، قومی حمیت و غیرت اور حسنِ اخلاق سے عاری ہو چکے تھے۔ بلکہ اُن کی گمراہی یہ بھی تھی کہ وہ جدید تعلیم کے ذریعہ اپنی آئندہ نسلوں کو بھی بگاڑ رہے تھے۔ ماضی کی شاندار روایات سے اُن کو بیگانہ رکھا جاتا تھا۔ اسلامی تعلیمات ان کے کانوں تک نہیں پہنچنے دی جاتی تھی۔ یورپ کی کورانہ تقلید پر اُن کو راغب کیا جاتا تھا شکایتہً کہتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے　　سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

خاکبازی کے اس سبق کے نتائج بھی اقبال کے سامنے آچکے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نوجوانوں میں نہ اعلیٰ اخلاق و کردار رہا ہے، نہ محنت اور کام کرنے کا جذبہ رہا ہے اور نہ ایمانی حرارت و قوت رہی ہے بلکہ وہ تن آسانی، عیش و تعیش اور نمود و نمائش کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ وہ ان حالات کو دیکھ کر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اور ایک نوجوان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اقبال کی فہم و فراست اور عقابی نظر نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ دورِ غلامی کے اثرات مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نہایت دیرپا ہوں گے۔ وہ خود تو اس چیز کو دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہے لیکن دوسروں نے اچھی طرح مشاہدہ کر لیا کہ ڈیڑھ سو سالہ غلامی نے اہلِ ہند کے مسلمانوں کو ایسا منقلب ماہیت کر دیا کہ سیاسی آزادی ملنے کے بعد بھی ان کو ذہنی غلامی سے چھٹکارا نصیب نہ ہو سکا۔ بلکہ بعض حضرات کے طرزِ عمل سے تو کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ انھیں اپنی گردن سے انگریزوں کا طوقِ غلامی نکل جانے کا بیحد افسوس ہے۔ چنانچہ وہ ذہنی غلامی کے بندھن کو زیادہ مضبوط کر کے اس نقصان (؟) کی تلافی کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اسی دورِ غلامی اور مغرب کی ناقص تعلیم کا اثر ہے کہ قوم سے غلامی اور آزادی کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت جاتی رہی اور وہ آزادی جیسی نعمت کی قدر نہ کر سکی۔ غلامی کے دور کی برائیاں نہ صرف اس نسل میں بڑھتی چلی گئیں بلکہ اُس نے اپنے اخلاف کی بھی ایسی تربیت نہیں کی کہ اس میں ذوقِ حسن و زیبائی کی تخلیق ہوتی۔ وہ آزادی کی قدر کرنا جانتی اور اپنے اندر وہ خوبیاں اور صلاحیتیں پیدا کرتی جو آزادی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔

اقبال نے آئندہ رونما ہونے والی اس صورت حال کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے آئندہ نسلوں کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔ اور اپنی شاعری کے ذریعہ براہِ راست اُنھی کی تربیت کی کوشش کی کبھی انھوں نے جاوید کو مخاطب بنایا۔ کبھی طلبا علی گڑھ سے خطاب کیا اور کبھی بڈھے بلوچ کا روپ اختیار کر کے اُس کے بیٹے کو نصیحت کی۔ اس سلسلے میں کہیں اُن کا لہجہ مربیانہ ہے، کہیں دوستانہ، کہیں مشفقانہ ہے۔ اور کہیں ہمدردانہ۔ کسی موقع پر ضمناً طلبہ سے ہی خطاب کیا گیا ہے۔ وہ خوشحال خاں کے پردے میں نوجوانوں سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں ؂

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

لیکن واضح رہے کہ اس موقع پر بھی اپنی محبت کو عام نہیں کیا، بلکہ اس کو مشروط کر دیا ہے۔

جاوید کے نام لندن سے ایک منظوم پیغام بھیجتے ہیں۔ یہ پیغام جاوید کے توسط سے اور نوجوانوں کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

بڈھے بلوچ سے اپنے بیٹے کو ان الفاظ میں نصیحت کراتے ہیں۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اِخلاص عمل مانگ نیاگانِ کہن سے شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

جس نظم میں نوجوانوں کی تن آسانی اور عیش کوشی کا ذکر کر کے خون کے آنسو بہائے تھے۔ اُسی کے آخری حصہ میں ایک ناصح مشفق بن کر اُن کو یہ درس دیتے ہیں ؂

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

نوجوانوں کو جو خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اُن کے حصول کا اہم ذریعہ علم و حکمت کو قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ علم و حکمت، حلال روزی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکلِ حلال اور صدقِ مقال ہی وہ بنیادیں ہیں جن پر انسان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اقبال بھی نانِ حلال پر زور دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

علم و حکمت زاید از نانِ حلال عشق و رقت آید از نانِ حلال

پھر پیرِ رومی اور مریدِ ہندی کے درمیان مکالمہ پیش کر کے علم کے بارے میں کئی اہم نکتے بیان کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر نہایت مؤثر طریقہ اختیار کیا ہے۔ مریدِ ہندی جو خود اقبال کی ذات ہے، سوالات پیش کرتا ہے۔ اور پیرِ رومی نہایت مختصر الفاظ میں ان کے جوابات دیتے جاتے ہیں۔ پیرِ رومی سے مراد مولانا جلال الدین رومی سے ہے جن سے اقبال کو بیحد عقیدت تھی۔ اس سوال و جواب کی ایک خوبی یہ ہے کہ مریدِ ہندی کا سوال اُردو میں ہوتا ہے اور پیرِ رومی جواب فارسی میں دیتے ہیں۔ مرید کی جانب سے پہلا سوال پیش ہوتا ہے ؎

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

وہی جدید علم جس کو دوسرے لوگ مسلمانوں کی ترقی کا ضامن سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر قومِ مسلم اس دولت سے محروم رہتی تو وہ اب تک کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی یا کم از کم زوال و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ جاتی اسی کو اقبال ایک مرید کی حیثیت سے نہایت دردمندی کے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے مرشد سے اصلاح کی تدبیر معلوم کرتے ہیں۔

پیرِ رومی اس اہم سوال کا جواب ایک شعر میں دے کر مرید کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ جو اب ملاحظہ ہو ؎

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

دیکھنے میں یہ دو چھوٹے چھوٹے مصرعے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں تعلیم کا پورا فلسفہ سما گیا ہے۔ لوگوں نے تعلیم کے مقصد و مقاصد بیان کئے ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ایک اور صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ علم حاصل کر کے انسان خود کو پہچانے، اپنی تخلیق کے مقصد کو سمجھے اور اس مقصد کو پورا کرے۔ مقصدِ تخلیقِ انسان کا انسان بننا اور اللہ تعالیٰ کا تابعدار بندہ بن کر اس دنیا میں رہنا ہے۔ کم از کم مسلمان کو اپنی زندگی کا یہی مقصد سمجھنا چاہیئے اور اسی کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیئے۔ لیکن آجکل ماہرینِ تعلیم بھی جن میں مسلمان بھی شامل ہیں یہی نعرہ لگا رہے ہیں کہ علم اپنی دنیوی زندگی کو پُر آسائش طور پر گزارنے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا حصولِ تعلیم کے وقت اسی مقصد کو پیشِ نظر

رکھنا چاہئے۔ یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ آج ہر شخص چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ مسلمانو! اپنے بچوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دلاؤ تاکہ وہ ڈاکٹر اور انجینیر بن کر خوب دولت سمیٹیں۔ بنگلہ اور کوٹھی بنا کر رہیں۔ اور پُر آسائش زندگی بسر کریں۔ اسی تصور اور مقصد کو اس شعر میں "علم را بر تن زدن" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ علم ہے جو پیر رومی کے نزدیک "مار" بن کر دنیا کو ڈستا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی علم کی وجہ سے اس وقت بنی نوع انسان مقصدِ حیات سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس حالت کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان علم کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کا ذریعہ بنائے۔ اور بجائے تن پروری کے علم کے ذریعہ دل کی صفائی کرے۔ اپنے اخلاق کو سدھارے اور تمام مذموم حرکات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے رہِ حیات میں گامزن رہے۔ اسی کو مولانا روم "علم را بر دل زدن" بتا کر اس کو پہلے نظریہ کے توڑ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

اقبال نے دو نظریے بتا دیئے ہیں۔ اب یہ سننے والے کا کام ہے کہ وہ موازنہ کر کے فیصلہ کرے کہ کونسا نظریہ اس کے لئے مفید ہے۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد مرید ہندی علم ہی سے متعلق ایک اور مسئلہ اٹھاتا ہے وہ نہایت سادگی کے ساتھ پیر رومی سے استفسار کرتا ہے ؎

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

وہ کہتا ہے کہ حصولِ علم کے بعد اطمینانِ قلب نصیب ہونا چاہیئے۔ لیکن میں نے مشرقی اور مغربی علوم پڑھے اس کے باوجود بے چینی و بے اطمینانی بدستور قائم ہے۔ دل کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟

پیر رومی اس کا جواب بھی نہایت مختصر الفاظ میں دیتے ہیں ؎

دستِ ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

اُن کا کہنا ہے کہ جو علوم تو حاصل کر رہا ہے یا کر چکا ہے وہ تیرے درد کا مداوا ہرگز نہیں کر سکتے۔ اُن کی منزل دوسری ہے وہ تیری روح کے درد و کرب کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں اگر تو ان میں اپنے دردِ دل کا مداوا تلاش کرتا ہے تو یہ تیری بے بصری اور کوتاہ اندیشی ہے۔ تجھے چاہیئے کہ اغیار کے دروازوں کی چوکھٹیں چومنے کے بجائے تو صرف ایک در کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور وہ در اسلامی تعلیمات کا ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں حبل اللہ قرار دیا ہے۔ اس کی ایک موٹی سی مثال ہے "اگر کوئی بچہ بیمار ہو جائے تو یہ عقلمندی نہیں سمجھی جائے گی کہ اس کو علاج کے لئے نا اہلوں کے سپرد کر دیا جائے۔" اسلامی تعلیمات بھی ایک شفیق والدہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا اگر تو تعلیم کو مفید و با مقصد بنانا چاہتا ہے تو اپنی تعلیم حاصل کر۔ اُن علوم کا حاصل کرنا تیرے لئے کسی طرح مفید نہیں جو تیرے لئے اجنبی ہیں اور جن کا مقصد محض دنیا کمانا اور اپنی زندگی کو پُر آسائش بنانا ہے۔

یہ مناسب جواب پاکر مریدِ ہندی نے آخر کار یہ سوال کر لیا ؎

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ آخر مغربی تعلیم میں وہ ایسی کونسی بات ہے جو انسان کو ذہنی غلامی میں جکڑ دیتی ہے۔ اور وہ انگریز کا غلام اور صیدِ زبوں بن کر رہ جاتا ہے۔

پیرِ رومی نے اس کے جواب میں صرف ایک شعر پڑھ دیا ؎

مرغ پَر نارستہ چوں پراں شود طعمۂ ہر گربۂ دراں شود

اور اس شعر میں ایک معمولی سی مثال پیش کرکے مسئلہ کو آسانی سے حل کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے "یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ایک ایسے پرندے کو ذہن میں رکھئے جو بر پرواز سے محروم ہے۔ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی بھی بلی اسے بہ آسانی اپنا لقمہ بنا لے گی۔" یہی حال ایک ایسے نوجوان کا ہے جو اپنی روایات، تعلیم تہذیب اور معاشرت سے بیگانہ ہے اور ذہن کی اس ناپختگی کی حالت میں اس کو علوم مغربی کے سیکھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کا مغرب زدہ ہونا اور مغرب کی ہر شے سے متاثر و مرعوب ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

تعلیم جدید کی چند کوتاہیوں کی نشاندہی کرکے اقبالؔ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ نوجوانوں اور آئندہ نسل کے افراد کی اصلاح کے لئے تعلیمی نظام میں تبدیلی کی جانی چاہیئے۔ ظاہر ہے ذہنِ انسانی پر شروع میں جو نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کو مغربی اثرات سے پوری طرح بچایا جائے۔ جب بچہ کے ذہن پر اپنی روایات اپنی تعلیم۔ اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت کے اثرات اچھی طرح جم جائیں اس وقت اُس کو مغربی تعلیم دی جائے۔ اس طریقۂ کار سے نہ صرف کوئی ضرر نہیں ہوگا بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کے بعض مفید نتائج برآمد ہوں۔ جیسا کہ خود اقبالؔ کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے جب اپنی روایات اور تعلیمات کو اچھی طرح اپنے اندر جذب کر لیا اس وقت وہ یورپ گئے اور وہاں تہذیب جدید کے خاص مراکز میں بیٹھ کر بھی مغربی اثرات سے محفوظ رہے بلکہ اس تہذیب کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہو گئے اور اپنی تعلیم اور روایات کی برتری کو زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگے۔

نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لئے لائحۂ عمل بتا کر اقبالؔ دورِ حاضر کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ مغرب کی کمزوریاں بھی گناتے ہیں اور مسلمانوں کی بے راہ روی کے متعلق بھی گفتگو کرتے ہیں۔ دیکھئے کس قدر واضح الفاظ میں کہہ گئے ہیں ؎

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری

جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری

ان کی طویل نظم "ساقی نامہ" میں زندگی کا جو گہرا فلسفہ بیان کیا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ تو ہر انسان محسوس کرے گا کہ ان کے نزدیک انسان اور حیاتِ انسانی کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ اقبال کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور اس میں ان سب مسائل کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ جو انسان کو حیاتِ دنیوی میں پیش آتے ہیں۔ انہوں نے مسائل کے ساتھ ان کے مناسب حل بھی پیش کئے ہیں۔

اردو زبان کے اور بھی کئی شاعروں نے ساقی نامے لکھے ہیں۔ شعرائے متقدمین میں مرزا جانجاناں مظہر کے تلمیذ خاص محمد فقیہہ دردمند کا ساقی نامہ زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ لیکن اس سمیت تمام ساقی ناموں کا آہنگ اور موضوع ایک ہی ہے۔ ہر شاعر ساقی سے یہی درخواست کرتا ہے کہ مجھے تو ایسی شراب پلا جو مست و بیخود کردے۔ اقبال مستی اور بیخودی کو مقصدِ تخلیق کے منافی سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا آہنگ تمام شعراء سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

وہ ہمیشہ ساقی سے ایسی شراب کے طلبگار رہے جو خود اُن کو رزمگاہِ حیات میں نبرد آزمائی اور جدوجہد کرنے کے قابل بنا دے اور اُن میں وہ صلاحیت پیدا کردے کہ وہ دوسروں کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرسکیں اور اُن کی خودی کو بیدار کرسکیں۔ چنانچہ وہ ساقی نامہ میں اسی قسم کی شراب کے طلبگار ہیں فرماتے ہیں۔ ؎

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مئے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مئے جس سے ہے مستیٔ کائنات

وہ مئے جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مئے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

جب شاعر کو یہ شراب مل گئی تو اب اس نے حقائق سے پردہ اٹھانا شروع کردیا۔ اپنے زمانہ کی ناکامیاں اس پر روشن ہونے لگیں اور وہ دوسروں کو ان باتوں سے آگاہ کر کے ایک نئے دور کی نوید سنانے لگا اور ان بدلے ہوئے حالات میں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھانے لگا۔ سب سے پہلے وہ مغرب کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ کہتا ہے ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے ‌‌‌ زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم ‌‌‌ تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

اہلِ فرنگ نے جو طلسم قائم کر رکھا تھا وہ اب ٹوٹ رہا ہے۔ اور اس نظام کی کمزوریاں ایک ایک کر کے میں آشکار ہو رہی ہیں۔ اب دنیا ایک ایسے نظام کی خواہاں ہے جو موجودہ اضطراب و بےچینی کا سدِباب ے۔ شاعر کا خیال ہے کہ یہ نظام صرف مسلمان کے پاس ہے۔ مگر خود مسلمان یقین کی دولت اور ایمان کی ا کو کھو چکا ہے۔ اور اغیار کے طوق کو اپنی گردن میں ڈالنے پر نازاں ہے۔ یا وہ رسم و رواج کی زنجیروں جکڑا ہوا ہے اور یا تصوف، طریقت، شریعت، حقیقت، مجاز اور روایت و درایت کی بحثوں میں الجھا ہے۔ ایسی حالت میں وہ دوسروں کی کیا رہبری اور مدد کر سکتا ہے۔ ان باتوں کو شاعر کس دردمندی سے ان کرتا ہے۔ سه

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش ‌‌‌ مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام ‌‌‌ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ‌‌‌ یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ‌‌‌ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

راب کے ایک جرعے سے تو شاعر کو یہ حقائق معلوم ہوئے اور پھر اس نے ان باتوں سے دوسروں کو آگاہ ا لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالات کچھ زیادہ امید افزا نہیں تھے۔ اس کے باوجود شاعر جو ناامیدی کو گناہِ عظیم سمجھتا ، اصلاحِ حال سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ایک لائحۂ عمل تلاش کرتا ہے اور اس کے لئے وہ ساقی ے اسی مئے زر افروز کا دوسرا جرعہ طلب کرتا ہے اور حالات کو بدلنے کے لئے بعض مثبت طریقے دریافت کرتا ہے۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا ‌‌‌ وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا ‌‌‌ مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر ‌‌‌ جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے ‌‌‌ نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے ‌‌‌ دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر ‌‌‌ تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ‌‌‌ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ‌‌‌ مرا عشق میری نظر بخش دے

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹادے اُسے
لٹادے! ٹھکانے لگادے اُسے

طلب کے ساتھ ہی شاعر کو دوسرا جرعہ مل جاتا ہے۔ اور اس جرعہ کے حلق کے نیچے اترتے ہی اُس کو وہ تمام طریقے معلوم ہو جاتے ہیں جو اصلاحِ احوال کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ اصلاح حیاتِ انسانی میں کرنا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حیات یا زندگی اصل میں کیا چیز ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟

یہ وہ مسائل ہیں جن پر حکما قدیم زمانہ سے غور کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کے غور و فکر اور بحث و تمحیص کا انداز خالص فلسفیانہ ہے۔ ان مفکرین اور فلسفیوں میں پہلا اور قابلِ ذکر افلاطون ہے اس کے نزدیک زندگی تصور سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس نظریہ کی رو سے زندگی اور موت کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح زندگی بے حقیقت بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ نظریہ انسان کو بے عملی اور جمود کے سوا کچھ نہیں سکھاتا۔

دوسری اہم شخصیت اپی قورس کی ہے۔ جس کے نزدیک زندگی نام ہے کھانے پینے اور خوش رہنے کا۔ یہ نظریہ زندگی سے سنجیدگی کا عنصر ختم کر دیتا ہے۔

دورِ جدید میں چکبست لکھنوی نے زندگی اور موت کی کچھ اور ہی تعبیر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

ایک اور شعر میں وہ زندگی کو دردِ سر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا نشہ ہے جس کو موت کی ترشی اتارتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا — اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

اقبالؔ ان میں سے کسی ایک نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ افلاطون کو تو وہ اس کے فلسفہ تصوریت کی بنا پر نہایت سخت و سست الفاظ سے یاد کرتے ہیں کس قدر قطعیت سے کہتے ہیں ؎

راہب دیرینہ افلاطون حکیم | از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است | شمع را صد جلوہ چوں افسردن است

بسکہ از ذوق عمل محروم بود | آرہوئے دانائدہ معدوم بود

اس فلسفہ کو کلیتہً رد کرکے اقبال زندگی کے بارے میں ایک مثبت قسم کا تصور پیش کرتے ہیں اور اس موضوع پر طرح طرح سے روشنی ڈالتے ہیں۔ خصر راہ میں وہ اس کو سود و زیاں سے برتر اور وقت کی قید سے آزاد بتاتے ہیں۔ اور پھر اس کو کئی طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے زندگی جولاں درقصاں دکھائی دیتی ہے۔ اور کسی جگہ بھی یاس یا زندگی سے کراہیت محسوس نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی | ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ | جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ | جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب | اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے | گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب | اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اقبال زندگی کو فنا پذیر قرار نہیں دیتے۔ بلکہ تسلسل حیات کے قائل نظر آتے ہیں اور اس میں آفاقیت کا تصور قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ ظریتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات، وہ نہایت شرح و بسط سے زندگی کی حقیقت کو اس طرح آشکارا کرتے ہیں۔

دما دم رواں ہے یم زندگی | ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود | کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل | خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی | عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی | فقط ذوق پرواز ہے زندگی
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز | سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات | ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات

حیات و ممات پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد وہ ایک اور زاویۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ اکثر شاعر

زندگی کو غم و آلام کی تفسیر قرار دیتے ہیں اور ان کو ایک ناپسندیدہ شے سمجھتے ہیں لیکن اقبال ان باتوں کے قائل نہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں زندگی کا مثبت نظریہ پیش کرتے ہیں۔ وہ کسی صورت میں بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ زندگی ایک بوجھ اور انسان کے لئے ایک لعنت ہے۔ وہ اسے ہر حالت میں نعمت قرار دیتے ہیں اور اس نعمت کا حق ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

غالب نے زندگی کو سوزیاں کے پیمانہ سے ناپ کر شکایتہً کہا تھا ؎

زندگی اپنی اسی طور جو گذری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فانی زندگی سے اور بھی بیزار نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

اقبال یہ کہہ کر ان دونوں کے نظریات کو ٹھکرا دیتے ہیں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

لیکن ان کے نزدیک زندگی میں معنویت خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی خودی بیدار نہیں ہوتی اس وقت تک اس میں زندگی کی تڑپ پیدا نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی خودی کو نہ صرف بیدار رکھے بلکہ اس میں ہر لمحہ جلا پیدا کرتا رہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کی خودی سے کیا مراد ہے؟ ان سے پہلے اس لفظ کو غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ خداشناسی کی خاطر خودی کو ترک کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے بھی ایک جگہ اس لفظ کو ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے اے روح خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے

لیکن اقبال نے اس لفظ کے مفہوم ہی کو یکسر بدل دیا ہے۔ وہ خودی سے مراد تعین ذات لیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کائنات میں انسان کو تمام مخلوقات سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ اور اس مقام کو سمجھنا اس تک پہنچنا اور اس پر قائم رہنا اس کا نصب العین حیات ہے۔ اس اعلیٰ مقام کا عرفان ہی خودی ہے۔ اگر انسان کو یہ عرفان حاصل ہو جائے تو اس کی قوت عمل خود بخود کام کرنا شروع کرے۔ خودی کی حقیقت خود اقبال کی زبانِ قلم سے سنئے ؎

خودی کیا ہے۔ رازِ درونِ حیات خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

سفر اس کا انجام و آغاز ہے   یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

جب انسان کی خودی بیدار ہو گئی تو اس کے لئے ضروری ہوا کہ وہ اس کی پوری طرح نگہبانی کرے۔ اس نگہبانی کا طریقہ بھی خود اقبال سے سن لیجئے۔ کہتے ہیں ؎

خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب   وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند   رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے درگذر   خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر

دوسری جگہ فلسفۂ خودی کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پیکر ہستی ز آثار خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او   غیر او پیدا است از اثبات او

خودی کے شعور کے بعد ضروری ہے کہ روز بروز اس کو مضبوط و مستحکم کیا جائے۔ خودی کے استحکام کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عقلی قوتیں تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینہ میں خودی کی آگ روز بروز مشتعل ہوتی جاتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا ست   کاروانش را درا از مدعا ست
زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا   سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم   از شعاع آرزو تابندہ ایم

وہ خودی کو اس دنیا کی جدوجہد اور تگ و دو تک محدود نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کی تفسیر پیش کرتے ہوئے " وسخر لکم مافی السموٰت ومافی الارض " کہتے ہیں۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں   مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں   جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر   طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید   زمیں اس کا صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

چونکہ علامہ کو اپنی خودی کا پوری طرح عرفان حاصل ہوگیا تھا اس لئے وہ اس کی لامحدودیت پر یقین رکھتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد | دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے | تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے | سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

اقبال کی فراستِ بیانی نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ اگر خودی پر کوئی پابندی عاید نہ کی گئی تو انسان خودبین اور خودغرض ہوجائے گا۔ اور دوسروں کے مفادات اس کے ہاتھوں پامال ہوں گے۔ اس نتیجۂ بد سے بچانے کے لئے انھوں نے بیخودی کا فلسفہ بھی پیش کردیا۔ انفرادی حیثیت میں انسان خودی کے فلسفہ پر عمل پیرا ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں بیخودی کے فلسفہ کو اپنائے۔ اس طرح معاشرہ میں توازن قائم ہوگا۔ اور اس ملت میں ہٹلر اور مسولینی پیدا نہیں ہوسکیں گے۔

یہ وہ تعلیم ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اقبال نے آئندہ نسلوں کو دی اس کو اپنانے سے وہ ثمرات یقیناً حاصل ہوں گے جو اقبال کے پیش نظر تھے۔ اس تعلیم کے لئے مخصوص ذہنیت اور مخصوص ماحول درکار ہے۔ نہ غلامانہ ذہنیت میں اس تعلیم کا کوئی اثر ہوسکتا ہے اور نہ غلامی کے ماحول میں یہ تعلیم پروان چڑھ سکتی ہے۔ اس کے لئے ذہنیت کی تبدیلی ضروری ہے۔ لہٰذا بڑوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آئندہ نسل کے ذہنوں کی تطہیر کریں۔ ان کے لئے بہتر سے بہتر ماحول بنائیں۔ پھر اقبال کی تعلیمات کو گھر کے اندر، درسگاہوں میں اور باہر کی دنیا میں عام کریں۔ اقبال کے کلام کا مقصد تحریروں اور تقریروں میں زور پیدا کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ نہ اس کلام کو اس کام میں لانا چاہئے کہ کوئی گلوکار یا موسیقار ریڈیو، ٹیلی ویژن یا پردۂ سیمیں پر کوئی نظم گاکر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرے اور سننے والوں سے خراجِ تحسین وصول کرے۔ اقبال کا کلام زندگی کی صحیح اور سچی تفسیر ہے۔ اس میں زندگی پوری جولانیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے لہٰذا اس کو بہترین طریقے پر زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھنا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ان جواہر پاروں کو قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اور تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ کر نظرانداز نہ کیا جائے گا۔

اقبال کے اپنے زمانہ میں قوم جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ گویا نہ ذہنیت درست تھی اور نہ ماحول صحیح تھا۔ جب جسمانی آزادی حاصل ہوگئی تو ذہنی غلامی کی زنجیریں اور مضبوط ہوگئیں۔

لہذا ان دونوں حالتوں میں اقبال کے کلام اور اُن کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ خود اقبال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت تھے۔ لیکن قوم اُن کو وہ ملی جو غلامی پر رضامند تھی۔ اور کسی نہ کسی درجہ میں اب بھی ہے۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ قوم نے ان کی تعلیم کا خاطر خواہ اثر نہ لیا۔ صرف ان کی تعریف کرتے اور یوم مناتے رہے۔ یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کی کہ انہوں نے کیا کہا تھا اور کس لئے کہا تھا۔ آئندہ نسل جو آزادی کی فضا میں پروان چڑھ رہی ہے۔ اگر اس کی مناسب ذہنی تربیت کر دی جائے اور اس کو اقبال کے کلام سے زیادہ سے زیادہ مانوس بنا دیا جائے تو وہ اس تعلیم سے متاثر بھی ہوگی اور اس کی روشنی میں اپنی عملی زندگی کو بھی سنوارے گی۔ اقبال خود بھی اس نکتہ کو سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں نوجوانوں ہی سے خطاب کیا ہے اور انھیں سے تمام توقعات قائم کی ہیں۔ مستقبل کے ان نوجوانوں کو ذہن میں رکھ کر انہوں نے نہایت پیغمبرانہ شان سے یہ پیشین گوئیاں کی ہے۔ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار ۔۔۔ نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز ۔۔۔ اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود ۔۔۔ پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اور یہ انقلابِ عظیم صرف اسی صورت میں رونما ہوگا جب نوجوانوں میں ذہنی بیداری پیدا ہو یا پیدا کر دی جائے۔ قوم میں صلاحیت موجود ہے لیکن اس صلاحیت کو بروئے کار لانا ضروری ہے اقبال نے اپنے اس شعر میں ایک شرط کے ساتھ ہی قوم سے بہتری کی توقعات قائم کی تھیں ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یعنی مٹی کی زرخیزی اسی وقت اچھی پیداوار دے سکے گی جب اس میں کچھ نمی ہوگی۔

(بشکریہ نقوش لاہور)

حیاتِ اقبال تاریخوں کی روشنی میں

از جناب جگن ناتھ آزاد

نمبر شمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت
۱	ولادت	سیالکوٹ	جمعہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء	
۲	مڈل	اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ	۱۸۹۱ء	
۳	میٹریکولیشن	〃 〃	۱۸۹۳ء	امتیازی حیثیت میں پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔
۴	انٹرمیڈیٹ	اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ	۱۸۹۵ء	
۵	بی اے میں داخلہ	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۵ء	
۶	پہلی بار مشاعرہ میں شرکت	لاہور	۱۸۹۶ء	
۷	بی اے	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۷ء	عربی میں امتیازی حیثیت حاصل کی اور طلائی تمغہ پایا۔
۸	ایم اے (فلسفہ)	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۹ء	پنجاب بھر میں اول آئے اور تمغہ انعام میں حاصل کیا۔
۹	میکلوڈ عربک ریڈر	اورینٹل کالج لاہور	۱۸۹۹ء	
۱۰	"نالۂ یتیم" انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھی	لاہور	۱۹۰۰	
۱۱	"یتیم کا خطاب ہلال عید سے" انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھی	لاہور	۱۹۰۱ء	
۱۲	ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان	لاہور	۱۹۰۱ء	
۱۳	قیام	بھاٹی دروازہ لاہور	۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۵ء	
۱۴	اسسٹنٹ پروفیسر	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۰۳ء	
۱۵	"علم الاقتصاد" کی اشاعت	لاہور	۱۹۰۳ء	علامہ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف موضوع اقتصادیات
۱۶	نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی تخلیق		۱۹۰۴ء	
۱۷	حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری	دہلی	۱۹۰۵ء	
۱۸	انگلستان کو روانگی		۱۹۰۵ء	
۱۹	پی ایچ ڈی کی میونخ یونیورسٹی تکمیل	جرمنی	۱۹۰۷ء	

نمبر شمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت
۲۰	عربی کے پروفیسر	لندن یونیورسٹی	۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء	
۲۱	DEVELOPMENT OF METAPHYSIC IN PERSIA کی اشاعت	لندن	۱۹۰۸ء	اصل کتاب اب نایاب ہے۔
۲۲	بار ایٹ لا	لندن	۱۹۰۸ء	
۲۳	ہندوستان واپسی	لندن سے	۱۹۰۸ء	
۲۴	بیرسٹری کی ابتدا	لاہور میں	۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء	
۲۵	چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کی درخواست	لاہور	۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء	
۲۶	"شکوہ" انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں پڑھا	لاہور	۱۹۱۱ء	
۲۷	فلسفہ کے پروفیسر	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۱۱ء	
۲۸	مدتِ قیام	انارکلی لاہور	اکتوبر ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۱ء تک	
۲۹	علامہ اقبال نے پہلے استاد سر سید میر حسن کے پوتے سید عبداللہ کو ان کے بے حد اصرار پر اپنے اشعار سنائے	انارکلی لاہور	۱۹۱۳ء	علامہ اقبال اپنا کلام سنانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے علاوہ انہوں نے بہت کم اپنا کلام دوسرے جلسوں میں پڑھا یا سنا۔
۳۰	تاریخ ہند (مڈل) درجوں کے لئے لکھا	لاہور	۱۹۱۳ء	اس کا خلاصہ جواہر تسکے ایک ناشر نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا جناب غلام حسین کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے
۳۱	محترمہ امام بی بی (والدہ علامہ اقبال) کا انتقال	سیالکوٹ	۹ نومبر ۱۹۱۴ء	مادر مخدومہ اقبال رفت سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات گفت اکبر یا دلِ پُر درد و غم رحلتِ مخدومہ تاریخ وفات ۱۳۳۳ھ (اکبر)
۳۲	"اسرار خودی" کی اشاعت	لاہور	۱۹۱۵ء	
۳۳	درد گردہ کا پہلا حملہ	لاہور	۱۹۱۷ء	کانگریس کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے علامہ کی عیادت کو آئے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ حکیم نابینا صاحب دہلوی (حکیم عبدالوہاب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری) سے علاج کرائیں چنانچہ علامہ بغرض علاج دہلی تشریف لائے۔
۳۴	"رموز بے خودی" کی اشاعت	لاہور	۱۹۱۸ء	
۳۵	اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو ایک دو بیت	لاہور	۱۹۲۰ء	
۳۶	کشمیر کا سفر	سری نگر	۱۹۲۰ء	نشاط باغ میں اپنی مشہور نظم ساقی نامہ کہی
۳۷	"اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ از آر اے نکلسن	لندن	۱۹۲۰ء	

نمبر شمار | واقعہ | مقام | تاریخ | کیفیت

۴۰۔ مدتِ قیام میکلوڈ روڈ لاہور ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء

۳۹۔ "سر" کا خطاب لاہور یکم جنوری ۱۹۲۳ء

۴۰۔ "پیامِ مشرق" کی اشاعت لاہور ۱۹۲۳ء

۴۱۔ اسکولوں کے چھٹے لاہور ۱۹۲۴ء ان کتابوں کی ترتیب
ساتویں اور آٹھویں میں حکیم احمد شجاع نے
درجہ کے طلبہ کے لئے علامہ اقبال کا ہاتھ بٹایا۔
تعلیمی نصاب
اردو کورس کی ترتیب

۴۲۔ "بانگِ درا" کی اشاعت مارچ ۱۹۲۴ء

۴۳۔ والدۂ آفتاب اقبال ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء
مختار بیگم کا انتقال

۴۴۔ ولادت جاوید اقبال لاہور ۱۹۲۴ء

۴۵۔ لیکچر بعنوان "اسلام اسلامیہ ۱۹۲۵ء اس لیکچر کے دوران
اور اجتہاد" کالج لاہور میں علامہ نے بڑے
جوش کے ساتھ ترکی
شاعر ضیا کا کلام سنایا

۴۶۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل لاہور دسمبر ۱۹۲۶ء
کے الیکشن میں کامیابی

۴۷۔ کونسل کی مدتِ رکنیت لاہور ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک

۴۸۔ "زبورِ عجم" کی اشاعت لاہور ۱۹۲۷ء مگر بے ذوق تو خلوت
میں پڑھ زبور عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے
راز نہیں۔ اقبال

۴۹۔ RECONSTRUCTION OF RELIGIONS مدراس ۱۹۲۸ء

THOUGHT IN
ISLAM
خطبات

نمبر شمار | واقعہ | مقام | تاریخ | کیفیت

۵۰۔ سفرِ دکن اور مندرجہ میسور ۱۰ جنوری مہاراجہ میسور کی ذاتی
بالا لیکچر ۱۹۲۹ء دعوت پر

۵۱۔ سفرِ دکن اور مندرجہ حیدرآباد ۱۴ جنوری
بالا لیکچر ۱۹۲۹ء

۵۲۔ مولوی میر حسن کا انتقال سیالکوٹ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء

۵۳۔ ولادتِ منیرہ لاہور ۱۹۳۰ء

۵۴۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد ۱۹۳۰ء
سالانہ جلسے کی صدارت

۵۵۔ شیخ نور محمد (والد علامہ اقبال) کا انتقال سیالکوٹ ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء پدر و مرشد اقبال ازیں
عالم رفت باہمہ راہروان
منزل مالک ابد ہاتف
از حضرتِ حق جو دست
و تاریخ وصل آمد آواز
"اثرِ رحمت" "آغوشِ لحد"
۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

۵۶۔ اقبال نے پروفیسر لاہور ۱۹۳۱ء
یوسف سلیم چشتی کو
"گلشن راز جدید"
سبقاً سبقاً پڑھائی

۵۷۔ RESONSTRUCTION لاہور ۱۹۳۱ء
OF RELIGIOUS
THOUGHT IN
ISLAM

نمبر شمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت
۵۸	موتمر عالم اسلامی میں شرکت	فلسطین	۱۹۳۱ء	
۵۹	دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت	لندن	۷ ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء	
۶۰	نپولین کے مزار پر	پیرس	۱۹۳۲ء	
۶۱	مشہور ریسرچ اسکالر سے ملاقات	پیرس	۱۹۳۲ء	
۶۲	برگساں سے ملاقات	پیرس	۱۹۳۲ء	اقبال نے برگساں کو رسول اللہؐ کی یہ حدیث سنائی۔ DONT VILLIFY TIME, BECAUSE TIME IS GOD. تو برگساں تصور زماں کے بارے میں یہ نظریہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔
۶۳	جاوید نامہ کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۲ء	
۶۴	تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت	لندن	۱۷ نومبر تا ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء	
۶۵	مسولینی سے ملاقات	روم (اٹلی)	۱۹۳۳ء	
۶۶	نظم "دعا" کی تخلیق	قرطبہ (اسپین)	۱۹۳۳ء	
۶۷	نظم "مسجد قرطبہ" کی تخلیق	اسپین	۱۹۳۳ء	
۶۸	علالت کا آغاز	لاہور	۱۹۳۳ء	
۶۹	حکومت افغانستان کی دعوت پر سفر افغانستان		اکتوبر ۱۹۳۳ء	
۷۰	ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۴ دسمبر ۱۹۳۳ء	
۷۱	عید کی نماز کے بعد گرم سویاں دہی ملا کر کھائیں شدید نزلے اور کھانسی میں مبتلا ہو گئے گلا بھی بیٹھ گیا۔	لاہور	جنوری ۱۹۳۴ء	
۷۲	والدہ جاوید (سردار بیگم) کا انتقال	لاہور	۱۹۳۵ء	
۷۳	بال جبریل کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۵ء	
۷۴	مولانا حالی کی برسی میں شرکت	پانی پت	اکتوبر ۱۹۳۵ء	
۷۵	سر راس مسعود کے ہاں قیام	بھوپال	۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک متعدد مرتبہ	
۷۶	برقی علاج	بھوپال	۱۹۳۵ء	
۷۷	وصیت نامہ کی تحریر	لاہور	۱۹۳۵ء	
۷۸	"ضرب کلیم" کی اشاعت	لاہور	اپریل ۱۹۳۶ء	
۷۹	"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی اشاعت	لاہور	ستمبر ۱۹۳۶ء	
۸۰	عتیق النفس کی شکایت	لاہور	۱۹۳۶ء کے آخر میں	
۸۱	نادرہ مسعود کی پیدائش پر تاریخی قطعہ	بھوپال	یکم مارچ ۱۹۳۷ء	
۸۲	موتیابند کی شکایت	لاہور	۱۹۳۷ء	

نمبرشمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت	نمبرشمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت
۸۳	جامعہ ازہر کے علماء کی ملاقات اقبال سے	لاہور	۱۹۳۷ء		۸۸	دمہ کے شدید دورے	لاہور	۱۹۳۸ء کے شروع میں	
۸۴	حکیم نابینا صاحب کا علاج	دہلی	اپریل ۱۹۳۷ء		۸۹	درد گردہ کا دوسرا حملہ	لاہور	۱۹۳۸ء	
۸۵	درد نقرس کی ابتدا	لاہور	۱۹۳۷ء		۹۰	وفات	لاہور	۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء	
۸۶	مدت قیام	جاوید منزل میو روڈ لاہور	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء		۹۱	"ارمغان حجاز" کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۸ء	علامہ کے انتقال کے بعد۔
۸۷	جواہر لال نہرو اور اقبال کی ملاقات	لاہور	جنوری ۱۹۳۸ء						

نوٹ:۔ اس چارٹ کی تدوین میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:۔ روزگار فقیر جلد اول و دوم (سید فقیر وحید الدین) اقبال (مولوی احمد الدین) ذکر اقبال (مولانا عبدالمجید سالک) اقبال کے آخری دو سال (ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی) پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے مقالات۔
INTRODUCTION TO IQBAL (ایس، اے، وحید)
POET OF THE EAST (عبداللہ انور بیگ)
ماہ نو (کراچی) کی فائلیں

اسلام سے بیگانگی

اسلام کے متعلق یہ فقرہ اکثر لوگوں کو دہراتے ہوئے سنا ہے کہ "یہ دنیا کا بہترین اور مکمل ترین دین ہے، یہ وہ دین ہے جس کے بارے میں خود خالق ارض و سما کا ارشاد ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ یہ ایسا دین و مذہب نہیں ہے جو محض عبادات اور رسومات کا مجموعہ ہو، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے" لیکن بہت کم مسلمان ایسے ہیں کہ جو ان الفاظ کا صحیح حل سمجھتے ہوں۔ درحقیقت اس مقولہ کو واضح طور پر سمجھنا تو اسی وقت تک ممکن رہا جب تک یہ ضابطہ مسلمانوں کے عمل کی بنیاد رہا۔ بعد میں اس کو محض عبادات تک محدود کر لیا گیا۔ اور معاملات، سیاست مدن اور معیشت و معاشرت کو اس کے دائرے سے تقریباً خارج کر دیا گیا۔ اور اب تو وہ زمانہ ہے جب عبادتوں کو پہلے جیسی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ ایسی صورت میں اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات سمجھنا کیسے ممکن ہے۔ درحقیقت اس وقت یا تو دوسروں کی تقلید میں مذکورہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں یا اس لئے ان باتوں کا کہنا ضروری سمجھ لیا گیا کہ ہماری پیدائش اتفاق سے مسلمان گھرانوں میں ہو گئی ہے۔ ہماری بیگانگی اور ناواقفیت کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ اگر کوئی پلٹ کر پوچھ لے کہ "اسلام کو آپ کس اعتبار سے ایک مکمل ضابطۂ حیات کہتے ہیں؟" تو ہم میں سے بہت سے لوگ جواب دینے سے قطعاً قاصر رہیں گے۔

(ثناء الحق صدیقی)

اقوامِ عالم اور اقبال

(از جناب ڈاکٹر منہاج الدین ملتان یونیورسٹی)

قوم اور وطن کا تصور ازمنۂ قدیم سے انسانی زندگی میں داخل ہے۔ سورۂ حجرات میں آیا ہے کہ:

"اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد عورت سے پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لو تو تمہاری جماعتیں اور قبیلے بنا دیئے۔

عام مفہوم میں قوم افراد کے اس مجموعے کا نام ہے جو ایک خطۂ زمین پر مستقلاً آباد ہو، جس کی زبان ایک ہو اور جس کی تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی اساس بھی ایک ہی ہو۔ اس مشترک خصوصیت کے ساتھ افراد کا مجموعہ چاہے اُسے قبیلہ کہیں یا خاندان، اگر اپنی انفرادیت کی وجہ سے پہچانا جائے تو اسے ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اقبال اسلامی تعلیمات کے پیشِ نظر ان مصنوعی بندھنوں کے سخت مخالف ہیں۔ قبیلہ، رنگ، نسل، زبان اور خطۂ زمین کے رشتے اتحادِ انسانی اور ملت کے صحیح اساس نہیں ہو سکتے۔ اقبال اتحاد کی صحیح اور فطری اساس نبوت اور اسلام کو سمجھتے ہیں۔ انسان میں انسانیت کا صحیح احساس سب سے پہلے نبوت اور مذہب کی بدولت ہی پیدا ہوا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:-

بندھا از پا کشاید بندہ را\
از خداوندان رباید بندہ را\
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ\
زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ

یہ صاحبِ نبوت کی الٰہی تلقین کا طلسم ہے کہ انسان خاندان اور قبیلہ کے محدود دائرے سے نکلا اور انسانیت کے بلند مراتب پر پہنچ گیا۔ قبائل اور قومیں جو رنگ و نسل کے امتیازات میں جکڑی ہوئی تھیں، ایک صحت مند شیرازے میں منسلک کر دی گئیں۔

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند\
محفلِ رنگیں ز یک ساغر کند

دیدۂ آدمی کشد لب جاں دہد
تا دوئی میرد ـ یکے پیدا شود

اقبال انسان دوست ہیں نہ کہ وطن پرست اور قوم پرست۔ وہ اُس عالم گیر اتحاد کے قائل ہیں جس کی تعبیر اسلام نے پیش کی ہے۔ اسلام نے ملت کی بنیاد نہ تو رنگ و نسل پر رکھی ہے اور نہ ہی ملک و وطن پر۔ وہ تمام افراد جو ایک خدا کو مانتے ہیں، ایک رسول عربی پر ایمان رکھتے ہیں، ایک قرآن کے حامل ہیں۔ —— ایک ملت کے افراد ہیں۔ خواہ وہ رنگ و نسل میں کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اقبال فرماتے ہیں۔

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم ازاں پس ہندی و تورانیم من

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :-

نہ افغانیم نہ ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

اگرچہ اقبال کے ذخیرۂ ادب میں قومیت اور وطنیت سے متعلق کئی نظمیں ملتی ہیں مثلاً قومی ترانہ، نیا شوالہ، میرا وطن، کوہِ ہمالہ، بچے کی دعا، تصویرِ درد وغیرہ لیکن یہ تمام نظمیں اس دور کی ہیں جب برصغیر کی سیاسی فضا تعصب اور فرقہ پرستی سے مسموم ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی اِن نظموں کے ذریعہ اتحاد کی صورت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ انھیں احساس ہوا کہ جدید وطنیت کے خد و خال خواہ دل کش ہی سہی لیکن اُس کا باطن تاریک ہے تو وہ وطنیت کے محدود تصور سے نکل کر عالمی اتحاد کی طرف مائل ہوئے۔ ؎

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

اور :——

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

چنانچہ ابتدائی دور کی چند نظموں کے بعد جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اقبال نے ہمیشہ وطن پرستی کی مذمت کی ہے۔ اِس سلسلہ میں وہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں :- ؎

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اُس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کی نگاہ میں دنیا کے سارے ممالک ایک ہی چمن کے تختہ ہائے گل ہیں۔ اگر کسی ایک خطۂ چمن میں وطنیت کے نام پر حرص و آز کی آگ بھڑکائی گئی تو پھر پورے چمن کا اس کی لپیٹ میں آ جانا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں عالمی وابستگی اور بین الاقوامی برادری اسلام کی بنیاد پر ہی انسانیت کی معراج ہے نہ کہ قومیت اور وطنیت، لادینیت کی بنیاد پر۔ ؎

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ان کے خیال میں اگر بین الاقوام برادری کی بنیاد ایمان اور اسلام پر نہیں رکھی گئی تو پھر یہی بین الاقوامیت قومیت کا قالب اختیار کر لے گی۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد "لیگ آف نیشنز" کی طرح ڈالی گئی تو اقبال نے اسے "کفن چوروں کی انجمن" کہہ کر پکارا۔ ؎

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اور دنیا جانتی ہے کہ ان کا یہ خیال اس جمعیت پر پوری طرح صادق آیا۔ ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی وہ تمام قومیں جو انسانی آزادی اور حقوق کی حفاظت کا یہ بانگ دہل اعلان کر رہی ہیں، وہی قومیں بہ انداز دیگر انسانیت کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم بھی اسی وطن پرستی کا شاخسانہ تھی۔ منشورِ اقوام اور منشورِ حقوقِ انسانی کی اس لئے تدوین ہوئی کہ مغربی اقوام کی جبروت دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔ قوموں کی مجنونانہ دوڑ میں قومیت اور وطنیت کے جو انسانیت سوز جذبات ابھارے جا رہے ہیں، اور رنگ و نسل کے نام پر آج انسانیت پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں وہ ایک تیسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اقبال کے پیشِ نظر یہ تمام حقائق تھے۔ انھوں نے قومیت اور وطنیت کے مسموم اثرات کو دیکھتے ہوئے عالم گیر برادری اور اتحاد کا تصور پیش کیا۔ کیونکہ یہی انسانیت کے تقاضے تھے۔ اقبال کا یہ تصورِ انسانیت اور اتحاد وہی ہے جو اسلام نے اپنی تعلیمات میں پیش کیا ہے۔ اور یہی فریضۂ فطرت ہے۔ ؎

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی

اور :۔

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ‫ ‫ کردارِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

قرآن کریم نے قومیت اور وطنیت کی گروہ بندیوں کو تفرقہ اندازی کے مترادف قرار دیا ہے اور اس کے تنگ دائروں کی مذمت کی ہے۔ سورۃ "یونس" میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

"اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں۔ پیچھے جدا جدا ہو گئے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ عقیدۂ توحید سے وحدتِ انسانی کی تعمیر ہوئی ہے اور اسلام کی بدولت انسانی برادری کا وسیع دائرہ تشکیل پایا ہے لیکن یہ خود اہل دنیا کی تنگ ظرفی کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم انسانیت اسلام کے پیغام کو قبول نہیں کر سکا۔ اقبال اپنی تعلیمات کے ذریعے اقوام عالم کو دینِ حق کی طرف اس انداز میں بلاتے ہیں:۔

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نرسیدی تمام بو لهبی ست

زمانے کے انقلابات اور حوادث افسانۂ پارینہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ملکوں کے جغرافیائی حدود درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے ملک کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شان یہ ہے کہ وہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہے۔ کوئی انقلاب کوئی حادثہ اس کو ختم نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس دنیا میں صورتِ خورشید جیتے ہیں۔ اُن کا وطن روم و ایران اور شام و یونان نہیں، بلکہ اُن کا وطن اور مسکن صرف اسلام ہے جو ایک قائم و دائم مرکز ہے:۔

قلب ما از هند و روم و شام نیست
مرز بوم او بجز اسلام نیست

سچ تو یہ ہے کہ ایک جاودانی ملت اور عالمگیر اخوت کا تصور صرف اور صرف تعلیماتِ اسلام میں ملتا ہے۔ اقبال اقوام عالم کو کبھی یوں تعلیماتِ اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

عقدۂ قومیت مسلم کشود	از وطن آقائے ما ہجرت نمود
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو	یعنی از قیدِ وطن آزاد شو

اور کبھی یوں انہیں سمجھاتے ہیں:۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے	جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک	ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقوام عالم اگر امن و آشتی کی فضا پیدا کرنا چاہتی ہیں اور دنیا کو عشرت و راحت اور اخوت و محبت کا گہوارہ بنانا چاہتی ہیں تو پھر انہیں فکرِ اقبال سے استفادہ کرنا ہوگا بصورت دیگر

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۞

علامہ اقبال بحیثیت معمارِ پاکستان

از جناب اخلاص حسین زبیری ایم اے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نئی مملکت پاکستان منصۂ شہود پر نمودار ہوئی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی اور اس کی آبادی تقریباً ۱۲ کروڑ تھی۔ علامہ اقبال وہ پہلے رہنما تھے جنہوں نے اس آزاد مملکت کا تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اس سے پہلے مسلم لیگ جو مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت تھی صرف اس فکر میں رہتی تھی کہ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد ہندو اکثریت کے ساتھ رہنے کی صورت میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جائے کہ ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کا بحیثیت ایک ملت تشخص باقی رہے۔ پاکستان یعنی ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا تصور ہندو اور مسلمان دونوں کے قائدین اور سیاستدانوں کے لئے نہایت حیرت انگیز تصور تھا اور اس پر مبنی مطالبہ کسی صورت میں ممکن الحصول نظر نہ آتا تھا۔ جن کی مساعی بلیغ سے یہ ممکن ہوا وہ عظیم خراجِ تحسین اور ہدیۂ شکر گذاری کے مستحق ہیں!

اس برصغیر کے تمام باشندے خصوصاً مسلمان اچھی طرح واقف ہیں کہ علامہ اقبال ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، اسلامی ماحول میں تعلیم پائی اور ہوش سنبھالنے کے بعد ہی ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے والد ماجد جناب نور محمدؒ صاحب اسلام سے نہایت گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور روحانی اقدار کے نہ صرف عقیدت مند ہیں بلکہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حقیقی مذہبی رجحان انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ جبکہ غیر معمولی ذہانت خدائے تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص ان کو عطا ہوئی تھی۔ فکرِ رسا اور جدتِ خیال کے اوصاف ان میں شروع ہی سے موجود تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے والدین کو ان کی تعلیم کے معاملے میں کوئی تشویش پیدا نہیں ہوئی۔ قدرت نے دو شفیق استاد بھی انہیں عنایت کئے۔ ایک شمس العلماء میر حسن صاحب اور دوسرے سر تھامس آرنلڈ۔ شمس العلماء نے ان کے دینی اور معاشرتی امور میں انہیں مشفقانہ رہنمائی بہم پہونچائی۔ مسٹر آرنلڈ نے مغربی فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے اور یورپ کے معاشرے کے حسن و قبح کو سمجھنے میں ان کی عالمانہ اور مشفقانہ انداز میں مدد کی۔ ان نعمتوں سے مستفیض ہونے کا غالباً یہ نتیجہ تھا کہ جب اعلیٰ تعلیم کے لئے علامہ یورپ پہونچے تو وہاں کے فلسفے اور وہاں کے معاشرے کی ظاہری چمک دمک سے وہ مرعوب نہ ہوئے بلکہ تنقیدی نظر

ت یورپ کی ہر چیز کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اصولاً وہاں کا فلسفہ اسلام کے فلسفہ کے سامنے ناقص ہے۔ اور وہاں کے معاشرے کی چمک دمک نہ سکون بخش ہے اور نہ اس میں پائیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا۔ ۵

"زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور"
فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف"

اس قسم کے بہت سے اشعار ہیں۔

یہ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں کا واقعہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر احساس کمتری بُری طرح طاری تھا۔ ان کو یورپ اور انگریزوں کی ہر چیز اعلیٰ و ارفع اور اپنی ہر چیز ناقص نظر آتی تھی ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد سے سیاسی پریشانیوں اور اقتصادی بدحالی نے بُری طرح گھیر رکھا تھا۔ چنانچہ اول اول اقبال کے حوصلہ افزا اشعار کی پکار انہیں ایک مجذوب کی بڑ معلوم ہوئی۔ لیکن علامہ اقبال نے اتنے استقلال اور ہنر مندی سے اپنے مشن کو جاری رکھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے مایوسی کے بادل چھٹنے لگے۔ علی گڑھ تحریک اور ملک کے دیگر علمی اداروں کے ذریعہ بہتر تعلیم کا بھی انتظام ہوگیا تھا۔ چنانچہ مسلمان اس قابل ہوگئے کہ جب ہندوؤں نے کانگریس کے توسط سے پورے برصغیر پر ہندو راج مسلط کرنے کی تدبیریں شروع کیں تو مسلمانوں نے مسلم لیگ قائم کرکے اپنے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ علامہ اقبال نے اپنی بلند پایہ اور لاثانی شاعری کے ذریعہ مسلمانوں میں خود اعتمادی اور بلند ہمتی پیدا کی مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

امین راز ہے مردانِ حُر کی درویشی — کہ جبرئیل سے ہے ان کی نسبتِ خویشی
طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا — ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی
مسلمانوں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا — مروتِ حُسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا
کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے درویشی — کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا
اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

"مردِ مسلمان" کے عنوان سے ایک پوری نظم مسلمان اور مومن کی شان میں ہے جس کا پہلا شعر ہے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

اپنی بے نظیر شاعری اور لیکچروں کے ذریعہ مسلمانوں کی مایوسی دور کرنے کے علاوہ جو کوششیں علامہ نے

قیام پاکستان کے لئے کیں ان کا اندازہ اُن خطبوں سے اچھی طرح ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اور ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے دیئے۔ نیز ان خطوط سے بھی جو علامہ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اس غرض سے لکھے کہ مسلمانوں کی بھرپور قیادت کے لئے وہ آمادہ اور تیار ہو جائیں۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو علامہ نے قائدِ اعظم کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس میں ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی حالات اور امن و امان کی صورتِ حال پر بڑا مدلل اور جامع تبصرہ کیا ہے اور ملک کی تقسیم کی ضرورت پر (REDISTRIBUTION) پر) زور دیا ہے۔ آخر میں قائدِ اعظم کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں: "بہرحال میں نے آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ ان پر اپنے خطبہ میں جو مسلم لیگ کے دیا ہے کی حیثیت سے آپ کو دینا ہے، توجہ دیں گے یا ہونے والے مباحث کے دوران ان پر غور کریں گے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سنگین بحرانی موقع پر یہ توقع ہے کہ آپ کی ذہانت مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا کوئی حل ضرور نکال لے گی۔" ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں علامہ نے قائدِ اعظم کو لکھا: "اس وقت ہندوستان میں آپ تنہا ایسے مسلمان ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آپ سے صحیح اور محفوظ رہنمائی کی اس وقت توقع کرے جبکہ ہندوستان کے شمالی و مغربی حصہ میں بلکہ پورے ہندوستان میں ایک خطرناک سیاسی طوفان اٹھ رہا ہے۔" اور آگے لکھتے ہیں: "مسلم صوبوں کا ایک علیحدہ وفاق جو اُن ہی اصولوں پر تشکیل کیا گیا ہو جن کی میں نے اوپر تشریح کی ہے تنہا راستہ ہے جس پر چل کر ہم ایک پُرامن ہندوستان حاصل کر سکتے ہیں۔ انڈیا کا شمال مغربی حصہ اور بنگال حقِ خود ارادیت کیوں حاصل نہیں کر سکتے جبکہ دوسری قومیں ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ایسا کر سکتی ہیں؟"

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۹۴۳ء میں "اقبال کے خطوط" پر ایک پیش لفظ لکھا تھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ "مسلم لیگ کو یہ بڑی کامیابی ہوئی کہ اکثریت کے صوبوں اور اقلیت کے صوبوں دونوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو قبول کر لیا ہے۔ سر محمد اقبال نے یہ کامیابی حاصل کرنے میں نہایت نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت ان کا یہ عظیم کام پبلک کی نظر سے پوشیدہ رہا۔ علامہ کے خیالات تمام اہم معاملوں میں میرے خیالات کے مطابق تھے۔ جب ہندوستان کے آئینی مسائل کا پورا مطالعہ کر کے جائزہ لیا گیا تو آخر میں ہم ایک ہی نتیجہ پر پہونچے تھے اور رفتہ رفتہ ان فیصلوں نے مسلمانوں کی متحدہ رائے کی صورت اختیار کر لی جیسا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادِ پاکستان سے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی ظاہر ہوا۔" معمارِ پاکستان علامہ اقبال کو اس سے بہتر کیا خراجِ تحسین ادا کیا جا سکتا تھا؟ اور یہ خراجِ تحسین اس عظیم ہستی کی طرف سے ہے جسے بجا طور پاکستان کا بانی (FOUNDER) قرار دیا گیا ہے۔

قوم نے ہر دو بزرگوں اور ہماؤں کو ان کے مراتب کے مطابق اعزاز دیا ہے۔ تاہم شاعری ابلاغ کا ذریعہ ہے ذہن کے اثرات اور تاثر بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ اسی کے پیشِ نظر مسلم مفکرین نے علامہ کو حکیم الامت کا خطاب دیا ہے اور وہ عام طور پر مقبول ہے کیونکہ علامہ کی شاعری کے ذریعہ پیش کردہ تعلیم میں ملت کے ان امراض کا علاج بتایا گیا ہے جو مرورِ زمانہ کے باعث جسدِ ملت میں داخل ہو کر اُسے مضمحل اور ناکارہ بنا چکی تھیں۔ مثلاً خانقاہی طور و طریقے جن کی رو سے ترکِ دنیا اور نفس کشی کی ترغیب دلائی جاتی تھی جس سے قوم پر کاہلی اور اوہام پرستی طاری ہو چلی تھی۔ تقدیر اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے تھے جو جفاکشی اور جد و جہد کو بالکل غیر ضروری قرار دیتے تھے۔

علامہ نے نفس کشی کے بجائے نفس یعنی خودی کی نگہداشت پر زور دیا۔ ہر قسم کی اوہام پرستی کی شدید مذمت کی اور تقدیر اور توکل کے صحیح معنی ذہن نشین کرائے اور یہ سکھایا کہ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"۔ جد و جہد کی ضرورت پر اتنا زور دیا کہ راحتِ منزل پر زحمتِ سفر کو ترجیح دی۔ کہا کہ "زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل"۔ اس موضوع پر علامہ کے بے شمار اشعار ہیں چند ملاحظہ ہوں:

بے سوزِ دروں سے زندگانی — اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ (تلمیح ہے)

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

آخر میں امیر شکیب ارسلان کا ایک جملہ جو انہوں نے علامہ کے متعلق لکھا ہے پیش کر کے میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔ امیر ارسلان نے ایک موقع پر کہا کہ "گذشتہ ایک ہزار سال .... کے دوران اسلام نے جو مفکر پیدا کئے۔ اُن میں اقبال کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ اقبال ایک فلاسفر بھی ہیں اور شاعر بھی اور ان کے یہاں فلسفہ اور شاعری کچھ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو گئے ہیں کہ دوسرے مفکرین کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی"۔

اقبال کے تعلیمی تصورات

از جناب نصیر احمد صاحب

اقبال کے تعلیمی افکار کی تشکیل اور نشو و نما میں اُن کے سفر یورپ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یورپ میں قیام کے دوران وہ اہل یورپ کی زندگی میں عملیت پسندی، مصروفیت اور ان کی عام زندگی میں قناعت اور استعداد کار کے علاوہ یورپی اقوام کی سائنسی ترقی، ان کے استدلالی انداز فکر اور یورپ کی مختلف اقوام کے درمیان مقابلے (COMPETITION) کی روح سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے تمام تر افکار و اعتقاد کا تانا بانا فرد کی تعلیم و تربیت اور اس کے اجتماعی اور معاشرتی شعور سے تیار ہوا ہے۔ سفر یورپ سے واپسی پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی عام سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی پسماندگی ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے تعلیمی تصورات میں فرد کی تعلیم و تربیت اور اس کے معاشرتی شعور کی نشو و نما پر بہت زور دیا ہے حتیٰ کہ ضرب کلیم میں "تعلیم و تربیت" کے عنوان کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسلام ایک حرکی DYNAMIC مذہب ہے۔ اقبال نے اپنے فکر و شعر میں اسلام کے اسی حرکی پہلو پر زور دیا ہے۔ اور اپنے فلسفہ تعلیم کی بنیاد فلسفہ خودی پر رکھی۔ اقبال کے تعلیمی افکار کی بنیاد اسی فلسفہ خودی پر قائم ہے۔

اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے چنانچہ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے بلکہ غزل کے شاعر تھے۔ لیکن انہوں نے غزل میں مزید وسعت پیدا کی۔ اور اس کو ایک مخصوص مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اقبال کی شاعری کا سارا لب و لہجہ غزلیہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس غزلیہ رنگ میں شاعری کو ملت کے افراد کی سیرت و شخصیت کی بھرپور نشو و نما کے لئے استعمال کیا۔ اقبال کی شاعری اسلامی تعلیمات ہی کی ایک صدائے بازگشت ہے۔ اقبال ایک تعلیمی فلسفی یا ماہر تعلیم نہ تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ بھی کہا فرد کی شخصیت کی تعمیر اس کا سب سے اہم مقصد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ساری شاعری، ان کا فلسفہ اور سیاست اسی نکتہ خودی کے گرد گھومتے ہیں۔ خودی کا لفظ ایک لاطینی

لفظ EGO سے ماخوذ ہے جس کا مطلب I AM (میں ہوں) ہے۔ خودی کا مسلک اور اصول یہ ہے کہ فرد اپنی ذات کو پہچانے اور اپنی ذات کے اندر خدائی صفات پیدا کر کے اپنی شخصیت کی بھرپور نشوونما کرے۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ خودی کی نشوونما کے تین مراحل ہیں جن سے گذر کر ایک فرد مردِ کامل یا مردِ مومن بن جاتا ہے۔ یہ خودی انفس یا فرد کی داخلی دنیا بھی کہلاتی ہے۔

جب فرد خودی کی تعمیر کرلے تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنی تمام تر استعداد اور صلاحیت معاشرے کے اجتماعی مفاد کے لئے وقف کر دے۔ اقبال اسے بے خودی کہتے ہیں جو انفس کے مقابلے میں آفاق یا خارجی دنیا بھی کہلاتی ہے۔ فلسفۂ خودی پر اقبال کی تصنیف اسرارِ خودی اور بے خودی پر رموزِ بے خودی ہیں جو فرد اور اجتماعیت، انفس و آفاق، داخلی اور خارجی دنیا کے آپس کے گہرے ربط اور نہ ٹوٹنے والے رشتے کی غمازی کرتی ہیں۔ اقبال کے تعلیمی فلسفے کی بنیاد اسی فلسفۂ خودی اور فلسفۂ بے خودی پر قائم ہے۔ اقبال کے تعلیمی تصورات تعلیم کے انفرادی اور اجتماعی مقاصد پر محیط ہیں۔ اقبال کے ہاں مذہب تعلیم کی جڑ ہے اور مذہب محبت کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو احترام آدمیت اور تکریم انسانیت کا درس دے۔ یہی تعلیم کا نقطۂ آغاز اور یہی اس کا حرفِ آخر ہے۔ آج دنیا جمہوریت اور اشتمالیت کے دو سیاسی نظاموں میں منقسم ہو گئی ہے۔ پوری مغربی دنیا کو اپنی جمہوریت پر ناز ہے۔ اور کمیونزم اشتمالیت پر فخر کرتا ہے ایک فرد کی آزادی کا علمبردار ہے اور دوسرا اجتماعی ڈسپلن پر زور دیتا ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور ردِّ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آریائی ذہن کے برعکس وہ ہر شے کی حقیقت کو ایک وحدت اور اکائی کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اور وہ اس شے کی ماہیت کو توڑ کر اسے مختلف خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فلسفۂ تعلیم جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے وہ بھی فرد اور جماعت، قدامت اور جدت، داخلی اور خارجی دنیا انفس و آفاق، روح اور مادہ اور روحانی اور مادی علم کو اکائی کی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے۔ کہ فرد اور جماعت کے باہمی مفادات اور تقاضوں میں کوئی تضاد اور مغائرت پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک دوسرے کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک زمانہ کائنات اور حیاتِ انسانی ایک ہی تصویر کے مختلف پہلو ہیں اور انہیں الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

ع زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات ایک

اقبال کے نزدیک تقدیر کا فلسفہ (FATALISM) ہمارے قومی تنزل کا سب سے بڑا باعث ہے۔ اسلام سے قبل کچھ مذاہب ایسے بھی تھے جو فلسفۂ تقدیر کے قائل تھے۔ انسان کو کائنات میں ہیچ سمجھتے تھے اور اسے ارادہ کی آزادی سے یکسر محروم سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج بھی ستاروں اور سیاروں کے نام قدیم یونانی دیوی

اور دیوتاؤں اور علم الاصنام پر رکھے گئے ہیں اس کے برعکس اقبال نے اپنے فلسفہ تعلیم کی بنیاد فرد کی شخصیت کی تعمیر اور مکمل نشوونما پر رکھی اور فرد کی ذات کو ابھارنے اور اس کی جملہ فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مکمل شخصیت کا ارتقاء، توحید، آزادی، صداقت، جمال، محبت اور صلح و نیکی اسلام کی تعلیمی اقدار میں شامل ہیں۔ اقبال کے تعلیمی افکار کی بنیاد اسلامی تعلیم یعنی تخلقوا باخلاق اللہ (اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا کرو) کی صدائے بازگشت ہے۔

تعلیم کے تین بڑے مقاصد ہیں۔

۱۔ INTELLECTUAL یعنی ذہنی جس کا تعلق صداقت یا سچائی سے ہے۔

۲۔ ETHICAL یعنی اخلاقی جس کا تعلق خیر اور نیکی سے ہے اور

۳۔ AESTHETIC یعنی جمالیاتی جس کا تعلق حسن سے ہے۔ اور یہی وہ تینوں عناصر ہیں جن سے حیات انسانی عبارت ہے۔ اور یہی وہ تینوں .... چیزیں خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی صفات ہیں اور خدا کی فطرت میں شامل ہیں۔ چنانچہ بقول اقبال انسانی زندگی کا سب سے بڑا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ تزکیہ نفس اور خودشناسی کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کرے اور یہی تعلیم کے قطعی اور آخری مقاصد بھی ہیں۔ اقبال کے فلسفہ تعلیم کی بنیاد انہی تصورات پر قائم ہے اور یہی وہ تعلیم ہے جو فرد کی دینی اور دنیاوی فلاح و بہبود کی ضامن ہے اور فرد اور جماعت کے باہمی ربط کو قائم رکھتی ہے تعلیم کے اسی عالمگیر تصور پر اقبال نے اپنے تعلیمی تصورات کی عمارت تعمیر کی اور لا الہ کو تعلیم کی بنیاد بنایا۔ قدیم اور جدید کے تصور کو باطل قرار دیا اور پوری کائنات، حیات انسانی اور زمانے کے تسلسل اور وحدت کو تسلیم کیا۔ ایسا تسلسل اور وحدت جو ماضی حال اور مستقبل اور قدیم و جدید کی مصنوعی حد بندیوں سے آزاد ہے۔

ے زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

جدید تعلیم کے بارے میں کہا گیا کہ ایسی تعلیم ہمارے لئے فراغت لائے گی لیکن ہوا اس کے برعکس۔

ے کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبال نے اپنے فلسفہ تعلیم میں فرد کی ذات میں لا الہ کا جوہر پیدا کرنے کی اہمیت پر زور دیا جو زمانے کے تمام مضر اثرات کے خلاف ایک موثر ڈھال ثابت ہو سکتی ہے۔

ے جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر

از جناب پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اقبال کی شاعری کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لحاظ سے قابلِ اطمینان نہیں ہے کہ اس میں زیادہ تر سروکار یا تو اقبال کے فلسفیانہ افکار کی توضیح سے رہا ہے یا ان کے سیاسی عقائد اور ملّی جذبات سے۔ اقبال کے فکری میلانات اور مذہبی افکار ہمیں واضح طور پر ان کے خطبات اور دوسری نثری تحریروں میں ملتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر یہ تعین کرنا مشکل نہیں کہ اقبال کے ذہن میں انسان اور نصب العینی سماج کے خد و خال کیا ہو سکتے ہیں۔ ادبی تنقید کا مطالعہ اس سے مختلف ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں لکھنے والے دو طرح کی غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو مجرد قسم کی بات آفرینی پر زور دیتے ہیں۔ اور کسی شاعر کی بڑائی کو اس کے فکری سرمائے کی بڑائی پر تمام تر منحصر مانتے ہیں، ان کے نزدیک یہ بات نسبتاً کم اہم ہے کہ شعر کی کائنات میں فکر کا عمل کس طرح ہوتا ہے، دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو فنّی وسائل اور ساز و سامان کو محض آرائشِ سخن کے تابع کر دیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ فکری اور نظریاتی تجزئے پر زور دینے والوں سے اس درجہ خائف اور مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی کھل کر اور پورے طور پر حمایت نہیں کر سکتے۔ ہماری تنقید میں جب مواد اور ہیئت کے سلسلہ میں کوئی بحث کی جاتی ہے تو وہ اصولی طور پر چاہے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو، لیکن اس کا محکم طور پر اطلاق کسی فنّی کارنامے پر نہیں کیا جاتا۔ جن دو اہم بنیادی باتوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ مواد اور ہیئت کی صحیح آمیزش اور کلّی مطابقت سے جو حقیقت وجود میں آتی ہے وہ لغوی یا سائنٹفک یا قابلِ استناد خارجی حقیقت سے مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ فن کی کائنات اس معنی میں خود مکتفی ہوتی ہے۔ کہ وہ جن رابطوں یا مطابقات سے مرکب ہے۔ وہ خود ہی ایک طرح کی حقیقت کو جنم دیتے ہیں۔ اقبال کے سلسلہ میں یہ بات اکثر دہرائی گئی ہے کہ انھیں اپنے فکر کی اہمیت پر اصرار تھا اور وہ اس کی ترسیل میں اس درجہ منہمک رہتے تھے۔ کہ ان کے بقول فنّی تراش و خراش پر پوری توجہ مرکوز

کرنے کی انہیں مہلت ہی نہیں تھی۔ اقبال کے ہر بیان کو اس کے سطحی مفہوم میں قبول کرلینا خود تنقید سادہ لوحی کی دلیل ہے۔ اقبال اصطلاحی معنوں میں بڑے مفکر سے زیادہ حکیم اور عارف تھے۔ کیونکہ ان کے کان نبض ہستی کی دھڑکن پر لگے رہتے تھے۔ اور کائنات اور وجودِ کلی کا تموج اور تنفس ان کے شعری ادراک کا حصہ تھا لیکن فن کی نفاستوں اور باریکیوں کے سلسلے میں ان کی پرکھ، زندگی میں ان کی معرفت اور بصیرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میتھو آرنلڈ نے انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی شاعری حقیقت ہے اور اس کا فلسفہ محض ایک واہمہ کالرج نے اس قول کی تردید میں اور اپنے دوست اور ہم عصر ورڈز ورتھ کی بڑائی کو ثابت کرنے کے لئے اس رائے کا اظہار کیا کہ کوئی شاعر بڑا شاعر اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ طویل عرصے تک فکر کی گہرائیوں میں نہ ڈوبا رہا ہو۔ یہاں ان دونوں میں سے کسی رائے پر محاکمہ مقصود نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اول تو شاعرانہ فکر، مجرد فلسفیانہ تفکر سے مختلف ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ دوسرے فلسفیانہ تفکر فن کے معمل سے گزر کر ہی قابل احترام بنتا ہے۔ اور تیسرے وہ بصیرت جو اس طرح چھن کر سامنے آتی ہے اس حقیقت سے مختلف ہوتی ہے۔ جس سے ہم روزمرہ کی زندگی میں دوچار ہوتے ہیں۔ یا تو فلسفے، سائنس، اور الٰہیات کی کائنات میں محصور اور ان سے متعلق اور منسلک ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ کسی فن پارے کو فنی نقطۂ نظر سے پرکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس کی تہہ میں جو خیالات اور احساسات ہیں انھیں نظرانداز کیا جائے۔ دراصل تنقیدی عمل کے دوران فکری میلانات اور نظریات یا جذبات و احساسات کا ایک دوسرے سے علیحدہ ذکر کرنا بے معنی ہے۔ کیونکہ جس پیچیدہ مرکب کو لفظ وحدت کی تنظیم کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے وہ خیالات و جذبات نہیں ہیں بلکہ تجربے کا وہ نقطۂ ارتکاز ہے جس میں مختلف عناصر اور عوامل ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔

اقبال فن سے اپنے تغافل کی طرف جتنی بھی توجہ مبذول کرائیں۔ مگر ان کے فن کی عظمت اور برگزیدگی میں شبہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر وہ صرف فن کے خارجی لوازمات اور اس کے نوک و پلک کے اہتمام و التزام ہی پر اپنی توجہ صرف کرتے۔ تو وہ محض ایک دوم درجے کے شاعر ہو کر رہ جاتے۔ انگریزی شاعر ورڈز ورتھ نے جب زبان کو شاعرانہ فکر کا لبادہ نہیں بلکہ اس کی تجسیم (INCARNATION) سے تعبیر کیا تو اس نے ایک گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لبادے کو باہر سے عائد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے اتارا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن تجسیم سے ذہن اس امر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کہ کسی مخصوص تجربہ کے لئے اس کا خارجی پیکر اس تجربہ کو شخصیت کی گہرائیوں میں جذب کرنے کے ساتھ ہی مُبرم طور پر وجود میں آیا ہے۔ بالفاظ دیگر فنی اظہار ایک عضوی فارم ہے جو تجربہ کے ساتھ نہ صرف گہرے طور پر مربوط ہے بلکہ دونوں کے درمیان ایک ہم آنی (INSTANTANEOUS) کیفیت مشترک ہے۔ اقبال کے یہاں ان کے فلسفۂ حرکت و عمل کی جو بھی اہمیت ہے سخت کوشی پر جو اصرار ہے اور نفس کے مستتر امکانات کو بروئے کار لانے کی جو ترغیب ملتی ہے اُسے اس کے شعری سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھنے سے ہم اس کے ساتھ پوری طرح

انحراف نہیں کر سکتے۔ اقبال کی تنقید کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ، جو اب تک مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ یہ متعین کرنا ہے کہ کہاں ان کے مذہبی اور فلسفیانہ عقائد اور نظریات شعر کی زندہ تجسیم میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور کن مقامات پر وہ محض اصول اور تعلیمات کی طرح پر نظم کئے گئے ہیں۔

اقبال نے اپنی ذاتی ڈائری میں جن مغربی شاعروں کا ذکر کیا ہے، ان میں شیکسپیئر کے علاوہ گوئٹے اور بائرن قابلِ ذکر ہیں "پیامِ مشرق" میں نقشِ فرنگ کے عنوان کے تحت جن مغربی مفکروں اور شاعروں کا ذکر ہے ان میں اوروں کے علاوہ براؤننگ کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال براؤننگ کے شعری مزاج اور اس کے منا طریقہ کار کے بھی ضرور رازداں رہے ہوں گے۔ اپنے مخصوص فلسفۂ خودی کے پیشِ نظر وہ فنِ ڈرامہ نگاری میں تمثیل کے قائل نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اداکار کسی مخصوص کردار کو بعینہٖ اسٹیج پر اس وقت پیش کر سکتا ہے جب وہ اپنی خودی کے لبادہ کو اتار کر اپنے آپ کو اس کردار کے اندر مدغم نہ کر دے اور یہ کسی طرح احسن طریقۂ کار نہیں ہے۔

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

لیکن قطع نظر اس ایک پہلو کے اقبال کے یہاں ڈرامائی طریقہ کار کی بہت سی جھلکیاں ملتی ہیں۔

مکالمہ کرداروں کی تخلیق فضا اور صورت حال کی تعمیر کشمکش، معروضیت اور نقطۂ ارتقا، ان سب عناصر سے مل کر ڈرامائی فن پارہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ان میں سے چند اجزا بھی کسی ادبی کارنامہ میں موجود ہیں تو ہم اسے ڈرامائی تخیل کا نتیجہ فرض کر لینے میں حق بجانب ہیں۔ بانگِ درا میں ایک ابتدائی نظم کا عنوان عقل و دل ہے۔ اس میں عقل سے مراد ادراک کا وہ وسیلہ ہے جو منطق اور استدلال پر تکیہ کرتا ہے۔ اور تحلیل و تجزیہ پر زور دیتا ہے اور دل سے اشارہ اس بصیرت یا انکشاف کی طرف ہے جو چشم زدن میں اشیا کے باطن کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ دل کے جواب میں دونوں کا موازنہ اس طرح کیا گیا ہے۔

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے	اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے	اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے	تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی	اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

اس سے پہلے عقل اپنا تعارف بھی کرا چکی ہے اور اپنے امتیازات بھی گنا چکی ہے۔ اس مختصر سی نظم کی بساط پر دو متخالف رویوں کو مکالمے کے ذریعہ سامنے لایا گیا ہے۔ شاعر نے اپنی ترجیح کا راز کبھی کھلنے نہیں دیا۔ تاکہ حقیقت کی تفہیم کے دونوں راستے نمایاں ہو جائیں اور پڑھنے والا خود ہی فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے صحیح اور معتبر راستہ کون سا ہے۔ اس بات کو "ضربِ کلیم" میں یوں ادا کیا ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن

"پیام مشرق" میں بھی علم و عشق کے درمیان ایک مکالمہ ہیں دونوں کا نقطۂ نظر یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے پہلے علم کہتا ہے۔

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است　　گرفتارِ بہ کندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند　　مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است

عشق کا جواب اس کے برعکس دو مصرعوں میں یہ ہے۔

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است　　ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی　　بریدی از من و نورِ تو نار است

یہاں بھی اقبال نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے۔ بلکہ دونوں نقطہ ہائے نظر غیر جانبداری کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں البتہ ان کے پورے کلام کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ خود ان کی ہمدردیاں کس طرف ہیں۔

بانگِ درا میں وہ معروف نظمیں "رات اور شاعر" اور "شمع اور شاعر" ہیں ــــ اول الذکر میں محض ایک ذہنی کیفیت کی عکاسی ملتی ہے۔ نظم ایک نوع کے استعجاب سے شروع ہوتی ہے۔ جو شاعر کے غیر معمولی رویئے نے پیدا کیا ہے۔ شاعر کا جواب رات کے اس استعجاب کو دور کرتا ہے "شمع و شاعر" میں شمع کا استفسار مختصر سا ہے۔ البتہ شاعر کے کردار کو ایک معمول کے طور پر کام میں لا کر اقبال نے ان بہت سے تجربات اور احساسات کو منتشکل کیا ہے جو ان کے دل کی گہرائیوں میں ہنگامہ پرور تھے۔ اسی طرح " اسرار خودی" میں "حکایت الماس و زغال" کے پردے میں اقبال نے ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو بالکل آخر میں مترشح ہوتا ہے۔ زغال کی گفتگو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ہمدمیم و ہست و بود ما یکیست　　در جہاں اصلِ وجودِ ما یکیست
قدرِ من از بدگل کمتر ز خاک　　از جمالِ تو دلِ آئینہ پاک
روشن از تاریکئی من مجمر است　　پس کمالِ جوہر خاکستر است
پشتِ پا ہر کس مرا بر سر زند　　بر متاعِ ہستیم اخگر زند
بر سر و سامان من باید گریست　　برگ و ساز ہستیم دانی کہ چیست؟
موجۂ دودے بہم پیوستۂ　　مایہ دارِ یک شرارِ جستۂ

اور اس کا جواب الماس نے یہ دیا ہے۔

پر کرم از پختگی ذو النور شد سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجودِ خام خویش سوختی از نرمیٔ اندام خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش پختہ مثل سنگ سو الماس باش
می شود از دے دو عالم مستنیر ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است

پیام مشرق میں خدا اور انسان کے درمیان جو مکالمہ ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ اس مکالمے میں انسان کا جواب اس کے ادعائے خودی کا حامل ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس جواب سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نے تخلیق خداوندی پر کیا کیا اضافے کئے ہیں۔ خدا یہاں فطرتِ عالم یا ہستی کائنات کے مرادف ہے اور انسان کا نقطۂ نظر دراصل فن کار کا نقطۂ نظر ہے۔ اس لئے ایک معنی میں یہ مکالمہ فطرت اور ہنر یا آرٹ کے درمیان تضاد کا اشارہ بن جاتا ہے۔ انسان کا جواب قابلِ غور ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدم خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

پیام مشرق کی ایک نظم ''زندگی'' میں، یہ مکالمہ خود شاعر اور کسی مورخ حکیم کے مابین واقع ہوتا ہے اور زندگی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر اقبال اس طرح پیش کرتے ہیں۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست گفتا کہ تلخ تر او نکو تر است
گفتم کہ کرمک است و زگل سر بروں زند گفتا کہ شعلہ زاد مثال سمندر است
گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں تر است
گفتم کہ شوق سیر نہ کش بہ منزلے گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بنی کش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است

ہستی اور نیستی، عدم اور وجود، زندگی اور تعطل، حرکت اور جمود کے درمیان فرق کو ایک سریع الاثر ذہنی تمثال کے ذریعہ اس طرح ابھارا گیا ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

موجِ ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می‌روم گر نروم نیستم

پیام مشرق میں ایک نظم "حور و شاعر" کے عنوان سے خاصی اہم ہے۔ جو شاعر کی خودنگری اور نرگسیت کی شکوہ سنج ہے۔ اسے اس کی شخصیت کے اندرونی سوز و ساز کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہے۔ اور اس کے کلام کی تخلیقی قوت اور سحر انگیزی کا بھی۔ مگر اس کی کم آمیزی، تغافل شعاری اور اپنے آپ میں ضرورت سے زیادہ کھوئے رہنے کا اسے بہرحال گلہ ہے۔ حور اپنی شکایت کا آغاز اس طرح کرتی ہے۔

نہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی عجب این کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی
ہمہ ساز جستجوئے ہمہ سوز آرزوئے نفسے کہ می گدازی غزلے کہ می سرائی
بنوائے آفریدی چہ جہانِ دلکشائے کہ ارم بچشم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر کا جواب غور طلب ہے۔ اس کے مزاج کی ساری شوریدگی، سیمابیت اور آرزومندی، خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ، وفورِ احساسات، نئی منزلوں کی طرف جادہ پیمائی، نئے افقِ زیست کی جستجو، مدام پیکر تراشی، دردمندی اور غمگساری کی طلب، ان سب کا انعکاس اور ارتعاش اس جواب میں جھلکتا ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بلالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آن زمان دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آن کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

اقبال کی بڑائی یہ کہہ کر اکثر گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے یہاں دوم درجہ کی انتخابیت (ELECTICISM) پائی جاتی ہے۔ سردست اس رائے کی خامی سے یہاں بحث مقصود نہیں ہے۔ البتہ یہ امر مسلمہ ہے کہ اقبال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ عقیدت مولانا روم سے ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ مثنوی معنوی کے بعد اقبال کے یہاں سب سے زیادہ اثرات نطشے اور برگسان کے ملتے ہیں۔ رومی کو وہ اپنا روحانی مرشد قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے اساسی اور مرکزی خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ رومی اور اقبال دونوں وجدان کو عقلِ فرومایہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں تقدیر کو پابستگی نہیں بلکہ عین آئینِ حیات سمجھتے ہیں اور انسان کو اپنی تقدیر کا خالق مانتے ہیں۔ دونوں نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں اور

جد و جہد اور مدام آرزومندی کو ارتقا کا سبب تصور کرتے ہیں۔ دونوں فرد کی خودی یعنی اس کی سرشت اور فطرت میں مستتر توانائیوں کو بروئے کار لانے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن خودی کے نشو و ارتقاء کی بے خودی کے ضابطہ سے تحدید کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں بقا مشروط ہے، حرص بقا پر۔ دونوں جہد مسلسل کو زندگی اور تعطل کو موت کا مترادف جانتے ہیں۔ اور دونوں کے یہاں کارزار حیات میں مسلسل اور پیہم سعی و طلب اور جہد و عمل نئی دنیاؤں کو معرض وجود میں لا سکتا ہے۔ اس ذہنی اور روحانی مناسبت اور یک رنگی کی بنا پر اقبال انہیں عارف رومی کہتے ہیں۔ "بال جبریل" کی ایک نظم میں جس کا عنوان ہے "پیر و مرید" اقبال نے اپنے شکوک و شبہات اور اپنی الجھنوں کی کشاد کے سلسلے میں رومی سے رجوع کیا ہے۔ یہ بازگشت ہے اس استفہامیہ انداز کی جو ہمیں ایک نسبتاً ابتدائی نظم "خضر راہ" میں ملتا ہے۔ یہاں الگ الگ سوالات کا فرداً فرداً مختصر طور سے جواب دیا گیا ہے۔ یہ پوری نظم ایک طرح کا محاسبۂ ذہنی و نفسی ہے۔ کردار بظاہر دو نوں غیر مشخص ہیں۔ اور سوال و جواب کا یہ طریقہ ایک طرح کے ایقان و اطمینان کو حاصل کرنے کے لئے برتا گیا ہے۔ علم کی دو قسموں کو یعنی وہ جس کی بنیاد استدلال محض پر ہو، اور وہ جو کشف حقائق تک پہنچائے، رومی نے اس طرح ممیز کیا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی کے اس سوال کا

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایت آدمی خبر ہے یا نظر؟

واضح طور پر رومی نے یہ جواب دیا ہے :-

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

اسی طرح مرید ہندی جب یہ استفسار کرتے ہیں۔

گرچہ بے رونق ہے کارزار وجود
کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود؟

تو انہیں یہ جواب ملتا ہے۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظن است و حیرانی نظر

مرید ہندی کا ایک اور سوال توجہ طلب ہے :

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیر رومی اس کا جواب یہ دیتے ہیں

علم و حکمت زائد از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

اور مریدِ ہندی کے آخری تبصرے پر

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیرِ رومی کا ارشاد ہوتا ہے:

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

جبرئیل و ابلیس میں نہ صرف یہ مکالماتی انداز برقرار رکھا گیا ہے بلکہ اس میں دو شعری کردار بھی تخلیق کئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر دو معروف اساطیری کرداروں کو ایک افسانوی ڈھانچے میں مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ "پیامِ مشرق" میں میلادِ آدم پر ایک پوری نظم موجود ہے۔ "بالِ جبرئیل" میں دو نظمیں فرشتے آدم کو رخصت کرتے ہیں" اور "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"، اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اقبال نہ صرف ہبوطِ آدم کے واقعے سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اس کے ڈرامائی امکانات پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہ واقعہ بیک وقت قرآن کریم اور انجیل مقدس دونوں میں مذکور ہے۔ عیسائیت کی تعلیم کے برعکس جس کے مطابق سقوطِ انسان رحمت و سعادت کے منتہا سے گرنے اور غیر مختتم ذلت و گمراہی کی دلیل ہے۔ اقبال ایک اثباتی نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ اور انسان کو ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں سمجھتے۔ اس خاص نظم میں ابلیس کا کردار مرکزِ ثقل ہے کیونکہ وہ ممکناتِ زندگی کا اشارہ ہے۔ چنانچہ جبرئیل کے اس اظہارِ خیال پر۔

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

ابلیس کا جواب بہت معنی خیز ہے۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میرا گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو

اور پھر جب جبرئیل ان بلندیوں اور رفعتوں کا ذکر کرتا ہے، جو اس نے اپنی سرکشی اور ضد کی وجہ سے کھو دیں اور گویا اس طور پر سقوطِ ابلیس سے فرشتوں کی آبرو خدا کی نظروں میں گر گئی۔ تو جو جواب ابلیس اس کا دیتا ہے، اس میں طنطنہ، اوعائے خودی، خود اعتمادی اور زمین کی بساط پر انسانی تگ و تاز کے ہنگامے میں خود اس کا حصہ، ان سب کی جھلکیاں اس میں ملتی ہیں:-

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو!
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

اس جواب میں گہری طنز کا عنصر اس تضاد میں ہے جو جبرئیل کی معصومیت اور ابلیس کے تجربے کے لئے اہلیت کے درمیان موجود ہے، جبرئیل ایک خاموش تماشائی ہے۔ اس کی کائنات ہی رنگ و بو اور امکاناتِ خیر و شر سے مبرا ہے۔ ابلیس کی جرأت تہلکہ خیز ہے ہر چند وہ خطا اور نسیان اور ظلم و جہل کا مرکب ہے۔ مگر اس کی اندرونی توانائیاں۔ اس کی قوتِ مقاومت اور اس کی خارا شگافی بہر حال ہمیں تحسین پر اکساتی ہیں۔

بانگِ درا کی ایک نظم "چاند اور تارے" میں حرکت کا فلسفہ، جسے اقبال نے اپنی پیکر نگاری کے ذریعہ ہزار حسن و دلآویزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چاند اور تاروں کی زبانی اس طرح مجسّم اور متشکل کیا ہے۔

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے، انسان، شجر حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا

کہنے لگا چاند ہم نشینو! اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

ایک اور نظم "حقیقتِ حسن" میں صرف دو کردار ہی مصروفِ گفتگو نہیں ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوری انجمن جمی ہوئی ہے جس میں حسن خدا سے اپنی عارضی اور آنی جانی کیفیت کے متعلق دریافت کرتا ہے اور اسے یہ جواب ملتا ہے:

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

زوال ایک اٹل حقیقت ہے، اور تغیر و حرکت تخلیقِ کائنات کے امتیازی نشانات ہیں اس اصول کا اطلاق جس طرح تمام کائناتِ فطرت پر کیا گیا ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور ڈرامائی بھی۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سُنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

یہاں جو مجرد خیال سطح کے نیچے ہے، اسے اقبال نے ایک مصرع میں اس طرح ادا کر دیا ہے:-

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

مگر اس بنیادی حقیقت کو گفتگو کے لین دین کے وسیلے سے تخیلی بلکہ ڈرامائی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

"ارمغانِ حجاز" میں نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کے علاوہ پانچ اور کردار ہیں۔ یہ "حقیقتِ حسن" کی طرح اس نظم کی بساط بھی ارضی نہیں بلکہ سماوی ہے۔ یہاں حسن کی گریز پائی اور لمحاتی وجود کے برعکس سیاست عالم کا نقشہ پھیلا ہوا ہے اور یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس عالم کون و فساد میں سرمایہ داری، ملوکیت اور نسل و قوم کے جو بُت انسانی ذہن نے تراشے ہیں۔ اور انھیں اپنی تنگ ذاتی اغراض اور انسانیت کی آبروریزی کے لئے جس طرح

استعمال کیا گیا ہے۔ اور استحصال کی جتنی مختلف شکلیں اس وقت نظروں کے سامنے ہیں۔ ان کے اسباب و محرکات پر غور کیا جائے۔ قدرتی طور پر اس ضمن میں مسلمانوں کا طرزِ فکر و عمل اور اسلامی تعلیمات کی روح بھی معرضِ بحث میں آ گئی ہے ابلیس کے پانچوں حاشیہ نشین مسائل کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھ کر اسے مشورہ دیتے ہیں۔ ابلیس خود بھی ان مسائل میں کچھ نہ کچھ بلکہ خاص بصیرت رکھتا ہے۔ اور اس مذاکرہ میں حرفِ آخر اسی کا ٹھہرتا ہے، وہ اپنے تاثرات اور محاکے کو جس طرح پیش کرتا ہے۔ اس میں اس تمام بحث کی تلخیص سمٹ آتی ہے۔ اسلام کے بارے میں ابلیس کی افتادِ فکر جستہ جستہ اشعار میں اس طرح جھلک اٹھتی ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر

جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

اقبال کی ان سب نظموں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ متضاد نقطہ ہائے نظر کو دو یا دو سے زیادہ کرداروں کی زبان سے پیش کرنے کی طرف میلان مشترک سے نظر آتا ہے۔ یہاں ہمیں شعری کردار بھی ملتے ہیں جیسے شاعر، خضر راہ، جبرئیل ابلیس۔ ان کے اور دوسرے کرداروں کے درمیان مکالمہ بھی حقیقت حسن اور مجلس شوریٰ میں بعض مواقع کی بھرپور تصویریں ملتی ہیں۔ اقبال نے اپنے تجربات اور بصیرتوں کو نہ براہ راست پیش کیا ہے اور نہ محض پیکر نگاری کی مدد سے۔ بلکہ اکثر و بیشتر متضادات کے ذریعے ان کے پیش کرنے میں ایک طرح کی غیر جانب داری ملتی ہے اور ایک ڈرامائی عنصر جس سے خود اقبال کے افکار و احساسات کی تازگی اور فعالیت کا ثبوت ملتا ہے۔ خود ان کے نقطۂ نظر کو متعین کرنے کے لئے پورے کلام کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور بین السطور پڑھنے کی بھی۔

اسلامی نظریات کی بالادستی

بہرحال مذکورہ بالا قرآنی آیات و احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اسلامی ریاست لادینی ریاستوں اور حکومتوں سے کئی باتوں میں مختلف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے اس میں اسلامی اصولوں کی اطاعت کو ہر چیز پر بالادستی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ یہ اصول، حکام اور صاحبان اقتدار کی اطاعت سے بھی بالاتر ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی ریاست اور لادینی ریاست کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے۔ ایک لادینی یا غیر مذہبی ریاست مذہب اور الہامی ہدایت کے بجائے عقل و مصلحت سے کام کرتی ہے۔ اور کسی مذہب کی پابند نہیں ہوتی ہے۔ ایسی ریاست اسلام کے بالکل مخالف ہے۔

(کتاب اسلام کے بنیادی نظریات)

اقبال اور اقبالیات

از حکمت فرخ آبادی ایم اے

۱- حیاتِ اقبال

سنہ ۱۸۷۷ء - ۹ر نومبر۔ علامہ اقبال کی ولادت۔ آپ کی والدہ نے آپ کا نام محمد اقبال رکھا۔

سنہ ۱۸۸۳ء — اسکاچ مشن ہائی اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔

سنہ ۱۸۸۷ء — پرائمری کا امتحان پاس کیا۔

سنہ ۱۸۹۰ء — مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔

سنہ ۱۸۹۳ء — انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور نتیجہ نکلنے سے قبل پہلی شادی ہوئی۔

سنہ ۱۸۹۵ء — اسکاچ مشن کالج، سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا، پھر مزید تعلیم کے لئے اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آپ کے مضامین، انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔

سنہ ۱۸۹۶ء — انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند لاہور کی پہلی مجلس میں پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا مصرعہ تھا۔ "کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں"

سنہ ۱۸۹۷ء — بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور انگریزی اور عربی میں اول آنے پر دو طلائی تمغے حاصل کئے۔

سنہ ۱۸۹۸ء — لاہور لاء اسکول میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا اور دسمبر میں قانون کا امتحان (P.E.L.) دیا، لیکن اصولِ قانون کے بیچ میں فیل ہو گئے۔

سنہ ۱۸۹۹ء — فلسفہ میں ایم اے کیا۔ اور یونیورسٹی میں اول آنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ بعد میں اورنٹیل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا۔

اپریل — انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اپنی نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء - اپریل - شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن میں نظم "ہمالہ" شائع ہوئی۔

— انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں نظم "ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے" پڑھی۔
— ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن میڈیکل بورڈ نے ناکام قرار دیا۔

۱۹۰۲ء جنوری ماہنامہ 'مخزن' کے شمارے میں مضمون "بچوں کی تعلیم وتربیت" شائع ہوا۔
۱۹۰۳ء اکتوبر ماہنامہ مخزن کے شمارے میں مقالہ "اردو زبان پنجاب میں" شائع ہوا۔
۱۹۰۴ء — جب پروفیسر آرنلڈ سبکدوش ہوکر انگلستان چلے گئے تو ان کی روانگی سے متاثر ہوکر نظم "نالۂ فراق" لکھی۔
۱۹۰۵ء — انگلستان روانگی اور کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنیٹی کالج میں داخلہ
۱۹۰۷ء یکم اپریل۔ عطیہ بیگم سے لندن میں ملاقات۔
" جولائی جرمنی روانگی اور میونخ یونیورسٹی سے "ایران کا فلسفۂ مابعد الطبیعات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا۔
" — جرمنی سے واپسی پر پروفیسر آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لئے عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔
۱۹۰۸ء مئی — لندن میں آل انڈیا مسلم لیگ برٹش کمیٹی کا افتتاح۔ اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔
" ۲۷ جولائی۔ یورپ سے واپس لاہور پہنچے۔
" ۲۲ اکتوبر۔ پنجاب چیف کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام وکلا کی فہرست میں درج کر لیا جائے۔ کچھ دنوں بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور ڈیڑھ سال بیرسٹری کے ساتھ پروفیسری بھی کی۔
۱۹۰۹ء مئی — انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔
" اکتوبر — کشمیری میگزین لاہور میں "رباعیاتِ اقبال" کے عنوان سے مسلمانانِ کشمیر کے متعلق آٹھ رباعیاں شائع ہوئیں۔
" — علی گڑھ کالج سے فلسفہ کی پروفیسری کی پیش کش ہوئی مگر آپ نے اسے قبول نہ کیا۔
۱۹۱۰ء — سرکاری پابندیوں سے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا اور گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔
۱۹۱۱ء اپریل۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں نظم "شکوہ" پڑھی۔
" اگست — موچی دروازہ لاہور کے باہر ایک بڑے جلسہ میں "جواب شکوہ" پڑھی۔
۱۹۱۲ء اپریل — انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی مشہور نظم "شمع وشاعر" سنائی۔

سنہ ۱۹۱۲ء — اسی سال دوسری شادی کی۔

سنہ ۱۹۱۳ء ستمبر مچھلی بازار مسجد کانپور کا ہنگامہ ہوا۔ مسلمان ملزموں کی طرف سے مقدمہ لڑنے کانپور گئے۔

سنہ ۱۹۱۴ء اپریل۔ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں "فلسفۂ خودی" بیان کیا اور "اسرارِ خودی" کے چند اشعار سنائے۔

سنہ ۱۹۱۵ء — اسرارِ خودی شائع ہوئی۔ اسی سال والدہ محترمہ کا انتقال ہوا۔

سنہ ۱۹۱۷ء — مدینہ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا۔

سنہ ۱۹۱۸ء اپریل۔ اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ "رموزِ بے خودی" کے نام سے شائع ہوا۔

" ۸ راگست — اخبار "ستلج مسیح" کرم آباد میں ایک مقالہ بعنوان "رسول اکرمؐ فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں" لکھا۔

" ۱۵ رنومبر — جنگِ عظیم اول میں اتحادیوں کی فتح کی خوشی میں جشنِ فتح گورنر پنجاب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں نظم "اشاعِ آفتاب" پڑھی۔

سنہ ۱۹۱۹ء دسمبر — امرتسر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔

سنہ ۱۹۲۰ء اپریل۔ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں مستقل نظم کے بجائے چند چھوٹی چھوٹی نظمیں سنائیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء نومبر مسلم لیگ کے دوبارہ احیاء کی کوششوں کو تیز کرنے کے لئے نظم "صدائے لیگ" لکھی۔

سنہ ۱۹۲۲ء اپریل۔ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" پڑھی۔

" — نوابانِ کرنال کے جائیداد کے مقدمے میں ثالثی کی خدمات سرانجام دیں۔

سنہ ۱۹۲۳ء یکم جنوری۔ حکومتِ انگلستان نے "سر" کا خطاب دیا۔

یکم مئی — پیامِ مشرق شائع ہوئی۔ جو جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب کے طور پر لکھی گئی۔

سنہ ۱۹۲۴ء مارچ پیامِ مشرق کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

اپریل — انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" پڑھی۔

۱۰ رمئی — انجمن حمایت الاسلام کے صدر مقرر ہوئے۔

ستمبر — بانگِ درا شائع ہوئی۔

سنہ ۱۹۲۵ء اکتوبر — علامہ اقبال کے خلاف مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا ابو محمدؐ دیدار علی نے کفر کا فتویٰ دیا جس پر ملک بھر میں اودھم مچا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس فتویٰ کو منفی اور غلط قرار دیا۔

سنہ ۱۹۲۶ء اپریل۔ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

۲۳ر نومبر — اپنے حریف خان بہادر ملک محمد دین کو تین ہزار ووٹوں سے شکست دے کر مجلس قانون ساز پنجاب کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۲۷ء نومبر — سائمن کمیشن کی ترکیب پر افسوس کا اظہار کیا اس کا ذمہ دار ہندوستانیوں کو ٹھیرایا اور کمیشن کے بائیکاٹ کی مخالفت کی۔

— زبور عجم کی اشاعت

۱۹۲۸ء — درد گردہ میں مبتلا ہوئے اور حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے دہلی گئے۔

۲۳ر فروری۔ مجلس قانون ساز پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے مالیہ وصول کرنے کے طریقے کو غیر منصفانہ قرار دیا۔

دسمبر — مدراس کے علمی حلقوں کی دعوت پر وہاں انگریزی میں تشکیل جدید الہیات اسلامیہ پر چھ لیکچر دیئے۔

۱۹۲۹ء ۹ر جنوری۔ بنگلور میں مسلم لائبریری کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ صدارت سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم ریاست نے کی۔

۱۰ر جنوری مسیور میں مسلمانان میسور نے سپاسنامہ پیش کیا۔ بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر حاضری دی۔

۱۸ر جنوری۔ نظام کے مہمان خاص کی حیثیت سے حیدرآباد دکن پہنچے۔

جنوری — دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں مسلم لیگ کی طرف سے شریک ہوئے۔

۱۹۳۰ء ۷ر مارچ — پنجاب کی مجلس قانون ساز میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے آمدنی کو بڑھانے اور اخراجات کو کم کرنے کے لئے تجاویز پیش کیں۔ صنعتی ترقی پر زور دیا اور تعلیمی مصارف پر نکتہ چینی کی۔

۳۰ر دسمبر — آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کی اور خطبہ صدارت میں قیام پاکستان کی تجویز پیش کی۔

۱۹۳۱ء ستمبر — تیسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں شرکت۔ اس کی اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

دسمبر — فلسطین میں موتمر عالم اسلامی میں مسلمانان ہند کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت۔

۱۹۳۲ء فروری آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس عام کی صدارت کی۔

— جاوید نامہ کی اشاعت

۱۷ر اکتوبر — تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے روانگی۔

۱۵ر نومبر دارالعلوم کے تاریخی جلسہ میں برصغیر کے مسلمانوں کے مطالبات کو پیش کیا۔

۲۲ دسمبر۔ اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی میں ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقا پر تقریر اور بعد میں قصر الحمرا اور جامع قرطبہ کی سیر

— اٹلی کا سفر اور اٹلی کے آمر مسولینی سے ملاقات۔

۱۹۳۳ء اکتوبر۔ محمد نادر شاہ افغانستان کی دعوت پر کابل یونیورسٹی کے قیام اور تعلیمی نظام میں اصلاح کے لئے مشورہ دینے کے لئے کابل روانگی۔ کابل، غزنی اور دیگر تاریخی مقامات کی سیر۔

۱۹۳۴ء ۱۰ جنوری۔ خطرناک علالت کا آغاز۔

فروری۔ اسیران کشمیر کو قانونی امداد دینا۔

اکتوبر۔ جاوید منزل کی تعمیر کی ابتدا۔

۱۹۳۵ء جنوری۔ دہلی میں آپ کی زیر صدارت جامعہ ملیہ میں جلسہ ہوا جس میں مشہور ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے لکچر دیا۔

— بھوپال روانگی اور اوائل مارچ تک بغرض علاج بھوپال میں قیام۔

۲۳ مئی۔ والدہ جاوید اقبال اور منیرہ کی وفات۔ اسی ماہ سے بھوپال سے وظیفہ ملنا شروع ہوا۔

اکتوبر۔ حالی کی صد سالہ برسی میں شرکت کے لئے پانی پت روانگی۔

— بال جبریل کی اشاعت۔

۱۹۳۶ء اپریل۔ "ضرب کلیم" اور "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی اشاعت۔

انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں آخری بار شرکت۔

۳۰ مئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ صوبہ پنجاب کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۷ء — آنکھ میں موتیا بند اس قدر اتر آیا کہ لکھنا پڑھنا تک موقوف ہو گیا۔

— الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

— مسلسل بیماری کی وجہ سے انجمن حمایت الاسلام کی صدارت سے استعفیٰ۔

۱۹۳۸ء ۳ اپریل۔ آخری تحریر اور بیان کہ جناح سکندر معاہدہ منسوخ سمجھا جائے۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۲۱ اپریل۔ صبح سوا پانچ بجے، روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۲۔ تصنیفاتِ اقبال

(الف) مجموعۂ کلام (اُردو اور فارسی)

۱۔ ارمغانِ حجاز (اردو و فارسی) یہ کتاب علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ جاوید منزل لاہور سنہ ۱۹۴۸ء صفحات ۲۸۰

۲۔ اسرارِ خودی (فارسی) جاوید منزل لاہور۔ سنہ ۱۹۱۵ء صفحات ۱۵۵

۳۔ اسرار و رموز (فارسی) جاوید منزل لاہور سنہ ۱۹۴۰ء صفحات ۲۴۹

۴۔ باقیاتِ اقبال (علامہ اقبال کا غیر مطبوعہ کلام) مرتبہ سید عبدالواحد معینی مجلس اقبال کراچی سنہ ۱۹۵۲ء صفحات ۱۸۸

۵۔ باقیاتِ اقبال (غیر مطبوعہ کلام) مرتبہ عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی۔ آئینۂ ادب لاہور سنہ ۱۹۶۶ء صفحات ۵۰۴

۶۔ بالِ جبریل (اُردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سنہ ۱۹۳۵ء۔ صفحات ۲۲۴

۷۔ بانگِ درا (اُردو) شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور۔ سنہ ۱۹۲۴ء صفحات ۳۳۶

۸۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (فارسی) جاوید منزل لاہور سنہ ۱۹۳۶ء صفحات ۷۱

۹۔ مثنوی مسافر (فارسی) لاہور سنہ ۱۹۳۴ء صفحات ۴۴

۱۰۔ پیامِ مشرق (فارسی) لاہور سنہ ۱۹۲۳ء صفحات ۲۶۴

۱۱۔ جاوید نامہ (فارسی) لاہور سنہ ۱۹۳۲ء صفحات ۲۴۶

۱۲۔ رختِ سفر (غیر مطبوعہ کلام) مرتبہ محمد انور حارث، تاج کمپنی کراچی سنہ ۱۹۵۲ء صفحات ۱۴۴

۱۳۔ رموزِ بے خودی (فارسی) لاہور سنہ ۱۹۱۸ء صفحات ۱۹۴

۱۴۔ زبورِ عجم (فارسی) لاہور سنہ ۱۹۲۷ء صفحات ۲۶۴

۱۵۔ سرودِ رفتہ (غیر مطبوعہ کلام) مرتبہ غلام رسول مہر۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور سنہ ۱۹۶۳ء صفحات ۲۵۹

۱۶۔ ضربِ کلیم (اُردو) شیخ مبارک علی، لاہور سنہ ۱۹۳۶ء صفحات ۱۸۲

(ب) نثری تصانیف

۱۷۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ مترجم سید نذیر نیازی۔ بزمِ اقبال لاہور سنہ ۱۹۵۸ء صفحات ۳۰۸

یہ کتاب علامہ اقبال کے ان فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مدراس اور حیدرآباد دکن میں دیئے اور جو RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے نام سے سنہ ۱۹۳۰ء میں چھپے۔

۱۸۔ فلسفۂ عجم۔ مترجم میر حسن الدین نفیس اکیڈیمی، حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۴۶ء صفحات ۲۴۷

یہ کتاب علامہ اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ DEVELOPMENT OF MYTAPHYSICS IN PERSIA کا اُردو ترجمہ ہے۔

۱۹۔ علم الاقتصاد۔ کارخانہ پیسہ اخبار۔ لاہور ۱۹۰۳ء صفحات ۲۱۶ (یہ علم معاشیات پر اردو میں اولین کتاب ہے۔)

(ج) مکاتیب، مقالات، خطبات اور شذرات

۲۰۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ مترجم۔ ۔ ۔ عبدالرحمٰن سعید ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء صفحات ۳۲

۲۱۔ اقبال کے خطوط گرامی کے نام۔ مرتبہ عبداللہ قریشی۔ اقبال اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۶۷ء صفحات ۲۵۰

۲۲۔ اقبال کے حضور۔ مرتبہ سید نذیر نیازی۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۷۱ء صفحات ۴۸۸

۲۳۔ اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب) مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ شیخ محمد اشرف تاجران کتب لاہور ۱۹۵۱ء صفحات جلد اول ۴۹۸ جلد دوم ۴۷۴

۲۴۔ انوار اقبال (مکاتیب) مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء صفحات ۳۴۸

۲۵۔ شاد اقبال (مکاتیب) مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء صفحات ۱۷۵

۲۶۔ حرف اقبال (متفرق) ترجمہ و ترتیب لطیف احمد شیروانی۔ المنار اکادمی لاہور ۱۹۴۷ء صفحات ۲۶۴

۲۷۔ خطبات اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۴۷ء صفحات ۲۴۰

۲۸۔ گفتار اقبال (مکاتیب و بیانات) مرتبہ رفیق افضل۔ ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور ۱۹۶۹ء صفحات ۲۹۲

۲۹۔ مضامین اقبال۔ ترجمہ و ترتیب تصدق حسین تاج۔ مکتبہ ابراہیمی، حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ء صفحات ۲۰۴

۳۰۔ مکاتیب اقبال (خان محمد نیاز الدین خاں کے نام) بزم اقبال لاہور ۱۹۵۴ء صفحات ۵۵

۳۱۔ مکتوبات اقبال (سید نذیر نیازی کے نام) اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء صفحات ۳۷۲

۳۲۔ مقالات اقبال۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ شیخ اشرف تاجران کتب لاہور ۱۹۶۳ء صفحات ۲۴۸

۳۳۔ شذرات فکر اقبال۔ مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء صفحات ۱۷۲

یہ کتاب علامہ اقبال کے ملفوظات STRAY REFLECTIONS کا اردو ترجمہ ہے جو لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

(د) غیر مطبوعہ تصانیف

۳۴۔ تاریخ علم (جرمنی زبان میں) اس کتاب کے بارے میں بیگم عطیہ فیضی نے لکھا ہے کہ "اقبال نے یہ کتاب ۴ جولائی ۱۹۰۷ء کو ختم کی۔ یہ کتاب انہوں نے جرمن زبان کے امتحان کے لئے لکھی تھی۔

۳۵۔ رسالہ اجتہاد (انگریزی زبان میں) اس کتاب کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک خط میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو لکھا کہ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا مگر دوران تحریر اس کا احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسے میں نے ابتدا میں تصور کیا تھا۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں وہ مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت ہے اس مضمون

مختصر طور پر محض اشارتاً بیان کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اب میں انشاءاللہ کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا جس کا عنوان یہ ہوگا کہ ''ISLAM AS I UNDERSTAND'' مود یہ ہے کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصور کیا جائے۔ جو ممکن ہے غلط ہو۔''

۴) مجوزہ تصانیف

۲۔ دل و دماغ کی سرگزشت۔ اس کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ ''میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریک سے ان میں انقلاب پیدا ہوگا۔''

۲۔ اسلامی اصول فقہ۔ اس کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ ''میرا مقصود یہ ہے کہ زمانہ حال کے جیورس پروڈنس (JURISPRUDENCE) کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے۔ مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔''

پھر اگست ۱۹۳۶ء میں انہیں لکھا کہ انشاءاللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی۔ علامہ اقبال نے اپنی اس کتاب کا نام ''INTRODUCTION TO THE STUDY OF ISLAM'' رکھا تھا لیکن بعد میں بینائی کی کمزوری کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

۳۔ حواشی قرآن کریم۔ علامہ اقبال نے یہ کام انگریزی میں کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی اس کتاب کا نام ''INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN'' تجویز کیا تھا۔ محترم عبدالرشید طارق نے اپنے ایک مضمون میں علامہ اقبال کی زبانی لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کروں گا۔ چاہتا ہوں کہ کوئی پڑھا لکھا، وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضل دیوبند میسر آجائے۔ مجھے حوالہ جات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے۔ انگریزی سے واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے۔ میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ ایک بار کتاب شروع کی تو ان شاءاللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام THEORIES کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتابیں بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر خریدوں۔ یہ اب میرے کس مطلب کی۔'' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ ارادہ بھی بے سروسامانی اور بصارت کی کمزوری کی وجہ سے ترک کر دیا۔

۴۔ راماین کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب کے بارے میں علامہ اقبال نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھا کہ ''میرا ارادہ اردو میں راماین کو لکھنے کا ہے۔ مسیحی جہانگیری نے راماین کے قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ افسوس تھی کہ وہ مثنوی

کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ اگر سرکار کے کتب خانے میں ہو تو کیا چند روز کے لئے عاریتاً مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا تتبع نا بہتر ہوگا۔"

۴۰۔ تصوف کی تاریخ۔ اس مجوزہ کتاب کے بارے میں جنوری ۱۹۱۶ء میں اکبر الہ آبادی کو لکھا کہ "علامہ ابن جوزی نے جو کچھ تصوف پر لکھا ہے اس کو شائع کرنے کا قصد ہے۔ اس کے ساتھ تصوف کی تاریخ پر ایک مفصل دیباچہ لکھوں گا۔ انشاء اللہ۔ اس کا مصالحہ جمع کر لیا ہے۔ منصور حلاج کا رسالہ "طواسین" فرانس میں نہایت مفید حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ دیباچہ میں اس کو استعمال کروں گا۔"

۴۱۔ ایک فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب۔ اس مجوزہ کتاب کے بارے میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم لکھتے ہیں کہ "اقبال اپنی وفات سے ایک ماہ بیشتر انگریزی میں ایک نظم شعر منشور لکھنا چاہتے تھے، جو اگر مکمل ہوتی تو ایک بین الاقوامی چیز ہوتی اگرچہ ان کا کوئی بڑا شاہکار نہ سہی" علامہ اقبال اپنی اس مجوزہ کتاب کا نام THE BOOK OF A FORGOTTEN PROPHET رکھنا چاہتے تھے اور وہ انجیل مقدس کے عہد عتیق اور "صحیفے کی کتاب" بقول زردشت کے ادبی اسالیب پر ہوتی۔

۴۲۔ اُردو نظموں کا مجموعہ۔ علامہ اقبال اپنی چیدہ چیدہ نظموں کا ایک الگ انتخاب بھی مجموعے کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

(و) علامہ اقبال اور درسی کتب

۴۳۔ اُردو کورس۔ چھٹی جماعت کے لئے۔ بہ اشتراک حکیم احمد شجاع۔ گلاب چند کپور تاجران کتب لاہور

۴۴۔ اُردو کورس۔ ساتویں جماعت کے لئے۔ بہ اشتراک حکیم احمد شجاع۔ گلاب چند کپور تاجران کتب لاہور ۱۹۲۴ء صفحات ۲۱۶

۴۵۔ اُردو کورس۔ آٹھویں جماعت کے لئے۔ بہ اشتراک حکیم احمد شجاع۔ گلاب چند کپور تاجران کتب لاہور ۱۹۳۰ء

۴۶۔ انتخاب از نکاتِ بیدل۔ برائے جدید بی اے کورس فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۲۲ء

۴۷۔ آئینۂ عجم۔ میٹرک کے طلباء کے فارسی نظم و نثر کی ٹیکسٹ بک۔ لاہور ۱۹۳۳ء صفحات ۱۶۴

۴۸۔ تاریخ ہند۔ بہ اشتراک لالہ رام پرشاد۔ اس کا خلاصہ امرتسر سے ۱۹۱۳ء میں "اقبالِ ہند" کے نام سے شائع ہوا۔

۳۔ علامہ اقبال پر منتخب رسائل کے نمبر

۴۹۔ ادبی دنیا	لاہور	ماہنامہ	مدیر	محمد عبداللہ قریشی	اپریل ۱۹۶۷ء	صفحات ۳۶۴
۵۰۔ ادبی دنیا	لاہور	ماہنامہ	مدیر	محمد عبداللہ قریشی	اپریل مئی ۱۹۷۶ء	صفحات ۸۸

۵۱۔ ادبی دنیا لاہور ماہنامہ مدیر محمدؐ عبداللہ قریشی اپریل مئی سنہ ۱۹۶۱ء صفحات ۶۴

۵۲۔ ادبی دنیا لاہور ماہنامہ مدیر محمدؐ عبداللہ قریشی اپریل مئی سنہ ۱۹۶۲ء صفحات ۱۴۴

۵۳۔ اذانِ حق میانوالی ہفت روزہ مدیر خان زمان خاں ۲۱/ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء صفحات ۱۲

۵۴۔ اُردو دہلی سہ ماہی مدیر مولوی عبدالحق اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء صفحات ۳۷۶

۵۵۔ امروز لاہور روزنامہ مدیر احمد ندیم قاسمی ۲۲/ اپریل سنہ ۱۹۵۳ء صفحات ۱۲

۵۶۔ آفاق لاہور روزنامہ مدیر ——— ۲۱/ اپریل سنہ ۱۹۵۲ء صفحات ———

۵۷۔ بصیرت لاہور ہفت روزہ مدیر ——— ۲۳/ اپریل سنہ ۱۹۵۲ء صفحات ۹۶

۵۸۔ پیغامِ حق لاہور ماہنامہ مدیر سید محمدؐ شاہ جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۳۶ء صفحات ۲۹۸

۵۹۔ جوہر دہلی ماہنامہ مدیر سید محمد حسین سنہ ۱۹۳۸ء صفحات ۲۲۶

۶۰۔ چٹان لاہور ہفت روزہ مدیر شورش کاشمیری ۱۶/ اپریل سنہ ۱۹۵۹ء صفحات ۱۳۸

۶۱۔ راوی لاہور مجلہ گورنمنٹ کالج لاہور مئی جون سنہ ۱۹۳۶ء صفحات ———

۶۲۔ سب رس حیدرآباد دکن ماہنامہ مدیر میر محمدؐ علی میکش جون سنہ ۱۹۳۸ء صفحات ۱۶۸

۶۳۔ ستلج لاہور ہفت روزہ مدیر ——— ۱۴/ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء صفحات ———

۶۴۔ سیارہ لاہور ماہنامہ مدیر نعیم صدیقی مئی سنہ ۱۹۶۳ء صفحات ۲۴۲

۶۵۔ شیرازہ لاہور ہفت روزہ مدیر چراغ حسن حسرت جلد ۲ شمارہ ۱۷ سنہ ۱۹۳۹ء صفحات ۱۵۱

۶۶۔ صحیفہ لاہور سہ ماہی مدیر اعزازی ڈاکٹر وحید قریشی حصہ اول اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء صفحے ۱۶۴ حصہ دوم جنوری سنہ ۱۹۵۸ء

۶۷۔ علی گڑھ میگزین علی گڑھ ماہنامہ مدیر ——— اپریل سنہ ۱۹۳۸ء صفحات ———

۶۸۔ علی گڑھ اُردو میگزین علی گڑھ مجلہ مدیر ——— اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء صفحات ———

۶۹۔ قندیل لاہور ہفت روزہ مدیر شیر محمدؐ اختر اپریل سنہ ۱۹۶۹ء صفحات ۲۴

۷۰۔ لالۂ صحرا ملتان مجلہ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین۔ مدیرہ ناہید نصرت سنہ ۱۹۶۵ء صفحات ۴۲

۷۱۔ ماہِ نو کراچی ماہنامہ مدیر فضل قدیر اپریل سنہ ۱۹۶۷ء صفحات ۶۶

۷۲۔ محمل لاہور مجلہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین نومبر سنہ ۱۹۴۲ء صفحات ———

۷۳۔ نخلستانِ ادب بہاولپور مجلہ صادق ایجرٹن کالج مدیر پروفیسر ناموس سنہ ۱۹۶۱ء صفحات ———

۷۴۔ نگارِ پاکستان کراچی ماہنامہ مدیر عارف نیازی جنوری سنہ ۱۹۶۲ء صفحات ۱۴۴

۷۵۔ نویدِ صبح سرگودھا مجلہ گورنمنٹ کالج مدیر پروفیسر رازی اپریل سنہ ۱۹۵۹ء صفحات حصہ اردو ۷۸

۷۶۔ نیرنگ خیال لاہور ماہنامہ مرتبہ بدر الدین حسن اور حکیم یوسف حسین نمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحات ۲۸۴

۷۷۔ وفاق لائل پور روزنامہ مدیر مصطفیٰ صادق ۲۱ر اپریل ۱۹۶۶ء صفحات ۴۲

۷۸۔ ہمایوں لاہور ماہنامہ مدیر بشیر احمد اپریل ۱۹۵۲ء صفحات —

۴۔ علامہ اقبال پر منتخب مقالات کے مجموعے

۷۹۔ اقبال مرتبہ مولوی عبد الحق انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۸ء صفحات ۳۷۴

۸۰۔ اقبال ایرانیوں کی نظر میں مرتبہ خواجہ عبد الحمید عرفانی اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء صفحات ۳۷۷

۸۱۔ اقبال با کمال مرتبہ سید اصغر شاہ جعفری تاج بک ڈپو لاہور ۱۹۶۶ء صفحات ۶۶۸

۸۲۔ اقبال پر ایک نظر مرتبہ سید محمد شاہ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۴ء صفحات ۲۴۰

۸۳۔ اقبال پیامبر انقلاب مرتبہ شورش کاشمیری فیروز سنز لاہور ۱۹۶۸ء صفحات ۱۹۴

۸۴۔ اقبال خواتین کی نظر میں مرتبہ یکتا امروہوی مکتبہ شاہراہ دہلی ۱۹۴۷ء صفحات ۲۶۰

۸۵۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ مرتبہ پروفیسر نیازی عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۵ء صفحات ۳۶۰

۸۶۔ اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت نوبہار بک ڈپو لاہور ۱۹۴۵ء صفحات ۱۵۱

۸۷۔ آثار اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء صفحات ۳۲۰

۸۸۔ بزم اقبال مرتبہ طاہر فاروقی بزم اقبال آگرہ ۱۹۴۴ء صفحات ۲۷۲

۸۹۔ یاد اقبال مرتبہ عبد اللہ جاوید مجلس اقبال خیر پور — صفحات ۵۲

۹۰۔ تقاریر یوم اقبال مرتبہ —— بزم اقبال لاہور ۱۹۵۲ء صفحات ۵۴

۹۱۔ جوہر اقبال مرتبہ سید محمد حسین جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۳۸ء صفحات ۲۲۶

۹۲۔ حکمت اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء صفحات ۳۳۶

۹۳۔ خیابان اقبال مرتبہ طاہر فاروقی یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ۱۹۶۶ء صفحات ۳۶۸

۹۴۔ فکر اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۵۴ء صفحات ۳۲۰

۹۵۔ فلسفۂ اقبال مرتبہ —— بزم اقبال لاہور ۱۹۷۱ء صفحات ۳۸۴

۹۶۔ مطالعۂ اقبال مرتبہ گوہر نوشاہی بزم اقبال لاہور ۱۹۷۱ء صفحات ۴۴۴

۹۷۔ مطالعات اقبال مرتبہ اسلم ملک اردو ادب اکیڈمی لاہور ۱۹۶۹ء صفحات ۱۹۲

۹۸۔ مقالات یوم اقبال مرتبہ —— مرکزی مجلس اقبال لاہور ۱۹۴۴ء صفحات ۵۶

۹۹۔	مقالاتِ یوم اقبال	مرتبہ	——	مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ	لاہور	۱۹۶۶ء	صفحات ۸۴
۱۰۰۔	مقالات یوم اقبال	مرتبہ	آل احمد سرور	رضا کالج	رامپور	۱۹۴۵ء	صفحات ۹۶
۱۰۱۔	مقالات یوم اقبال	مرتبہ	انٹر کالیجیٹ برادرہڈ		لاہور	۱۹۴۲ء	صفحات ۲۲۴
۱۰۲۔	مقالات یوم اقبال	مرتبہ	انٹر کالیجیٹ برادرہڈ		رامپور	۱۹۴۸ء	صفحات ۱۶۰
۱۰۳۔	مقالات یوم اقبال	مرتبہ	——	قومی کتب خانہ	لاہور	۱۹۴۸ء	صفحات ۱۰۷
۱۰۴۔	مقالات یوم اقبال ۱۹۶۶ء	مرتبہ	یعقوب توفیق	مجلس اقبال	کراچی	۱۹۶۷ء	صفحات ۸۰
۱۰۵۔	مقالات یوم اقبال ۱۹۶۷ء	مرتبہ	یعقوب توفیق	مجلس اقبال	کراچی	۱۹۶۸ء	حصہ اردو صفحات ۳۴
۱۰۶۔	ملفوظاتِ اقبال	مرتبہ	محمود نظامی	اشاعت منزل	لاہور	۱۹۴۹ء	صفحات ۲۳۹
۱۰۷۔	منشوراتِ اقبال		(ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ)	بزم اقبال	لاہور	۱۹۵۶ء	صفحات ۹۲
۱۰۸۔	یادگارِ اقبال	مرتبہ	سید محمد طفیل بدر امروہوی	آزاد بک ڈپو	لاہور	۱۹۴۵ء	صفحات ۱۹۲

۵۔ منتخب اقبالیات

۱۰۹۔	اسلامی تصوف اور اقبال	ڈاکٹر ابو سعید نور الدین	اقبال اکیڈمی	کراچی	۱۹۵۷ء	صفحات ۳۸۱
۱۱۰۔	اسرار و رموز پر ایک نظر	پروفیسر محمد عثمان	اقبال اکیڈمی	کراچی	۱۹۶۲ء	صفحات ۱۹۰
۱۱۱۔	اشاراتِ اقبال	عبد الرحمن طارق	کتاب منزل	لاہور	۱۹۵۱ء	صفحات ۲۱۵
۱۱۲۔	اطرافِ اقبال	ملک حسن اختر	مکتبہ میری لائبریری	لاہور	۱۹۷۳ء	صفحات ۳۶۴
۱۱۳۔	اقبال	عبد السلام خورشید	قومی کتب خانہ	لاہور	۱۹۵۰ء	صفحات ۱۲۵
۱۱۴۔	اقبال از عطیہ بیگم	مترجم ضیاء الدین احمد برنی	اقبال اکیڈمی	کراچی	۱۹۵۶ء	صفحات ۱۰۴
۱۱۵۔	اقبال	مجنوں گورکھپوری	ایوان اشاعت	گورکھپور	۱۹۴۵ء	صفحات ۱۰۸
۱۱۶۔	اقبال اپنے آئینہ میں	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل	لاہور	۱۹۵۷ء	صفحات ۴۸
۱۱۷۔	اقبال اس کی شاعری اور پیغام	شیخ اکبر علی	کمال پبلشرز	لاہور	۱۹۳۶ء	صفحات ۲۲۴
۱۱۸۔	اقبال ۔ امام ادب	رئیس احمد جعفری	تاج بک ڈپو	بمبئی	۱۹۴۵ء	صفحات ۹۶
۱۱۹۔	اقبال اور احیائے دین	خالد علوی	مکتبہ العلمیہ	لاہور	۱۹۷۱ء	صفحات ۹۲
۱۲۰۔	اقبال اور اس کا پیغام	تصدق حسین خالد اور رفیق خاور	بزم اقبال	لاہور	۱۹۳۶ء	صفحات ۶۶

۱۲۱۔	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	ادارہ انیس اردو	لکھنؤ ۱۹۶۱ء صفحات ۱۳۶
۱۲۲۔	اقبال اور آرٹ	لطیف فاروقی	بزم اقبال	لاہور ۱۹۴۳ء صفحات ۲۴۰
۱۲۳۔	اقبال اور بھوپال	صہبا لکھنوی	اقبال اکیڈمی	کراچی ۱۹۷۳ء صفحات ۳۱۲
۱۲۴۔	اقبال اور پیغام حریت	یوسف سلیم چشتی	اقبال اکیڈمی	لاہور ۱۹۴۴ء صفحات ۷۰
۱۲۵۔	اقبال اور تحریک پاکستان	عاشق حسین بٹالوی	پنجاب یونیورسٹی پریس	لاہور ۱۹۶۶ء صفحات ۷۸
۱۲۶۔	اقبال اور تصوف	پروفیسر محمد فرمان	بزم اقبال	لاہور ۱۹۵۸ء صفحات ۱۴۲
۱۲۷۔	اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	اقبال اکیڈمی	کراچی ۱۹۶۳ء صفحات ۵۰۲
۱۲۸۔	اقبال اور جمہوریت	محبوب علی رضوی	کتاب محل	لاہور ۱۹۶۸ء صفحات ۲۶۲
۱۲۹۔	اقبال اور حیدر آباد دکن	نظر حیدر آبادی	اقبال اکیڈمی	کراچی ۱۹۶۱ء صفحات ۲۳۴
۱۳۰۔	اقبال اور سیاست ملی	رئیس احمد جعفری	اقبال اکیڈمی	کراچی ۱۹۶۱ء صفحات ۴۹۹
۱۳۱۔	اقبال اور سوشلزم	محمد حنیف رامے	البیان	لاہور ۱۹۷۰ء صفحات ۲۰۶
۱۳۲۔	اقبال اور شاہان اسلام	شیخ عطاء اللہ	اسلامیہ کالج چنیوٹ	۱۹۵۸ء صفحات ۵۵
۱۳۳۔	اقبال اور عشق رسول	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل	لاہور ۱۹۵۶ء صفحات ۴۰۰
۱۳۴۔	اقبال اور عورت	رحمت فرخ آبادی	ماہنامہ بک ڈپو	سکھر ۱۹۶۳ء صفحات ۶۴
۱۳۵۔	اقبال اور قرآن	ابو محمد مصلح	ادارہ عالمگیر تحریک قرآن	لاہور ۱۹۶۶ء صفحات ۱۹۱
۱۳۶۔	اقبال اور قرآن	ڈاکٹر عارف بٹالوی	کتاب لمیٹڈ	کراچی ۱۹۵۰ء صفحات ۱۶۴
۱۳۷۔	اقبال اور گوئٹے	محمد اشرف	اشاعت منزل	لاہور ۱۹۴۹ء صفحات ۱۰۵
۱۳۸۔	اقبال پر ایک نظر	احمد الدین بی اے	—	لاہور ۱۹۲۶ء صفحات ۲۸۴
۱۳۹۔	اقبال درون خانہ	خالد نظیر صوفی	بزم اقبال	لاہور ۱۹۷۱ء صفحات ۱۹۶
۱۴۰۔	اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	تصنیفات	لاہور ۱۹۶۸ء صفحات ۳۲۸
۱۴۱۔	اقبال کامل	عبدالسلام ندوی	دار المصنفین	اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء صفحات ۴۰۰
۱۴۲۔	اقبال کا تصور خودی	ڈاکٹر غلام عمر خاں	ادارہ ادبیات اردو	حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء صفحات ۱۰۴
۱۴۳۔	اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	مجلس ترقی ادب	لاہور ۱۹۷۳ء صفحات ۲۵۴
۱۴۴۔	اقبال کا تصور عشق	ڈاکٹر غلام عمر خاں	ادارہ ادبیات اردو	حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء صفحات ۱۰۴
۱۴۵۔	اقبال کا سیاسی کارنامہ	محمد احمد صدیقی	کاروان ادب	کراچی ۱۹۵۲ء صفحات ۵۳۳

۱۴۶۔ اقبال کا علم الکلام	علی عباس حسینی جلال پوری	کتاب نما	لاہور	۱۹۷۱ء	صفحات ۲۷۸
۱۴۷۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم	محمد احمد صدیقی	کراچی بک ایجنسی	کراچی	۱۹۶۰ء	صفحات ۷۲
۱۴۸۔ اقبال کا فلسفۂ خودی	پروفیسر محمد عثمان	مکتبۂ جدید	لاہور	۱۹۷۱ء	صفحات ۲۰۰
۱۴۹۔ اقبال کا مطالعہ	سید نذیر نیازی	کتاب خانہ پنجاب	لاہور	۱۹۷۱ء	صفحات ۱۶۳
۱۵۰۔ اقبال کا نظریۂ اخلاق	سعید احمد رفیق	ادارہ ثقافت اسلامیہ	لاہور	۱۹۶۰ء	صفحات ۲۱۴
۱۵۱۔ اقبال کی پیشین گوئیاں	ڈاکٹر محمد یامین ہاشمی	کتاب منزل	لاہور	۱۹۵۱ء	صفحات ۱۹۲
۱۵۲۔ اقبال کی شاعری	عبدالمالک آروی	ادارہ طاقِ نسیان	آرہ بہار	۱۹۴۰ء	صفحات ۱۱۰
۱۵۳۔ اقبال کی کہانی	ڈاکٹر ظہیر الدین احمد	ادارہ اشاعت اردو	حیدرآباد دکن	۱۹۵۲ء	صفحات ۱۳۲
۱۵۴۔ اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	اقبال اکیڈمی	کراچی	۱۹۵۹ء	صفحات ۶۸۰
۱۵۵۔ اقبال کے تعلیمی نظریات	محمد احمد صدیقی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	کراچی	۱۹۶۵ء	صفحات ۳۶۰
۱۵۶۔ اقبال کے چند جواہر ریزے	عبدالحمید عرفانی	بزم اقبال	لاہور	۱۹۷۲ء	صفحات ۵۶
۱۵۷۔ اقبال کے دس شعر	صلاح الدین احمد	اردو اکاڈمی پنجاب	لاہور	۱۹۵۸ء	صفحات ۴۶
۱۵۸۔ اقبال کے صنائع بدائع	نذیر احمد	آئینۂ ادب	لاہور	۱۹۶۶ء	صفحات ۱۷۶
۱۵۹۔ اقبال کے کلام میں تخلیقی فعالیت	محمد ضیاء الاسلام	اقبال اکیڈمی	کراچی	۱۹۶۷ء	صفحات ۱۱۰
۱۶۰۔ اقبال قرآن کی روشنی میں	محمد ظریف	کتاب منزل	لاہور	۱۹۵۸ء	صفحات ۳۶۸
۱۶۱۔ اقبال گہوارۂ تربیت میں	فقیر حسین ساحر	عظیم پبلشنگ ہاؤس	پشاور	۱۹۶۴ء	صفحات ۱۱۲
۱۶۲۔ اقبال نئی تشکیل	عزیز احمد	کتاب خانہ تاج آفس	کراچی	۱۹۴۸ء	صفحات ۴۹۵
۱۶۳۔ پیامِ اقبال	عبدالرحمن طارق	اقبال اکیڈمی	لاہور	۱۹۴۵ء	صفحات ۲۵۶
۱۶۴۔ تصوراتِ اقبال	شغل فخری	نفیس اکیڈمی	حیدرآباد دکن	۱۹۴۵ء	صفحات ۳۵۱
۱۶۵۔ تصوراتِ اقبال	صلاح الدین احمد	ادبی دنیا	لاہور	۱۹۶۵ء	صفحات ۳۹۶
۱۶۶۔ تعلیماتِ اقبال	یوسف سلیم چشتی	اقبال اکیڈمی	لاہور	۱۹۴۵ء	صفحات ۱۳۵
۱۶۷۔ تلمیحاتِ اقبال	فضل الٰہی عارف	مکتبہ شعر و ادب	لاہور	ـــــ	صفحات ۲۶۰
۱۶۸۔ تلمیحاتِ اقبال	عابد علی عابد	بزم اقبال	لاہور	۱۹۶۰ء	صفحات ۵۶۶
۱۶۹۔ ٹیگور اور اقبال	عارف بٹالوی	اشاعت منزل	لاہور	۱۹۵۱ء	صفحات ۱۷۲
۱۷۰۔ جہانِ اقبال	عبدالرحمن طارق	اشاعت منزل	لاہور	۱۹۴۷ء	صفحات ۶۰۰

اقبال کے کلام میں تخلیقی فعالیت

از محمد ضیاء الاسلام مرحوم

دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (حضرت گرامی)

اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی دماغی نشوونما آہستہ آہستہ کئی منازل سے گذری۔

اولاً ان کی وہ نظمیں ہیں جو شعار عام کے مطابق لکھی گئیں، اگرچہ ان میں بھی ان کا ایک مخصوص رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ہمالیہ پر ان کی نظم میں یہ شعر ملتا ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

پھر وہ غزل میں اپنی شوخیٔ طبع کے موتی پرونے لگے۔ اس وقت جناب داغ دہلوی کا سکہ اقلیم سخن میں جاری تھا۔ وہ حیدر آباد میں بطور استاد اعلیحضرت نظام دکن مقیم تھے۔ اقبال نے خود کہا:-

مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں کا

داغ کے رنگ میں کہتے ہیں۔؎

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

اس کے بعد اکبر الہ آبادی اور ان کے کلام سے اقبال متاثر رہے۔ اس رنگ میں بھی انہوں

نے کافی سخن سنجی کی مثلاً

مشرق کے مکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اور

مرد میدان گاندھی درویش خو
اور کونسل کے سپیکر مالوی
اتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی
دیکھئے کب ہوتے ہیں سر مالوی

لیکن یہ رنگ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا۔ اس سلسلے میں یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ کافی عرصہ بعد لندن ٹائمز کے ایڈیٹر کے مشورہ پر وائسرائے نے اقبال کو نائٹ ہڈ کا اعزاز دلوایا تو کسی نے یہ شوخ اشعار اس موقع پر لکھے جو بہت جلد زبان زدِ خاص و عام ہو گئے

اب تک تو سر ملت کے بیضا کے وہ تھے تاج
سنتے ہیں کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی کہتا تھا یہ گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

۱۹۲۷ء میں اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ لیکن اس وقت کے صاحب اثر حضرات مثلاً سر محمد شفیع اور میاں سر فضل حسین جو مسلمانانِ پنجاب کے نمائندہ تصور کئے جاتے تھے انہوں نے زور نہیں دیا کہ ان کو وزیر بنا دیا جائے۔ اس کے بعد بھی وہ مسلمان جو صوبائی اور مرکزی ... گورنمنٹ میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ انہوں نے اقبال کو کسی ایسی جگہ دلوانے کی کوشش نہیں کی جو ان کے شایانِ شان ہوتی۔ سر عبدالقادر ان کے بہی خواہ اور مداح تھے لیکن باوجودیکہ وہ انڈیا کونسل کے ممبر رہے انہوں نے بھی کوئی عملی قدم اس طرف نہیں اٹھایا۔ سر ذوالفقار علی خاں جنہوں نے VOICE FROM THE EAST اقبال پر شائع کی۔ شاید اتنا اثر نہیں رکھتے تھے کہ اس معاملے میں کوئی اقدام کر سکتے یہ امر قرین قیاس ہے کہ اگر اقبال اس وقت گورنمنٹ میں پہونچ جاتے تو ایسی پالیسی برتتے کار آتی جو مسلم کے لئے زیادہ خوش آئند ہوتی۔

۱۹۳۰ء میں اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کے صدر منتخب ہوئے اور وہاں انہوں نے

شمالی مغربی ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کا خاکہ پیش کیا۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے لندن گول میز کانفرنس میں مع دیگر مسلم مندوبین حصہ لیا۔ لیکن اس کے بعد وہ انگریزوں کی سیاست عملی سے کچھ ایسے بیزار ہوئے کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی بہت کم کر دی۔ البتہ ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۷ء میں پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے خلاف انہوں نے قائد اعظم کو خطوط بھیجے۔ ان دنوں قائد اعظم جب لاہور آئے تو مسٹر جناح اردو اقبال سے ملنے اور تبادلہ خیالات کرنے ان کے میو روڈ (جو اب علامہ اقبال روڈ کے نام سے موسوم ہے) کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اقبال کے اس دور کے خیالات کا عکس اس شعر میں ملتا ہے۔

گفتند جہاں ما آیا تو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اقبال جغرافیائی حب وطن کے علاوہ قومی اتحاد پر بہت پر سوز نظمیں لکھ چکے تھے۔ مثلاً "شعاعِ امید" جس میں یہ شعر آتا ہے۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

ہندوستان کے مشاہیر پر بھی اظہارِ خیال کر چکے تھے۔ مثلاً سوامی رام تیرتھ والی نظم میں انہوں نے ایک وجدانی کیفیت میں کہا۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اب ان کے ذہن کی نشوونما اسلامی بین الاقوامیت اور اسلامی تمدنی قدروں پر مرکوز ہو رہی تھی۔ ان کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ انہیں ملت کو ایک بین پیغام دینے کے لئے دنیائے وجود میں لایا گیا ہے فرماتے ہیں۔

من شکوہ خسروی اور ادھم
تختِ کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن
آب و رنگِ شاعری خواہد زمن

ان مراحل سے گذرنے کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اور لکھا وہ ایک الہامی حقیقت رکھتا ہے۔ اس کو صرف شاعری خیال کرنا غلطی ہوگی۔ اور اقبال کے وجود کا انکار نیز ان کے پیغام سے انحراف کے مترادف ہوگا۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ان کے کلام میں ان کے پیغام کو تلاش کریں۔ شعر صرف خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ایک اسلوب ہے، ایک پیرہن ہے، روح نہیں، اس کی روح ہم کو تلاش کرنی ہے۔

کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جو مسلم تحریک ہندوستان میں شروع ہوئی اور پروان چڑھی اور جس کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا وہ ایسی پہلی تحریک تھی جس کے زیر اثر ملتِ اسلامیہ نے اپنے مستقبل کو مسلمان مفکروں، ادیبوں، شاعروں، ایڈیٹروں اور سیاستِ ملکی و ملی کے علم برداروں کے ہاتھ میں سونپا۔ اس سے قبل ۱۸۵۷ء میں اس وقت کے حالات کے ماتحت مسلمانوں نے یہ کارِ عظیم ان کے سپرد کیا تھا جو فرنگی راج کو ہندوستان میں قائم ہونے کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کو ہر صورت گزند سے بچانا چاہتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی تدابیر کارگر نہ ہوئیں اور مسلمان اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھے جس کے بعد ہندوستان میں انگریزی سلطنت قائم ہوئی .... اور ملک ۱۹۴۷ء تک یعنی تقریباً ۹۰ سال تک غیر قوم کے زیر نگیں رہا۔
یاد رہے کہ انگریز ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ ریشہ دوانیوں سے اور پھر زورِ شمشیر سے انہوں نے ہندوستان کی آزادی پر ڈاکہ ڈالا اور مال خام لینے اور اپنی مصنوعات کی منڈیاں قائم کرنے کے لئے ہندوستان کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں پر بے انتہا مظالم روا رکھے۔ جن کی تاریخ شاہد ہے۔ اور جس کا تذکرہ باعثِ اتلافِ وقت ہوگا۔ لیکن یہ کلیہ شدت سے سامنے آتا ہے کہ تاریخ کے اس انقلاب کی بنا در اصل اقتصادی تھی۔ صرف سیاسی نہیں۔ اگرچہ اس نے بعد میں شدید سیاسی شکل اختیار کر لی۔ کیونکہ ان دونوں میں کوئی حدِ فاصل قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ دورِ حاضر میں سیاسی آزادی قوموں سے بزور فوجی طاقت ہی نہیں چھینی جا سکتی۔ بلکہ ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے جس سے بظاہر سیاسی اقتدارِ اعلیٰ NATIONAL SOVEREIGNTY کی حیثیت تو قائم رہے۔ لیکن اقتصادی آزادی کا فقدان ہو۔ ایک باعزت قوم کو اپنی سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی آزادی بھی برقرار رکھنی ہوتی ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اقبال اقتصادیات کو قومی زندگی میں کیا درجہ دیتے ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات میں ۱۹۳۷ء سے دوسرے طریقے اختیار کئے گئے۔ اس مرتبہ قوم کی باگ دوڑ ان حضرات کے سپرد کی گئی جو صاحبِ قلم تھے۔ صاحبِ فکر و عمل تھے، صاحبِ دیہیم و زر نہ تھے۔ ان کے پاس توپ و تفنگ بھی نہ تھے۔ البتہ وہ حریت کے نشہ سے سرشار تھے اور ملت کا درد ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ ان کی کوششوں سے یہ محل جس کو پاکستان کہتے ہیں، وجود میں آیا۔ اس ملک کی بہتری اور برتری اور اسلامی قدروں

کے احیاء اور تجدید میں مضمر ہے۔ جو ملتِ اسلامیہ سے بالتشریح یا بلاتشریح اس دوران میں کئے گئے جس کی بناء پر ملتِ اسلامیہ ایک مردِ آہن کی طرح یک دل و یک زبان ہو کر اس سیاسی معرکہ میں کود پڑی۔ جو مشکلات اس مہم میں پیش آئیں جو قربانیاں ملتِ اسلامیہ کو اس مہم میں دینی پڑیں ان کی یاد آہستہ آہستہ ذہنوں سے مٹتی جارہی ہے۔ تاریخ کا کارواں سرعت کے ساتھ مصروفِ سفر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیچھے مڑکر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ لیکن جو قوم اپنا ملی سیاسی، اقتصادی زندگی کی تاریخ محفوظ نہیں کرسکتی اس کو یہ خطرہ درپیش رہتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس منبع و سرچشمہ سے دور ہوجائیں جو اُن کے قیام کا باعث ہوئے۔ اگر قوم اپنی خودی کو نہیں پہنچانتی تو اس کی حفاظت کیا کرسکتی ہے۔ اگر قوم اپنی یکتائی اور اپنی خودی سے خود ہی واقف نہیں تو پھر تمام قدریں خواہ وہ مذہب سے متعلق ہوں یا معاشرہ سے آسانی سے تبدیل ہوسکتی ہیں۔ اور ملت اپنے نقطہ سے ہٹ کر دوسری قدروں کو اختیار کرسکتی ہے۔ اس طرح سیاسیات اور حیاتیات میں عظیم انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ جو اقبال جیسے شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کرسے کہ

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نہ تواں کرد درو

ہمارے صاحبِ فکر و علم حضرات کو یہ سوچنا ہے کہ آیا انہوں نے ملتِ اسلامیہ سے جو وعدے کئے تھے۔ وہ ان میں پورے اترے ہیں۔ یا نہیں۔ یہ محاسبہ ہر فرد بھی اپنی اپنی جگہ کرسکتا ہے۔ اگر یہ خاموش محاسبہ ایک طرف فرد اور اس کے ضمیر میں اور دوسری طرف فرد اور ملت میں نہ ہوسکا تو اقبال کا یہ شعر ہم پر صادق آئے گا۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ایک صاحب نے اقبال پر یہ اعتراض کیا تھا کہ

جہاں غریب کو نانِ جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے سرِّ خودی کو کیا کیجئے

اس کے جواب میں میرا معروضہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنے پیام سے ہم کو وہ راہ دکھلائی ہے جس پر گامزن ہوکر قوم پیداوار کے ذرائع اور سرچشمہ کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ اور نانِ جویں کے مسئلہ کا حل بلا نشترِ تیموری و چنگیزی کرسکتی ہے۔

جہاں میں میرا اگر جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

ہم پر یہ لازم ہے کہ اقبالؔ کے کلام کا جو حیاتیات کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیری کرتا ہے بغور مطالعہ کریں۔ ان کے بنیادی فلسفہ کو روزمرہ زندگی کی قدروں پر رکھیں۔ عہدِ حاضر میں اس ہی میں قوموں کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ اس ہی تیغِ تفکر کے متعلق اقبالؔ نے کہا تھا

برقِ سوزاں تیغ بے زنہار او
دشت و در لرزندہ از یلغار او

یہی وہ منزل ہے جس میں ہر فرد تیغِ تفکر سے وہی کردار ادا کر سکتا ہے جو سلطان محمود نے زندگی کی دوسری نہج پر ادا کیا تھا۔ یہ وہ فکر ہے جس کی طرف اقبالؔ نے یوں اشارہ کیا ہے۔

فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود

میرا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے جو باوجودیکہ ملک و ملت کی عظمت کی نئی راہیں نکال سکتے تھے۔ صرف اس لئے ناکام رہے کہ

سینہ اورا دمے دیگر نبود
در ضمیرش عالمِ دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت
مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

میرا اشارہ اس روحِ حیات کی طرف ہے جس کا تذکرہ "بالِ جبریل" کے ساقی نامہ میں ہے۔

رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اقبالؔ کے نظریۂ اقتصادیات، معیشتِ ملی اور کسبِ زر کے سبب زمین کو جذب و محبت کی آنچ دیجئے۔ اس سے جو جوہر پیدا ہوا اس کو اکسیرِ اعظم سمجھئے اور اس کے استعمال کے نتائج کا انتظار کیجئے۔

سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبین

یہ صورت قوموں کو آتشِ سیال میں ڈال کر کندن بنانے کے مترادف ہے۔ اس کیفیت پر پہنچ کر قومیں ملت کی وحدت میں گم ہو جاتی ہیں اور پھر عالمگیر اخوت کی آغوش میں نمو پاتی ہیں اقبالؔ نے اگر پاکستان کا خواب دیکھا اور دکھلایا۔ اگر انہوں نے ایک سیاسی مستقبل کی طرف اپنے سارے بخن سے ناقابلِ نام و سوئے قطار کھینچی تو ان کے پرستار

کی حیثیت سے ہم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ بے عملی اور سکون پرستی سے "معدومیت کی دارفتگی" تو پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن حرکت و اجتہاد کی حقیقی روشنی سے قومیں محروم رہتی ہیں۔ انسان آفرینش کی مرکزی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ چونکہ بغیر حرکت و اجتہاد مس خام سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اقبال کا آخری فرمودہ تھا

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
میرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

اگر اقبال کو حیات دوام حاصل ہوئی تو صرف اس قلندرانہ تعلیم کی بنا پر ہوگی جو انہوں نے مرض ملت کے لئے تجویز کی اور جس کو عملی صورت دینا ہمارا فرض اولین ہے۔ ورنہ بغیر اس عشق و وجدان کے تسخیر عالم کا کیا امکان ہے۔

یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

اقبال کا نظریہ ہے کہ مسلمان قومیں قرآنی، معیشتی، تمدنی قدریں اختیار کرکے اول اس مقام پر پہنچ سکتیں ہیں جہاں ان کی روح ملت اسلامیہ میں ضم ہو جائے اور پھر وہ عالمی اور آفاقی بلندیوں کی طرف پرواز کر سکیں۔ اگر ان میں جرأت رندانہ نہیں تو پھر یہ ارفع و اعلیٰ حیات ان کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ است
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبالؒ کی نظر میں آزادی اور غلامی کا تصور

از جناب ڈاکٹر محمد نذیر دانش

انسان نے سب خطرات و حوادث سے بے پروا ہو کر امانتِ الٰہی کو اٹھایا۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا شرف حاصل کیا اور روئے زمین پر رب العزت کا خلیفہ یا نائب بن کر آیا جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ امانتِ الٰہی انسان نے کس طرح اٹھائی؟ قرآن مجید اس واقعہ کو یوں بیان فرماتا ہے۔

"ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی سو ان سب نے انکار کیا۔ اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا۔" (سورہ سبا آیہ ۷۲)

"مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی تحقیق میں امانت سے مراد تجلیٔ ذاتی کی استعداد و قابلیت ہے جنات عبادت سے صالح بن جاتے ہیں۔ اور ملائکہ عصمت سے مقرب ہیں مگر انوارِ صفات سے سعود کر کے تجلیٔ ذات سے یہ دونوں بھی مشرف نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ تحمل نور ممکن نہیں بغیر ترکیب عنصرِ خاک کے قیام انوار اجسام شفاف پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے محل و متحمل اجسامِ کثیف ہی ہو سکتے ہیں۔ یہی نکتہ ہے کہ خلافتِ دنیوی کے قابل عنصرِ خاک ہی قرار پایا۔

حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ساتوں آسمانوں اور عرش سے خطاب ہوا کہ تم یہ امانت اور جو کچھ اس میں ہے اٹھاؤ گے؟ عرض کیا کہ اس میں کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ نیکی پر اجر و ثواب اور بدی پر مواخذہ و عذاب۔ اس پر ان سب نے عذر کر دیا۔ پھر اسی طرح زمین سے پھر پہاڑوں سے خطاب و جواب ہوا (ابنِ کثیر) اور ابن جریج کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ یہ معاملہ تین دن تک پیش رہا اور سب نے بکمال خشیت عذر کیا کہ اے پروردگار! ہم تو محض تابع اور حکم بردار ہیں اور عذاب و ثواب نہیں چاہتے۔ (ابنِ کثیر) (قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر ماجدی جلد دوم ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، مترجم و مفسر مولانا عبد الماجد دریابادی۔)

انسان کو زمین پر خلیفہ بنائے جانے کا ذکر قرآن مجید نے یوں فرمایا ہے: "اور جب وقت ارشاد فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ (سورہ البقرہ آیہ ۳۰)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کامل یعنی مومن جس نے اطاعت و بندگی کا صحیح حق ادا کیا اور جس کے لئے بحر و بر میں بسنے والی مخلوق تو درکنار سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے گئے۔ کیا وہ کسی دوسرے ایسے انسان یا انسانوں) کا غلام بن سکتا ہے۔ جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات و صفات کے منکر ہونے کے علاوہ تمام اخلاقی اور سماجی اوصاف سے بھی عاری ہو؟ نہیں ایسا ہرگز ممکن نہیں "آزادی" مومن کا روزِ ازل سے پیدائشی حق ہے اور "مومن" اور "غلامی" دو متضاد چیزیں ہیں۔

غلامی خواہ نفسِ امارہ کی ہو یا کسی قوم کے جبر و اقتدار اور مستعار سامراجی تہذیب و تمدن اور بود و باش کی یا انفرادی اغراض و مفادات کی، مومن کے لئے تباہ کن ہے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے برصغیر کی ملت اسلامیہ کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انہیں آزادی جیسی نعمتِ ایزدی کا احساس دلایا اور غلامی جیسی لعنت سے بیزار کیا جس کا ثبوت ان کے کلام میں موجود ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مردِ حر کے بارے میں کہا ؎

مردِ حر از لاالہ روشن ضمیر | می نگردد بندۂ سلطان و میر

(پس چہ باید کرد)

یعنی مرد آزاد کا دل توحید کی روشنی سے منور ہوتا ہے اور وہ کسی بادشاہ یا امیر کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ہرگز نہیں پہنتا۔

اور غلام کے بارے میں کہا ؎

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ | زندگی او را حرام از بیم مرگ

(پس چہ باید کرد)

یعنی غلام تو ہر وقت موت کے خوف سے مرتا رہتا ہے اور اس کی زندگی موت کے ڈر سے حرام ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک "مومن" اور "غلامی" کا امتزاج عشق و مذہب کو بھی ایک ساتھ رہنے نہیں دیتا۔ چنانچہ زبورِ عجم میں کہتے ہیں ؎

در غلامی عشق و مذہب را فراق
انگبینِ زندگی بد مذاق

یعنی غلامی میں عشق اور مذہب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور زندگی کا شہد بدمزہ ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک ایک انسان کا دوسرے انسان کا غلام بننا اس کی بے بصیرتی کی غمازی کرتا ہے۔

اور خوئے غلامی کا حامل انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے پیام مشرق میں کہا ہے۔ ؎

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولی نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

ترجمہ: انسان نے بے بصیرت ہونے کی وجہ سے انسان کی غلامی کو اپنایا اس کے پاس (آزادی) کا ایک موتی تھا جو اس نے بادشاہوں کی نذر کر دیا۔ یعنی وہ غلامی کی عادت رکھنے سے کتوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک کتے نے دوسرے کتے کے آگے سر جھکا دیا ہو۔

علامہ اقبالؒ کے خیال میں ؎

عشق را آرام جاں حریت است
ناقہ اش را ساربان حریت است

(رموزِ بیخودی)

یعنی عشق کے واسطے روح کا آرام آزادی ہے اور اس کی اونٹنی کا ساربان صرف آزادی ہے۔

مردِ حر خود را ز گل بر می کند
خویش را بر روزگاراں می کند

(اسرارِ خودی)

یعنی آزاد آدمی خود کو مٹی سے بلند تر کرتا ہے اور پھر اپنی قوتِ تسخیر سے اہلِ زمانہ پر چھا جاتا ہے۔

سینۂ آزادہ چابک نفس
طائرِ ایام را گردد قفس

(اسرارِ خودی)

یعنی آزاد مرد کا تیز سانس بھرنے والا سینہ طائرِ ایام کو پنجرے کی مانند قید کر لیتا ہے۔

دمبدم نو آفرینی کارِ حر
نغمۂ پیہم تازہ ریزد تارِ حر

(اسرارِ خودی)

یعنی آزاد آدمی ہمیشہ نئی نئی چیزیں بناتا رہتا ہے اور اس کا ساز ہر لمحہ نئے نئے نغمے برپا کرتا رہتا ہے۔

فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست

(اسرارِ خودی)

یعنی اس کی فطرت کسی کام کو بار بار دہرانے کی تکلیف نہیں کرتی۔ اور اس کا راستہ پرکار کے حلقے کی مانند دہی کا دہی رکا نہیں رہتا۔

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر
حادثات از دستِ او صورت پذیر

(اسرارِ خودی)

یعنی آزاد آدمی کی ہمت تقدیر کو بھی مشورہ دیتی ہے اور اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ ؎

طائرِ دانا نمی گردد اسیر
گرچہ باشد دامے از تارِ حریر

(زبورِ عجم)

یعنی ایک دانا پرندہ تو کبھی اسیر نہیں ہوتا۔ اگرچہ جال ریشم کے تاروں سے بنا ہوا ہو۔
علامہ اقبالؒ اس بات کے قائل ہیں کہ غلامی کی عادت رکھنے والا انسان اصل میں اپنی فطرتِ آزاد کو بھی بدنام کر بیٹھتا ہے۔ اور جب تک وہ آقاؤں کے بت تراشتا رہے گا۔ برہمن سے کافر تر ہوگا۔ اسی طرح انہوں نے پیامِ مشرق میں لالۂ طور کے عنوان کے تحت قطعہ نمبر ۱۵۳ میں زندہ اور مردہ کا جو تصور پیش کیا ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

"ایک مزار سے میرے کان میں یہ آواز آئی کہ زمین کے نیچے بھی زندہ رہا جا سکتا ہے۔ وہ شخص سانس لیتے ہوئے بھی مردہ روح کا حامل ہوتا ہے۔ جو دوسروں کی مرضی اور مراد کے مطابق زندہ رہتا ہے۔
حد تو یہ کہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

از غلامی لذتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

یعنی غلام سے لذتِ ایمان کی توقع نہ رکھو اگرچہ وہ حافظِ قرآن ہو۔ پھر بھی اس میں ایمان کی تلاش نہ کر۔

دیں و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

یعنی غلام اپنے مذہب اور عقل کو بڑا سستا بیچتا ہے اور اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لئے جان سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال آزاد اور محکوم کے بارے میں ضربِ کلیم میں اس طرح کہتے ہیں ؎

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوموں کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

ارمغانِ حجاز میں آزادی اور غلامی کے بارے میں کہتے ہیں۔ ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک یہ خواجۂ افلاک

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ غلامی میں انسان کی فکری و دماغی اور جسمانی و روحانی تمام قوتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں اور ایک انجانا خوف اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے اور اس طرح وہ زندگی کی جملہ نعمتوں اور آسائشوں سے محروم رہتا ہے۔ چنانچہ بانگِ درا میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ایک جگہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں۔ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

مومن کی زندگی کا راز آزادی میں مضمر ہے۔ اس کی روحانی نشو و نما بتوں کا طواف کرنے سے ہرگز نہیں ہوتی وہ تو طویل سجدوں کا کبھی قائل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ باطل قوتوں سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی روح موت سے اور بھی زیادہ پائندار ہو جاتی ہے اور اس کی تکبیر کی آواز لفظ و صدا سے بے نیاز ہوتی ہے (ترجمہ اشعارِ اقبال رح) ضربِ کلیم میں علامہ اقبال رح بندۂ آزاد کی شان کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے

انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

ملتِ اسلامیہ جب تک اپنے منصب و مرتبہ کو نگاہ میں رکھتی ہے کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے تو اسے دوسروں کی غلامی کبھی بھی گوارا نہیں ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کے خیال میں آزاد مسلمانوں کی عید ملک و مذہب کی شان و شوکت ہے اور غلام مسلمانوں کی عید کو فقط "اجتماعِ مومنین" کا نام دیا جاتا ہے۔ آزاد قوموں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ؎

نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی!
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

غلام قومیں جس چیز کے علم و عرفان کو آشکارا کرتی ہیں۔ اس کا اشارہ علامہ اقبالؒ ارمغانِ حجاز میں یوں کرتے ہیں۔ ؎

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمین اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ

مومن کی محکومی علامہ اقبالؒ کو کسی وقت اور کسی حال میں بھی گوارا نہیں وہ ارمغانِ حجاز میں کہتے ہیں۔ ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب محکوم سلطان و امیر

غلاموں کی نماز کے بارے میں ضرب کلیم میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔ سہ

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

ارمغانِ حجاز میں علامہ اقبالؒ نے مرگِ غلامی، قبر اور مردے کی باہمی گفتگو اور صدائے غیب کے عنوان سے بڑے سبق آموز اور عجیب اشعار کہے ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مرگِ غلامی

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام
شرعِ ملوکانہ میں جدتِ احکام دیکھ
صور کا غوغا حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

علامہ اقبالؒ کے خیال میں غلام آدمی مرنے کے بعد جب زندہ کیا جائے گا تو بھی غلام ہی ہوگا۔

اور غلام کی میت سے اس کی قبر بھی بیزار ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبالؔ ارمغانِ حجاز میں عالمِ برزخ کے بارے میں یوں کہتے ہیں۔

مردہ اپنی قبر سے

کیا شے ہے؟ کس امروز کا فردا ہے قیامت؟
اے میرے شبستانِ کہن! کیا ہے قیامت؟

قبر مردے سے

اے مردۂ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت؟

مردہ قبر سے

جس موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
اس موت کے پھندے میں گرفتار نہیں میں!
ہر چند کہ ہوں مردۂ صد سالہ ولیکن
ظلمت کدۂ خاک سے بیزار نہیں میں!
ہو روح پھر اک بار سوار بدن زار
ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں!

مردے اور قبر کی باہمی گفتگو کے دوران "صدائے غیب" سے

نے نصیب مار کژدم نے نصیب دام ودد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جس کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

قبر اپنے مردے سے

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟

میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر، محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات اے جان پاک

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ جو انسان زمانے کا گلہ کرتا ہے وہ بے حوصلہ ہے اور جو جوان مرغانِ سحر کے نالہ سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ وہ ہنگامۂ پیکار کے لائق ہرگز نہیں ان کے بقول انسان کو فیضِ فطرت نے دیدۂ شاہین عطا کیا مگر غلامی نے اس میں چمگادڑ کی نظر رکھ دی ہے چنانچہ ملاحظہ فرمائیے :-

جس کے پرتو سے منور رہی تیری شب دوش
پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغ روشن
مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش
نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

(ضربِ کلیم)

مآخذ و منابع :

۱۔ قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر ماجدی (ج دوم) ترجمہ و تفسیر از مولانا عبد الماجدؒ دریا آبادی: ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔
۲۔ جوہرِ اقبال۔ تالیف عبد الرحمٰن طارق۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور ۱۹۷۷ء

اقبال اور حسنِ فطرت

از جناب قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

اقبال جو تخلیقی سطح پر زندگی گزارنے والے ایک فنکار تھے۔ انہوں نے اپنے لئے شعری مواد کا سرمایہ زندگی کے تقریباً تمام ہی گوشوں سے اکٹھا کیا۔ البتہ چونکہ شعری مواد بجائے خود شاعری نہیں ہوتا اور اسے شعر کے صدف پارے میں ڈھلنے کے لئے شاعر کی ذات میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سریت میں ڈوبنا پڑتا ہے جسے شاعر کا وجدان کہتے ہیں۔ اس لئے اقبال کو بھی اپنے شعری مواد کو شاعری کا جوہرِ غلطیدان بنانے کے لئے جہاں تخلیق کے جملہ روحانی اور وجودی کرب کو گوارا کرنا پڑا۔ وہیں پر ان کی جمال آفریں شخصیت بھی ان کے لئے ایک سہارا بن گئی۔ ادراکِ جمال فنکار کی شخصیت کا وہ لازمی وصف ہے جس کے بغیر ہر فنکاری ناقص اور ہر فن ناکمل ہے۔ اقبال کی شعری شخصیت میں یہ وصف ابتدا سے آخر تک باقی رہا ہے۔ جس کی جڑیں شاعر کی ذات کے گہرے گوشوں سے غذا حاصل کرتی ہیں۔ اس جمال کا تعلق شعری ہیئت یا اسلوب سے بھی ہے اور شعری مواد سے بھی

مادی کائنات اور اس کے اجزا میں پوشیدہ جمال کے سلسلہ میں نظریات کی کثرت ہے۔ البتہ زیادہ اہمیت کے حامل صرف دو ہی نظریات ہیں۔ معروضی و موضوعی۔ اول الذکر جمال کے وحدۃ الوجودی نظریہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے اس لئے کہ دونوں حُسن کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اختلاف کی نوعیت محض اتنی ہے کہ وحدۃ الوجودی دبستان کائنات کو اس لئے حسین سمجھتا ہے کہ وہ اس میں حسنِ مطلق کو جاری و ساری دیکھتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات کی علت حسنِ الوہی ہے۔ جبکہ معروضی دبستان کے نزدیک یہ کائنات اس لئے حسین ہے کہ اس کے عناصر تکوینی میں ہم آہنگی، اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے۔ علامہ اقبال مختلف اوقات میں دونوں نظریات کے نقیب رہے ہیں۔ البتہ ذیل کی نظم "آفتاب صبح" جہاں حسن کے خارجی وجود میں اقبال کے ایقان کی مظہر ہے وہیں پر اس کے الوہی تصور کی بھی غمازی کرتی ہے۔

شورشِ میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو

زینتِ بزمِ فلک ہے جس سے وہ ساغر ہے تو
زیورِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو
جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
حسن تیرا جب ہوا بامِ فلک سے جلوہ گر
آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوہ چاہیے

"تماشا" اور "جلوہ" حسن کے ربانی پیکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے سبب اقبال سراسر حسن کے معروضی دبستان سے منسلک نہ رہ کر اس کی وحدت الوجودی معنویت کے بھی نقیب بن جاتے ہیں۔

حسن کا موضوعی نظریہ اول الذکر کے مقابلہ میں زیادہ توانا اور معنی خیز ہے جس کے تحت بقول ٹی۔ ای ہیوم حسن اشیا کی فوری ملکیت رہنے کے بجائے اپنی ایک ذہنی اساس پیدا کر لیتا ہے یعنی اس کا تعلق اشیاء سے ہونے کے بجائے ان دماغوں سے ہوتا ہے، جو اس کا شعور رکھتے ہیں۔ خود اقبال بھی حسن کو موضوعی تصور کرتے ہیں یعنی یہ خارج میں نہیں بلکہ انسان کے موضوع یا قلب میں ہوتا ہے، لہٰذا اس کی تلاش و جستجو خارج یا محسوسات کی دنیا میں عبث ہے ؎

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

حُسن کی اس تقسیم میں ایک خامی کا بھی احساس ہوتا ہے یعنی اگر ہم دونوں جمالیاتی نظریوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور لاتعلق کر کے دیکھیں تو وہ ناقص اور ادھورے نظر آئیں گے کیونکہ ان میں سے ہر ایک نظریہ حقیقت کے صرف ایک ہی رخ کی عکاسی کرتا ہے، لیکن اگر دونوں نظریوں کو باہم یکجا کر دیا جائے تو ان کی اس وحدت سے حقیقت کے دونوں رُخ سامنے آجاتے ہیں اور ان میں صحت و جامعیت بھی پیدا ہو جاتی ہے" البتہ حسن کے الگ الگ مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معروضی بھی ہے اور موضوعی بھی۔[۵]

اقبال کے یہاں حسن کے مذکورہ دونوں ہی تصورات ملتے ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ اسے ان کا فکری تناقص یا تضاد تصور کیا جائے۔ لیکن قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ اقبال نے جہاں فنی بلندی بتدریج حاصل کی وہیں پر ان کی شاعری میں فکری ارتقا بھی بتدریج ہو سکا ہے، ابتدا میں جو ان کے تصورات رہے ہیں وہ آگے چل کر مزید

پختگی اور رنگ و تاز حاصل کر سکتے ہیں، اس کا ایک مظہر ان کا نظریۂ جمال بھی ہے۔ ابتدا میں اقبال فطرت کے حسنِ محض کے پرستار نظر آتے ہیں لیکن جوں جوں ان کی شاعرانہ بصیرت اور حکیمانہ عنصریت کا ارتقا ہوتا ہے اسی لحاظ سے وہ فطرت کے حسن میں بھی زندگی کی بعض پراسرار حقیقتوں کی جستجو کرتے ہیں۔ خود فطرت کے حسن میں ان کی دلچسپی آگے چل کر کم ہو جاتی ہے اور فطرت کے یہی مادی عناصر اب ان کی شاعری میں زندگی کے باطنی اقدار و حقائق کی تشریح و تعبیر کے سلسلہ میں اپنی ایک علامتی و رمزیاتی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تدریجی مراجعت کی ایک وجہ تو حسنِ فطرت کے محدود امکانات ہیں۔ پھر اس کے عضویاتی حسن کا نقص بھی ہے۔ جو اپنی شاعرانہ بلندی کے لئے شاعر کی ذات پر ایک روحانی دباؤ کا اضافہ کرتا ہے۔ البتہ جو چیز ابتدا سے آخر تک اقبال کی تخلیقی زندگی میں حسنِ فطرت کے ایک لازمی عنصر کے طور پر موجود رہی وہ ان کی رومانیت اور بعض غیر مرئی علائم ہیں جو ہمیں اکثر اس تذبذب میں ڈال دیتے ہیں کہ اقبال بحیثیت شاعر اصلاً کس مسلک یا نظریہ پر کاربند رہے ہیں۔ اقبال کے اس رومانی احساس کا تعلق ان کی شخصیت سے بھی ہے اور اس پر گداز قلب سے بھی جو تمام زندگی زخمی انسانیت کی نجات اور سربلندی کے گرد خوابوں کا جال بنتا رہا۔ اس مرحلہ میں انہیں بارہا اس جاں گسل آگ کا بھی تجربہ کرنا پڑا جو کہ عظیم فنکاروں کا مقدر ہوتا ہے۔ ان مراحل سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کے لئے رومانیت اقبال کے لئے ایک زادِ سفر بھی بنی اور بالآخر تسکینِ ضمیر کا سبب بھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رومانیت ان کی شاعری میں کہیں اگر شبنم ہے تو کہیں شرارہ، اس کا وجود کہیں بھی ناگوار نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ احساس ہی ذہن میں جنم لینے پاتا ہے کہ اقبال نے حیات کی کسی بھی منزل میں رومانی مسلک کو اس طور پر اختیار کیا ہو جس کی مثالیں یورپ کے رومانی شعراء (ورڈس ورتھ) بائرن کیٹس اور شیلی وغیرہ کی ذات میں ملتی ہیں۔ یہ رومانیت گوئٹے کی رومانیت کے مماثل ہے جو عقلیت کے خلاف احتجاج بھی نہیں ہے بلکہ اس میں قدم قدم پر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا شعور نظر آتا ہے۔

اقبال جیسا کہ کہا جا چکا ہے ابتدا میں انگریزی رومانی شعراء سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں اور فطرت کا حسن ان کے لئے زیادہ باعثِ کشش بنتا ہے۔ البتہ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ فطرت کا حسن اس مادی کائنات میں کسی نظم و ضبط یا آراستگی کا حامل نہیں ہے۔ اس سے گذر کر ہمیں وہ جمالیاتی آسودگی بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ جس کی طلب و جستجو زندگی کا منتہا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک لینڈ اسکیپ سے گذرتے وقت ہم پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ فن کار کے پیش کردہ لینڈ اسکیپ سے حاصل کردہ تاثرات سے مختلف ہوتے ہیں۔ لینڈ اسکیپ کی وساطت سے بننے والی ذہنی تصویر اچانک ہمیں ایک ایسی کائنات میں پہونچا دیتی ہے جس میں بقول کیسیرر زندہ چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ زندہ ہیئتیں ہوتی ہیں۔ اب ہم اشیاء کی خودی حقیقت میں رہنے کے بجائے وزن و آہنگ کی مکانی ہیئتوں میں رہتے ہیں۔ رنگوں کے افتراق و امتزاج، روشنی اور سائے کے درمیان رہتے ہیں، ہیئتوں کے

اس طرح کے نامیاتی پہلوؤں کی ہم آمیزی ہی پر شاعر کا جمالیاتی تجربہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعری افلاطون کے نقطۂ نظر کے مطابق فطرت کی نقالی نہیں ہے بلکہ وہ ہیں حقیقت کا ایک نہایت ہی قیمتی شگفتہ اور رنگین پیکر عطا کرتا ہے اور اس کے رسمی ڈھانچہ میں زیادہ گہری نظر کی دعوت دیتا ہے' یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں صفحۂ قرطاس پر موجود حسنِ فطرت کی جو تصویریں ہیں۔ وہ ان حقیقی تصویروں سے زیادہ زرنگار اور دلنواز ہیں جو ہیں کوہ و بیاباں، صحرا و دریا اور چاند کرن کی وساطت سے دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن فن اور فن کاری کا یہی وہ مشکل مرحلہ بھی ہے۔ جہاں ادنیٰ و اعلیٰ درجہ کی تخلیقی فکر کے امتیازات واضح ہوجاتے ہیں۔ ایک عظیم فنکار اسی وجدانی بصیرت کا سہارا لے کر فطرت کے مذکورہ پیکر جمال میں ابدیت کے نقوش اجاگر کر دیتا ہے جبکہ ایک معمولی درجہ کا فنکار فطرت کی نقالی سے بلند نہیں ہو پاتا۔ اقبال ایسے ہی فنکاروں سے مخاطب ہیں ؎

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

وہ مزید کہتے ہیں ؎

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہوں فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

اقبال کی شاعری میں نظر کا استعارہ بڑی وسیع معنویت کا حامل ہے۔ جو بصیرت اور وجدان کے معنی کا احاطہ کرتا ہے۔ ان معنیٰ کی طرف توجہ مبذول کرا کے شاعر زندگی کی حقیقتوں پر سطحی نظر ڈالنے کے بجائے اس میں دیرپا استغراق کی دعوت دیتا ہے۔ خود اقبال کا بھی مقام اس درجہ اسی لئے بلند ہو سکا ہے کہ فن کے ساتھ سستا سودا نہیں کرتے۔ وہ فطرت کے جمال کا مشاہدہ اس معرفتی بصیرت کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کے آئینۂ ادراک میں حسنِ فطرت اور حسنِ کائنات کی خارجی و باطنی دونوں تصویریں بیک وقت رقص کرنے لگتی ہیں۔ چنانچہ کوششِ ناتمام کے بعض اشعار اس دوگونہ صفات کی حامل شخصیت کو سمجھنے میں ہماری کافی مدد کرتے ہیں۔ ذیل کی نظم میں فطرت کے بعض علائم اور نقوش کی طرف اشارے کئے

گئے ہیں۔ البتہ شاعر یہاں بطور خاص ان علائم کی حقیقی جمالیاتی رمزیت اور ذرہ ذرہ کائنات میں پنہاں اس ابدی اضطراب کی مصوری کرتا ہے جس کے سبب یہ جمال کی منزلیں عبور کرتے ہیں ؎

فرقت آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح
چشم شفق ہے خوں فشاں اختر شام کے لئے
رہتی ہے قیس روز کو لیلیٰ شام کی ہوس
اختر صبح مضطرب تاب دوام کے لئے
کہتا تھا قطب آسماں قافلہ بر نجوم سے
ہمرہو میں ترس گیا لطف خرام کے لئے
سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے
حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بیقرار ہے جلوۂ عالم کے لئے
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اقبال کی جمال آفرین شخصیت کو فطرت کے جو نقوش زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ان کا تعلق فطرت کے نامیاتی پیکروں سے ہے جن میں ندی، پانی، بحر، سیل، موج اور حباب وغیرہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔
اقبال کے شعری تخیل میں ان کی ایک علامتی معنویت بھی ہے جن کے وسیلے سے انہیں اپنے مخصوص نظریے کی وضاحت میں بڑی مدد ملتی ہے۔
اقبال کو پانی اور اس کے دوسرے مظاہر و ممکنات سے جو رغبت ہے اس کی وجہ پانی کی حرکت بھی ہے۔ اور چمک بھی۔ چنانچہ ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے پانی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ جمود کی علامت ہے۔ جو ان کے سطح نظر سے میل نہیں رکھتا۔ مذکورہ فطری مظاہر کی بعض تصویریں ملاحظہ ہوں۔ یہ اپنی علامتی و رمزیاتی معنویت کے علاوہ شاعر کے لئے باعث کشش اس لئے بھی بنی ہیں کہ ان کی وساطت سے بننے والا جمالیاتی پیکر سامعہ و باصرہ دونوں کو آسودہ کرتا ہے۔

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

شاعر میں یہی تصویر کچھ اور ہی زیادہ شوخ و شنگ اور دلکش جمالیاتی اشاروں سے معمور ہے جن سے معنیٰ کی سطحیں فراہم ہوتی ہیں۔ ندی اور اس کو مشخص کرنے والی اصناف اردو شاعری کو پہلی مرتبہ حسنِ فطرت کی خوبصورت تصویروں سے روشناس کراتی ہیں ؎

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کا نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خم کدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

ندی اپنی پوری علامتی معنویت کے ساتھ فلسفۂ غم میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اسے زندگی کی پُرپیچ راہوں میں ان حادثات و موانعات کو بھی عبور کرنا پڑتا ہے جو اس کے پیکرِ جمال کو مسخ کر دیتے ہیں لیکن، وہ اپنی استقامت کے سہارے ایک ابدی وجود کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے ؎

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی

مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہوگئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے ہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی

ساقی نامہ میں پہونچ کر جوئے کہستان کچھ اور ہی زیادہ تنگ و نازک حامل ہوگئی ہے جو انسانی حیات اور اس کی پیہم متغیر نفسیات سے حد درجہ مماثل ہی نہیں بلکہ اس کے تمام پیچ وخم کو اپنی ذات کے آئینہ میں سمو لیتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں ہر لفظ اچکنا، سرکنا، اچھلنا، پھسلنا، سنبھلنا اور نکلنا وغیرہ زندگی کی حرکی اقدار ہی کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہی اوصاف جوئے کہستاں کو بھی حیات تازہ بخش دیتے ہیں۔ اور خود انسان کو بھی فنا ہونے سے محفوظ رکھتی ہے

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پانی کے مظاہر و ممکنات میں 'موج' کی اہمیت تسلیم شدہ ہے چنانچہ غالب کی شاعری میں موج وہ عظیم استعارہ یا علامت ہے جو شاعر کی باطنی زندگی اور اس کی پیچیدہ نفسیات کی تفہیم کی راہ میں حائل ہے، ہر عظیم فنکار بعض وجوہ کی بنا پر کچھ الفاظ کو لاشعوری طور پر اپنے او پر طاری کر لیتا ہے۔ جو دراصل اس کے روحانی سفر میں حائل بند دروازوں کے لئے ایک دستک کا حکم رکھتے ہیں۔ اقبال کے شعری سرمائے میں 'موج' کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ یہاں موج تنہا کوئی معنویت نہیں رکھتی لیکن جب اس کا رشتہ شاعر کی ذات اور اس کی اولوالعزم شخصیت سے جا ملتا ہے۔ جس میں جنوں بہ کنار رہنے کی آرزو اور خود کو ہر حال میں بلند رکھنے کا جذبہ شامل ہے تو اس کی معنویت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے۔

'موج دریا' میں اقبال نے بڑی صراحت کے ساتھ موج کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بے تاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے
موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

یہ اشعار چونکہ تشریحاتی ہیں اور موج کی خصوصیات تجویز کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں موج کا شاعر کی ذات سے رشتہ دریافت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ ذیل کا شعر ؎

باد صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

شاعر کی ذات کے بعض عمیق گوشوں کو منور کرتا ہے 'موج نفس' نشو و نمائے آرزو کا وسیلہ کس طرح بنتی ہے۔ اس سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہمیں خود فن کے مقتضا اور فن کار کے وجود کی غایت کو سمجھنا ہوگا جبکہ خود زندگی کا دوسرا نام نشو و نمائے آرزو اور رموز کائنات کی عقدہ کشائی ہے یہ وہ مراحل ہیں جہاں سے انسان صرف موج نفس ہی کے سہارے آگے بڑھ سکتا ہے۔

اقبال کی جمال آفریں شخصیت نے جہاں فطرت کے فعال اور محرک عناصر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ وہیں پر ان کی شاعری میں غیر فعال اجسام کا بھی حصہ ہے۔ یہ عناصر جو صحرا، کہسار، دریا، پھول، اور صبح و شام وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ اپنی باطنی کائنات میں کشش کا کوئی پہلو نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا خارجی پیرہن حد درجہ زرنگار ہے۔ شاعر جو حسن کا متلاشی اور حسن کا پرستار ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اس جلوۂ صد رنگ کی حامل انجمن میں گم بھی ہو جاتا ہے۔ اقبال جو عموماً اپنی ایک مخصوص انفرادی بصیرت کے لئے مشہور ہیں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے حسن کی اس جولاں گاہ میں کھو جاتے ہیں ؎

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

بال جبریل ہی کی غزل نما ایک نظم میں اقبال کائناتی جمال کے بعض پہلوؤں کو ابھارتے ہیں ؎

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

'لالۂ صحرائی' میں جلال و جمال کی جو عظیم صفات موجود ہیں یہ اشعار ان کا احاطہ کرتے ہیں۔ لالہ چونکہ اپنی ایک علامتی و رمزیاتی معنویت رکھتا ہے اس لئے اسے محض ایک پھول تصور کرنا مناسب نہ ہوگا۔

یہ گنبدِ مینائی یہ عالمِ تنہائی — مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو — منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا — اک جذبۂ پیدائی اک لذتِ یکتائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو — خاموشی و دلسوزی سرمستی و رعنائی

ایسے بہت سارے حسی و نباتی پیکر ہیں جو اقبال کی حسن پرست سیماب پا اور جمال آفریں شخصیت کے مطالعہ میں معاون ہو سکتے ہیں البتہ آخر میں یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ اقبال کی شاعرانہ فکر کسی درجہ بندی (COMPARTMENTALISATION) کی متحمل نہیں ہو سکتی اس کی تفہیم اور خود شاعر کی کلی شخصیت کے عرفان کے لئے اس پورے ذہنی و روحانی نظام کا مطالعہ ناگزیر ہوگا جسے جولین ہکسلے NOETIC SYSTEM سے تعبیر کرتا ہے۔

اقبال اور تصوف

از ڈاکٹر جمیلہ خاتون
پروفیسر گورنمنٹ کالج ناظم آباد، کراچی

شعورِ ذات سے حیاتِ علمی اور ذہنی میں جو گوناگوں مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا حل فلسفہ نے بھی تلاش کیا ہے اور مذہب نے بھی، دونوں کا مقصد یہ ہے کہ شعورِ انسانی کی کامل بیداری ہو، اور اس کے راستہ میں جو موانع حائل ہوں ان کا سدِ باب ہو، اسلامی نقطۂ نظر نے ان دونوں باتوں کو بدرجۂ اتم پورا کیا ہے اور علامہ اقبالؔ نے اسی نقطۂ نظر کی تشکیلِ جدید کا فرض ادا کیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ فلسفۂ جدید کی زبان میں اسلامی نظامِ فکر کو پیش کیا ہے، اسلامی نظامِ فکر میں سمع و بصر اور فواد و قلب کے ساتھ ساتھ فکر اور علم پر بھی زور دیا گیا ہے۔ جس نے غزالی نے اپنے زمانے کے کلامی انداز میں اچھی طرح بحث کی ہے۔ اور اس اندازِ فکر کو علامہ اقبالؔ نے دورِ حاضرہ کے فلسفہ کی روشنی میں اور آگے بڑھایا ہے۔

علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں کانٹ نے اپنے اصول و کلیات کا ساتھ دیتے ہوئے یہ تسلیم نہیں کیا کہ ذات الٰہی کا ادراک ممکن ہے برعکس اس کے غزالی نے فکرِ تحلیلی سے مایوس ہو کر صوفیانہ واردات کا رخ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے اندر مذہب کا ایک مستقل سرمایہ موجود ہے۔[۱]

علامہ اقبال لکھتے ہیں" فکر اور وجدان میں ایک نامی رشتہ کام کر رہا ہے۔" اس طرح انہوں نے ادراک کو وجدان سے ملا دیا ہے، بلکہ علم کو وجدان کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔" دراصل علم کی حرکت میں لا متناہی کی بھی موجودگی ہے جس نے تناہی فکر ممکن کر رکھا ہے"[۲] "یا یوں کہیئے کہ فکر میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو محض اس لئے کہ اس کی متناہیت میں لا متناہی بھی مضمر رہتا ہے، یا بالفاظ دیگر ہم عینی یا عالمِ حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں تو موجود یعنی مجاز ہی کی وساطت سے۔"[۳]

---

[۱] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۸
[۲] " " " ص ۱۰
[۳] " " " ص ۱۴

علامہ اقبال نے اس علم و عمل، مسلسل کوشش اور مجاز پر زمانہ کے اقتضا اور دورِ حاضرہ کی ضرورتوں کے پیشِ نظر زیادہ زور دیا۔ تو لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ علامہ اقبال تصوف کے خلاف ہیں، خود ان کے بیان سے بھی اس قسم کے خیالات کو تقویت پہنچی اور پھر وحدت الوجود اور حضرت ابن عربی پر اعتراض کرنے سے یہ غلط فہمی اور دوام ہوگئی۔

لیکن خطبات کی اشاعت کے بعد ایک حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہوگیا۔ اور علامہ اقبال کا نظریہ تصوف کے متعلق واضح ہوکر سامنے آگیا۔ علامہ اقبال نے کئی دفعہ تصوف کے متعلق اپنے نظریوں کی وضاحت کرتے ہوئے خود بھی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا "شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے"[1]

ان کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک انہوں نے تصوف کے متعلق واضح رائے پیش نہیں کی تھی۔ لیکن خطبات میں ان کا پہلا خطبہ اسی موضوع پر ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں "صوفیانہ مشاہدات کا تعلق جس عالم سے ہے اس کی تعبیر سے ہیں ذاتِ الٰہیہ کا علم حاصل ہوتا ہے"[2] دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ "صوفیائے احوال میں اس کے برعکس ہم حقیقتِ مطلقہ کے مردِ کامل سے آشنا ہوتے ہیں جس میں ہر طرح کے حجابات باہم مدغم ہوکر ایک ناقابلِ تجزیہ وحدت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور ناظر و منظور یا شاہد و مشہود کا امتیاز سرے سے اٹھ جاتا ہے"[3] بقول غالب

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نہ صرف یہ کہ تصوف کو علم سے اعلیٰ تر سمجھتے تھے بلکہ وحدت الوجود کے اسلامی نظریہ کے قائل تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی" کے دیباچہ میں وحدت الوجود پر اعتراض کیا تھا۔ اور اسی ضمن میں شیخ محی الدین ابن عربی کا بھی نام آگیا تھا۔ علامہ نے وحدت الوجود پر اور ویدانت اور عیسائیت پر یہ کہہ کے اعتراض کیا تھا کہ اس میں فنا کو اصل مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"بیخودی جو بعض صوفیائے اسلام اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالیٰ میں

---

[1] اقبال نامہ دیباچہ ص ۵۴-۴۱ [2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۶ [3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۷

اس قسم کی بیخودی تمام مذاہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے میں اس قسم کی بیخودی پر معترض ہوں[۱]
لہٰذا اگر وحدت الوجود میں فنا اصل مقصد نہیں ہے تو پھر کوئی اعتراض نہیں رہتا اور یہی ہوا بھی کہ علامہ اقبال پر آگے چل کر یہ واضح ہو گیا تھا کہ ہندو اور عیسائیوں کے وحدت الوجود میں اور اسلامی وحدت الوجود میں بڑا فرق ہے۔

علامہ اقبال ایک بالغ نظر مفکر تھے۔ ان کی تلاش و تحقیق کا سلسلہ جاری تھا، چنانچہ رائے تبدیل بھی ہوتی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں۔[۲]

ایک سوچنے والے زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، انہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا۔ ظاہر ہے مطالعہ کرنے والا ایک دم آخری نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ابتدا میں اُن کی یہ رائے تھی کہ سب سے پہلے جرمنی میں آنا کی انفرادیت پر زور دیا گیا۔ اور تصوف اور وحدت الوجود نفی خودی کا حامی ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اُس کے ہم خیالوں کا ہے اور ارباب وحدت الوجود سے مختلف ہے۔ جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیات کلی میں جذب ہو جائے۔ اور پھر آخر میں ان کی رائے یہ ہو گئی کہ اسلامی تصوف نے خودی کے لئے نئے باب کھولے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حافظ کے متعلق جو اشعار لکھے تھے۔ ان کو بعد میں اسرار خودی سے حذف کر دیا۔ (ملاحظہ ہو مکتوب اقبال بنام اسلم جیراج پوری)

بہر کیف آخر میں ان کا وہی نظریہ رہا ہے جو دوسرے صوفیائے کرام کا ہے۔ اور اس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ذیل میں اُن کے لکچروں سے بھی اس حقیقت کو واضح کیا جاتا ہے پہلے وحدت الوجود کے مسئلہ کو تفصیل سے بیان کر دینے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ وحدت الوجود نے متعلق اسلام کے علاوہ تمام تصورات خواہ ویدانت کے ہوں یا یونانی یا ایرانی، حقیقت کو بطور کل کے تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح یا تو عالم کے وجود کا انکار کرتے ہیں یا خدا کی انفرادیت کا انکار کرتے ہیں۔ اسلامی وجودی وحدت الوجود کے ساتھ انسانی خودی اور خدا کی انفرادیت کے بھی قائل ہیں۔ اور انفرادیت کو کلیت کی ضد نہیں سمجھتے۔''

وحدت الوجود کے مختلف مذاہب میں سے یہ تین مذہب مشہور ہیں۔ نو فلاطونی سری شنکر ابن عربی کیونکہ علامہ اقبال نے شروع میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تصوف نو فلاطونیت سے متاثر ہے اور ابن عربی اور سری شنکر متحد الخیال ہیں۔ انہوں نے غلط فہمی میں رومی کو نوفلاطونیت سے متاثر بتایا تھا۔ لہٰذا

---

[۱] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۷ [۲] حرف اقبال ۱۳۲

جب ہم اُن ملکوں کی تحقیق کرتے ہیں۔ تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نو فلاطونی اگرچہ یونانی فلسفہ اور مشرقی مذاہب کے امتزاج کا نتیجہ ہے لیکن نو فلاطینی اپنے نظریات کے اعتبار سے صوفیوں کی بہ نسبت غیر اسلامی مفکرین سے زیادہ مماثل ہیں۔ عیسائی اور ہندوؤں کی طرح خیالی نظریاتی زندگی کو عملی زندگی سے علیحدہ اور اعلیٰ مانتے ہیں۔ فنائے کامل کو آخری منزل سمجھتے ہیں۔ نجات کے لئے ہندوؤں کی طرح مادّی تقیید کا ترک ضروری خیال کرتے ہیں۔ مختصر طور پر علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہ نفی خودی کے قائل ہیں۔

لیکن اسلامی مفکرین اور تمام صوفیاء ان اصولوں میں ان سے مختلف ہیں۔ نو فلاطونی نفی صفات کے قائل ہیں۔ اور صوفیا صفات کے قائل ہیں۔ خود شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی عالم کو معدوم یا ضرب ِنظر نہیں مانتے بلکہ ان کے خیال میں عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہے اور یہی

سَنُرِيهِمْ فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ [1]

کا مطلب ہے چنانچہ اس حقیقت کا وجدان و عرفان ہی صوفیوں کا آخری مطمع نظر اور انتہائے منزل ہے، نہ کہ محض یا نفی خودی چنانچہ شیخ محی الدین اکبر ابن عربی فرماتے ہیں۔ عبد کے لئے عبودیت کی کوئی انتہا نہیں کہ اس کو پالے اور پھر رب بن جائے۔ جس طرح کہ رب کے لئے کوئی حد نہیں کہ وہ ختم ہو جائے، اور عبد بن جائے۔ اس لئے رب رب ہے بغیر نہایت اور عبد عبد ہے لانہایت[2]

اسی مفہوم کو ایک شعر میں جامعیت سے بیان کر دیا ہے۔

العبد عبد وان ترقیٰ ؛ والرب رب وان تنزل

"بندہ بندہ ہے گو وہ لاکھ ترقی کرے، رب رب ہے گو وہ کتنا ہی نزول کیوں نہ کرے، "اس میں کوئی شک نہیں کہ صوفیوں کی بعض عبارتوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ نفی خودی ہی منتہا اور اصل مقصود ہے، لیکن آپ اگر تمام اکابر صوفیہ کی کتابیں دیکھیں گے تو فنا اور نفی خودی سلوک کا ایک مقام نظر آئے گا۔ اور کبھی کسی صوفی نے اس پر قیام نہیں کیا، نہ اس کی تعلیم دی علامہ اقبال نے اسی وحدت الوجود کی مخالفت کی تھی جس میں فنا کو آخری منزل قرار دیا گیا اور نفی خودی کو مقصد سمجھا گیا ہے چنانچہ بعض صوفیہ کی عبارت سے نو فلاطونیت اور ہندی ارباب فکر کی طرح فنائے کامل کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجدد الف ثانی کی عبارت ہے۔

فنا میں جو جتنا کامل ہے معرفت میں بھی اتنا کامل ہے اور فنا میں جو جتنا ناقص ہے معرفت میں بھی اتنا ہی ناقص ہے[3]

مولانا روم کے بھی سینکڑوں اشعار اسی مفہوم کے ہیں۔

آئینۂ ہستی چہ باشد نیستی ؛ نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی (رومی)

اس قسم کے اشعار خود اسرار خودی میں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال بھی بالکل اسی طرح فنا کو ضروری سمجھتے ہیں

[1] قرآن مجید (۲۵-۱) [2] فتوحات مکیہ بار اول باب ۲۸ مصر ۱۳۲۹ [3] مکتوبات مجدد الف ثانی المکتوب ۳۰۲ ج ۱

اندکے اندر حرائے دل نشیں ترکِ خود کن، سوئے حق ہجرت گزیں[۱]

لہٰذا اس قسم کی نفیِ خودی اور فنا کی تعلیم علامہ اقبال کے یہاں دیکھ کر معترض حضرات کہہ دیتے ہیں کہ علامہ اقبال کے یہاں تضاد ہے، لیکن جو کچھ فرق ہے وہ وضاحت کے انکشاف کا ہے۔ علامہ اقبال نے اسرارِ خودی میں خودی کی تعلیم دی ہے اور اسی میں وحدت الوجود کے ماننے والوں پر اعتراض کیا ہے لیکن اسی میں نفیِ خودی کی تعلیم بھی ہے جو خودی کے منافی ہے۔ اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ نے غیر اسلامی فکر اور نو فلاطونی اور ایرانی و ہندی وحدت الوجود پر اعتراض کیا ہے۔ جن کے یہاں نفیِ خودی نہ تھا ہے۔ اور ترکِ عمل جن کے یہاں باعثِ نجات ہے۔ اس سلسلہ میں ان صوفیا پر بھی اعتراض ہو گیا جنہوں نے غیروں کے فلسفہ کی تقلید کی، یہ دوسری بات ہے کہ اس ضمن میں ان لوگوں کا نام بھی آ گیا جو اس قسم کے وحدت الوجود کے قائل نہیں تھے۔ اور بعد کے انکشاف کے بعد علامہ نے اس خیال سے رجوع کر لیا جیسا کہ عرض کیا گیا۔ صوفیہ کے یہاں فکرِ اسلامی میں فنا اصل مقصد نہیں ہے چنانچہ الجیلی نے فنا کے مقام کی تعریف یہ فرمائی ہے۔

”اصطلاح قوم میں فنا سے مراد اپنے اور اپنے لوازم کے شعور کا معدوم ہو جانا ہے[۲]“ وہ لکھتے ہیں:
جب اللہ تعالیٰ بندے پر کسی صفت کے ساتھ یا کسی اسم کے ساتھ تجلی فرمانا چاہتا ہے تو پہلے اسے بنفسہٖ معدوم کر کے فنا کر دیتا ہے اور اس کے وجود کو سلب کر لیتا ہے۔ پھر جب نورِ عبدیت بجھ جاتا ہے۔ اور روحِ خلقی فنا ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ ہیکلِ عبد میں بغیر حلول کے قیام فرماتا ہے۔ اور یہ جو کچھ اس سے سلب کیا ہے اس کا عوض ہوتا ہے[۳]۔

علامہ اقبال نے تشکیلِ جدید الٰہیہ میں خودی کو مربوط و مرتب طریقہ سے بڑی تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے، اور اس کے مدارج کی کوئی کڑی نہیں چھوڑی ہے جب ہم اقبال کے نظامِ فکر کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ تو اس میں صحیح اسلامی روح کارفرما نظر آتی ہے اور شیخ اکبر، مولانا روم یا حضرت مجدد اور دوسرے صوفیہ کی فکر میں جس طرح بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو تمام قرآنی حکمت سے مملو اور تزکیۂ قرآنی کے علمبردار ہیں۔ جادۂ مستقیم سے ان میں سے کسی نے سرمو انحراف نہیں کیا۔ یہی حال اقبال کا ہے علامہ اقبال کی فکر اور شیخ محی الدین اکبر کی فکر میں کہیں تضاد نظر نہیں آتا۔ اقبال کہتے ہیں صوفیانہ احوال میں ہم حقیقتِ مطلقہ کے مردِ کامل سے آشنا ہوتے ہیں۔ اور ناظر و منظور یا شاہد و مشہود کا امتیاز سرے سے اٹھ جاتا ہے[۴]۔

عام طور پر یہ خیال ہے۔ کہ علامہ اقبال ذاتِ سرمدی سے اتحاد و اتصال کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس میں حقیقت صرف اس قدر ہے کہ فنا کے مقام میں قیام کر لے اور اسے مقصود سمجھنے کو کسی صوفی نے جائز نہیں رکھا۔ اور یہی خیال اقبال کا ہے۔ ورنہ حقیقتِ سرمدی سے اتصال کے وہ بھی قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

[۱] اسرارِ خودی [۲] الجیلی الانسان الکامل اردو
[۳] الانسان کامل جلد اول مصر ۱۳۳۴ باب ۱۴ التجلی الصفات ص ۴۱ [۴] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۷

صوفی ذات سرمدی سے اتصال و اتحاد کی بدولت یہ محسوس کرتا ہے کہ زمانِ تسلسل کی کوئی حقیقت نہیں لیکن یہ احوال تا دیر قائم نہیں رہتے۔ بہر حال صوفیہ ہوں یا انبیاء، دونوں طبعی واردات کی دنیا میں واپس آجاتے ہیں۔[۱]

اور یہی اس آیت کا مفہوم ہے۔ وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی[۲]

علامہ اقبال سوال کرتے ہیں کہ ذاتِ الہیہ کے لئے کائنات کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کا خود جواب دیتے ہیں کہ ذاتِ الہیہ کے لئے کائنات کوئی مخصوص حادثہ نہیں کہ اس کا ایک قبل اور ایک بعد ہو اور یہ کائنات اپنی ذات سے آپ قائم ہے کہ اس کا غیر ٹھہرے ورنہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ خالق اور مخلوق دو الگ الگ وجود ہیں۔ اور دونوں مکان کی لامتناہی وسعتوں میں جس کی مثال گویا ایک ظرف کی ہے ایک دوسرے کے مقابل پڑے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ زمان اور مکان اور مادہ بجائے خود ذاتِ الہیہ کی آزادانہ تخلیقی فعالیت کی وہ تعبیریں ہیں جو فکر نے اپنے رنگ میں کی ہیں۔ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں کہ اپنے سہارے آپ قائم رہ سکے وہ محض عقل کے تعینات ہیں۔ جن کے ذریعہ ہمیں حیات الہیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب مشہور صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامی کے حلقہ میں تخلیق کا مسئلہ زیر بحث تھا تو ایک مرید نے ہمارے عام نقطۂ نظر کی ترجمانی یہ کہتے ہوئے بھی بڑی خوبی سے کی ہے کہ ایک وقت تھا جب صرف خدا کا وجود تھا۔ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن اس کے جواب میں شیخ کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ اور بھی زیادہ معنی خیز تھے۔ شیخ نے فرمایا اور اب کیا ہے اب بھی صرف خدا ہی کا وجود ہے۔[۳]

دوسری جگہ اقبال نے اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا۔

بہر کیف میری رائے میں حقیقتِ مطلقہ کا تصور بطور ایک اَنا ہی کے کرنا چاہیئے، اور اس لئے میرے نزدیک انیتِ مطلقہ سے تو انیتوں ہی کا صدور ممکن ہے یا پھر دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انیتِ مطلقہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار جس میں فکر کو فعل کا مترادف سمجھنا چاہیئے۔ ان وحدتوں ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ جن کو ہم اَنا کہتے یا تعبیر کرتے ہیں گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جواہر کی میکانکی حرکت سے ہو وہ یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے سب کی حقیقت ایک عظیم اور برتر انا کے انکشافِ ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا قدرتِ الہیہ کا ہر جوہر خواہ اس کا درجہ ہستی پست ہو یا بلند اپنی ماہیت میں ایک انا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس انیت یا خودی کے اظہار کا بھی اپنا اپنا ایک درجہ ہے؟

---

[۱] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۳۳ [۳] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۰۰-۱۰۱

[۲] قرآن مجید (۵۳ : ۱۴)

پیدا اور تغیر پاتا ہے۔ (ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے (یعنی حقیقت سرمدی آپ خود اپنا انکشاف کر رہی ہے) اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو اسی لئے حقیقتِ مطلقہ کو انسان کی رگِ جان سے قریب تر ٹھیرایا۔ کیونکہ یہ حیاتِ الٰہیہ کا سیلِ رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور اس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور زندگی بسر کرتے ہیں۔ ۵

علامہ اقبال کے ان بیانوں کی روشنی میں کسی توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ تمام شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ جو پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ صوفیانہ واردات اور احوال کو علامہ اقبال نے اسی طرح سمجھا اور دیکھا ہے جس طرح اکابر صوفیا نے سمجھا اور دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحث بھی ایک لفظی نزاع ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کو ارباب فکر نے بہت طول دیا تھا۔ علامہ اقبال نے خود اس تضاد کو رفع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ہم ایک ایسا تصور بھی قائم کر سکتے ہیں جس میں ثبات و تغیر یعنی زمانہ بحیثیت ایک وحدت نامیہ یا بحیثیت دیمومت اور زمانہ بحیثیت مجموعۂ جواہر ایک دوسرے کی ضد نہیں رہتے"۔ ۶

---

۵ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۰۹ - ۱۱۰ ۶ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ لاہور ص ۱۱۶

مطبوعات کانفرنس اکیڈمی

سر سید علیہ الرحمۃ اور ان کے جانشینوں کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی بنیاد ادبِ صالح کی تدوین و اشاعت پر رکھی گئی تھی۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ کام ایجوکیشنل کانفرنس نے کیا۔ کانفرنس کی بنا ۱۸۸۶ء میں ڈالی گئی اور متحدہ ہندوستان میں اس کی ساٹھ سالہ زریں خدمات سے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۱ء میں اس ادارہ کا احیاء کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے کیا گیا جس نے قیام سر سید گرلس کالج جیسی اہم خدمات کے علاوہ ایک "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" قائم کی ہے جس کی طرف سے سہ ماہی مجلہ "العلم" اور بلند پایہ علمی و تعلیمی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔ ان مطبوعات کی اہمیت و افادیت کے بارے میں اکابر ملت اور جرائد کی قدر افزا آرا اور ہمت افزا تبصرے موصول ہوئے ہیں۔ چونکہ فروخت کتب کی کل آمدنی تعلیمی مقاصد میں صرف کی جاتی ہے اس لئے ہمدرد قوم حضرات سے توقع ہے کہ وہ ان کی خریداری کر کے اپنی معارف پروری کا ثبوت دیں گے۔

سید الطاف علی بریلوی

سرسید گرلس کالج لائبریری میں علامہ اقبال پر کتابیں

مرتبہ

آنسہ شمیمہ حافظ، لائبریرین

۱۔ آثارِ اقبال — غلام دستگیر رشید
۲۔ اسرار و رموز — علامہ ڈاکٹر محمدؒ اقبال
۳۔ اسرار و رموز پر ایک نظر — پروفیسر محمدؐ عثمان
۴۔ اسلامی تصوف اور اقبال — ڈاکٹر ابو سعید نورالدین
۵۔ اقبال کا نظریۂ تصوف — بشیر مخفی القادری
۶۔ اقبال اور تصوف — پروفیسر محمدؐ فرمان
۷۔ اقبال اور جمالیات — نصیر احمد ناصر
۸۔ اقبال اور سیاستِ ملی — رئیس احمد جعفری
۹۔ اقبال اور سوشلزم — حنیف رامے
۱۰۔ اقبال اور بھوپال — صہبا لکھنوی
۱۱۔ اقبال اور حیدر آباد دکن — نظر حیدر آبادی
۱۲۔ اقبال ایرانیوں کی نظر میں — خواجہ عبدالحمید عرفان
۱۳۔ اقبال اور عبدالحق (مکتوباتِ اقبال کی روشنی میں) — ڈاکٹر ممتاز حسن
۱۴۔ اقبال اور عشقِ رسالتمآبؐ — سید محمدؐ عبدالرشید
۱۵۔ اقبال — عطیہ بیگم
۱۶۔ اقبال پیامبرِ انقلاب — آغا شورش کشمیری
۱۷۔ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ — قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
۱۸۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ — پروفیسر اے جی نیازی
۱۹۔ اقبال کا علم کلام — سید علی عباس جلال پوری
۲۰۔ اقبال قرآن کی روشنی میں — قاضی محمدؐ ظریف
۲۱۔ اقبال کا نظریۂ اخلاق — پروفیسر سعید احمد رفیق
۲۲۔ اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی — ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی
۲۳۔ اقبال کے آخری دو سال — عاشق حسین بٹالوی
۲۴۔ اقبال کی نئی تشکیل — عزیز احمد
۲۵۔ اقبال اپنے آئینہ میں — رئیس احمد جعفری
۲۶۔ اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جلد اول — سید نذیر نیازی
۲۷۔ اقبال کے صنائع بدائع — نذیر احمد
۲۸۔ اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیبِ اقبال) — مرتبہ شیخ عطاء اللہ
۲۹۔ انوارِ اقبال — بشیر احمد ڈار

۳۰۔ آئینۂ اقبال	محمد عبداللہ قریشی
۳۱۔ باقیاتِ اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۳۲۔ بالِ جبریل	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۳۳۔ بانگِ درا	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۳۴۔ تلمیحاتِ اقبال	سید عابد علی عابد
۳۵۔ خوشحال و اقبال	پیر عبدالصمد خاں
۳۶۔ دانائے راز	واجد رضوی
۳۷۔ روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۳۸۔ روزگارِ فقیر حصہ اول و دوم	فقیر سید وحید الدین
۳۹۔ سرودِ رفتہ	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۴۰۔ صریرِ خامہ	مولانا صلاح الدین احمد
۴۱۔ ضربِ کلیم	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۴۲۔ عرفانِ اقبال اور افاداتِ نیازمی	بشیر محنتی القادری
۴۳۔ علامہ اقبال اور اُن کی پہلی بیوی (یعنی والدہ آفتاب احمد)	حافظ مخدوم سید حامد جلالی
۴۴۔ علامہ اقبال	آقائی مجتبیٰ مینوی مترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
۴۵۔ علامہ اقبال اور تصوف	پروفیسر سید محمد عبدالرشید
۴۶۔ فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
۴۷۔ فکرِ اقبال	غلام دستگیر
۴۸۔ فلسفۂ اقبال	بزمِ اقبال
۴۹۔ قرآنی تصوف اور اقبال	پروفیسر شاہ محمد عبدالغنی
۵۰۔ کلیدِ اقبال	ملک نذیر احمد (مرتب)
۵۱۔ مطالعۂ اقبال	گوہر نوشاہی
۵۲۔ مطالعاتِ اقبال	اسلم ملک
۵۳۔ مقالاتِ حکیم جلد دوم (اقبالیات)	شاہد حسین رزاقی
۵۴۔ مقالاتِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ
۵۵۔ میرے لالہ فام۔ علامہ اقبال پر مقالات کا مجموعہ	جاوید اقبال
۵۶۔ نگار، اقبال نمبر	
۵۷۔ آئینۂ اقبال	محمد عبداللہ قریشی
۵۸۔ اقبال کے تعلیمی نظریات	محمد احمد صدیقی
۵۹۔ کلیاتِ اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۶۰۔ اقبال باکمال	مرتبہ ملک نذیر احمد
۶۱۔ شرح بالِ جبریل	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۶۲۔ شرح ضربِ کلیم	〃 〃 〃 〃
۶۳۔ شرح جاوید نامہ	〃 〃 〃 〃
۶۴۔ شرح پیامِ مشرق	〃 〃 〃 〃
۶۵۔ شرح بانگِ درا	〃 〃 〃 〃
۶۶۔ شرح زبورِ عجم	〃 〃 〃 〃
۶۷۔ پیامِ مشرق	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۶۸۔ ارمغانِ حجاز	〃 〃 〃 〃
۶۹۔ زبورِ عجم	〃 〃 〃 〃
۷۰۔ جاوید نامہ	〃 〃 〃 〃
۷۱۔ مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر	〃 〃 〃
۷۲۔ روحِ مشرق (پیامِ مشرق کا اردو زبان میں منظوم و مکمل ترجمہ)	عبدالرحمٰن طارق
۷۳۔ ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک
۷۴۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام	عبدالرحمٰن سعید
۷۵۔ اقبال کی شاعری	مولانا عبدالمالک آروی

۷۶۔ خطباتِ اقبال	رضیہ فرحت بانو	۹۱۔ مقامِ اقبال	اشفاق حسین
۷۷۔ حیاتِ اقبال	مرتبہ عنایت اللہ	۹۲۔ شادِ اقبال	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۷۸۔ اقبال، امامِ ادب	رئیس احمد جعفری	۹۳۔ ملفوظاتِ اقبال	محمود نظامی
۷۹۔ اقبال نامہ	چراغ حسن حسرت	۹۴۔ اقبال کا تصورِ زمان و مکان	ڈاکٹر رضی الدین
۸۰۔ رومیِ عصر شرح احوال و آثارِ علامہ محمد اقبال	خواجہ عبدالحمید عرفانی	۹۵۔ رموزِ فطرت منظوم اور ترجمہ ارمغانِ حجاز	عبدالرحمن طارق
۸۱۔ مکتوباتِ اقبال	سید نذیر نیازی	۹۶۔ جوہرِ اقبال	،، ،،
۸۲۔ سیرتِ اقبال	محمد طاہر فاروقی	۹۷۔ افقبال	سید اختر احمد اختر اورینوی
۸۳۔ یادِ اقبال	غلام سرور فگار	۹۸۔ شرح اسرارِ خودی	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۸۴۔ مقالاتِ یومِ اقبال	مرتبہ قومی کتب خانہ	۹۹۔ شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۸۵۔ جہانِ اقبال	عبدالرحمن طارق	۱۰۰۔ شرح ارمغانِ حجاز	
۸۶۔ اشاراتِ اقبال	،، ،،	۱۰۱۔ رختِ سفر (شاعرِ مشرق کا غیر مدون کلام)	محمد انور حارث
۸۷۔ اقبالِ کامل	مولانا عبدالسلام ندوی	۱۰۲۔ اقبال	رئیس امروہوی
۸۸۔ اقبال خواتین کی نظر میں	بیگم امروہوی	۱۰۳۔ نقدِ اقبال	میکش اکبرآبادی
۸۹۔ حرفِ اقبال	لطیف احمد شروانی	۱۰۴۔ اقبال اور آرٹ	لطیف فاروقی
۹۰۔ معارفِ اقبال	عبدالرحمن طارق	۱۰۵۔ شرح رموزِ بیخودی	پروفیسر یوسف سلیم چشتی

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں
اقبال

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں ہوں
غلام طغرل و سنجر نہیں ہوں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں ہوں
اقبال

106. The Place of God, man and universe in the Philosophic System of Iqbsl, by Dr. Jamila Khatoon.

107. Introduction to the thought of Iqbsl, by Luce - Claude Maitre.

108. Iqbal's Gulshan-i-Raz-i-Jadid and Bandagi Nama. English Translation, by Bashir Ahmad Dar.

109. Thoughts and Reflections of Iqbal, Edited by Syed Abdul Vahid.

110. The Metaphysics of Iqbal, by Dr. Ishrat Hasan Enver.

111. The Secrets of the Self (Asrar-e-Khudi), by Dr. Sir Mohd. Iqbal.

112. Letters and Writings of Iqbal, Edited and Compiled by Bashir Ahmad Dar.

113. A Voice from the East. (The Poetry of Iqbal), by Zulfiqar Ali Khan.

114. Pilgrimage of eternity. (Iqbal's Javed Nama), by Sheikh Mohd. Ahmed.

115. Iqbal as a Thinker, Edited by Mohammed Ashref.

116. Iqbal's Educational Philosophy, by K. G. Saiyidain

117. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, by Dr. Mohammad Iqbal.

118. Letters of Iqbal to Jinnah, Edited by Muhammed - Ashref.

علامہ اقبال کی آخری علالت

از

جناب سید نذیر نیازی صاحب

۱۹۳۴ء کا ذکر ہے۔ عید الفطر کا دن تھا۔ ۱۰ جنوری۔ لاہور کے ہر گلی کوچے میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ حضرت علامہ بھی نہایت مسرور تھے۔ ان کا معمول تھا کہ اس مبارک تقریب پر ہمیشہ احباب کے ساتھ نماز کے لئے تشریف لے جاتے۔ چودھری محمد حسین صاحب سے رات ہی سے کہہ رکھا تھا۔ ان کے آنے پر گاڑی منگوائی گئی۔ اور حضرت علامہ چودھری صاحب، جاوید سلمۂ اور علی بخش[لہ] کے ساتھ شاہی مسجد روانہ ہو گئے۔

علی بخش کہتا ہے ۱۰ جنوری کا دن نہایت سرد تھا۔ صبح ہی سے تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حضرت علامہ لباس کے معاملہ میں نہایت بے پروا تھے۔ سوٹ اسی وقت پہنتے جب کوئی خاص مجبوری ہوتی گلوبند سے تو خیر انہیں نفرت تھی ہی، موزے بھی استعمال کرتے تو نہایت باریک۔ بالعموم شلوار، کوٹ اور پگڑی ہی میں باہر تشریف لے جاتے۔ اس روز بھی ان کا لباس یہی تھا۔ علی بخش کا خیال ہے کہ حضرت علامہ کو موٹر میں کمتے جاتے ہوا لگی۔ اس پر طرہ یہ کہ جاڑے کی شدت سے زمین یخ ہو رہی تھی۔ جن حضرات نے شاہی مسجد کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ دروازے سے محراب تک کتنا فاصلہ ہے۔ حضرت علامہ کو دو بار صحن مسجد سے گذرنا پڑا۔ اور دونوں بار ان کے پاؤں نے سردی محسوس کی۔ واپس آئے تو حسب عادت سویاں کھائیں۔ پنجاب میں شیر خرما کا رواج بہت کم ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ سویاں اُبال کر رکھ دیں اور پھر جب جی چاہا ان میں دودھ اور شکر کا اضافہ کر لیا۔ لیکن حضرت علامہ نے اپنے والد ماجد مرحوم کی تقلید میں دودھ کے بجائے دہی استعمال کیا۔ عید کا دن تو خیر آرام سے گذر گیا لیکن اگلے ہی روز ان کو نزلہ کی شکایت ہو گئی۔ حضرت علامہ کا گلا بچپن ہی سے خراب رہتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے آج سے ۱۹-۲۰ برس پہلے جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت بھی وہ ہر منٹ دو منٹ کے بعد زور سے کھنکارتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ حکیم فقیر محمدؒ صاحب مرحوم نے عرصہ سے تاکید

[لہ] حضرت علامہ کا معتمد اور وفا شعار ملازم

کہ رکھی تھی کہ دودھ اور ہر اس شے سے جو دودھ سے بنی ہو پرہیز کریں۔ لہٰذا اس موقع پر بھی انہیں قدرتاً خیال ہوا کہ یہ سردی میں دہی کھانے کا اثر ہے۔ جو دو چار دن میں جاتا رہے گا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ دوا کے استعمال کے باوجود انہیں بہت کم فائدہ ہوا۔ علی بخش معمولاً ان کی خواب گاہ کے پاس ہی بڑے کمرے میں سویا کرتا تھا وہ کہتا ہے اس تکلیف کو شروع ہوئے پندرہ دن گذرے تھے کہ ایک شب کو دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اس وقت کوئی دو ڈھائی کا عمل ہوگا کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب چارپائی پہ بیٹھے کھانسی سے بے حال ہو رہے ہیں۔ صبح تک یہی حالت رہی اب کی ان کے لئے مسہل تجویز کیا گیا پھر ایسا ہوا کہ کھانسی تو جاتی رہی مگر گلا بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ایک نہیں متعدد علاج ہوئے۔ اطباء اور ڈاکٹروں نے جو تدبیر سمجھ میں آئی کی۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتے لگتا تھا کہ حضرت علامہ بالکل تندرست ہیں لیکن گلے کو نہ ٹھیک ہونا تھا نہ ہوا۔ معلوم نہیں ان کا مرض کیا تھا کہ اس کے سامنے تمام کوششیں اکارت ہوگئیں۔

میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ اور ان حالات سے بالکل بے خبر۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ کی دعوت پر توسیعی خطبات کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خواہش تھی کہ سال گذشتہ کی طرح ان میں سے کسی ایک کی صدارت حضرت علامہ بھی کریں۔ یوں بھی جامعہ کا ہر طالب ان کی زیارت کا مشتاق تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ذاکر کی فرمائش پر ایک عریضہ میں نے بھی ان کی خدمت میں لکھا اس کا جواب موصول ہوا تو میں نے تعجب سے دیکھا کہ والا نامہ حضرت علامہ ہی کا ہے مگر تحریر کسی دوسرے ہاتھ کی مضمون یہ تھا۔

میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے اس لئے ڈاکٹر وہبی کے لیکچر کی صدارت سے معذور ہوں۔ ڈاکٹر انصاری کا تار بھی آیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر کا خط بھی اس مطلب کا آیا ہے آپ انہیں اطلاع دیدیجئے گا۔ لاہور آنے کا ارادہ ہو تو اس وقت تشریف لائیں جب میں اچھا ہو جاؤں۔ ۱۲ر فروری ۳۲ء

اس غیر متوقع خبر کو سن کر مجھے بھی تشویش ہوئی۔ کیونکہ حضرت علامہ نے خط صرف اس وقت اپنے ہاتھ سے لکھنا چھوڑا۔ جب نزول الماء کی تکلیف سے پچھلے برس ان سے پڑھنا لکھنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا۔ میں نے خیریت مزاج دریافت کی تو کچھ روز کے بعد اس کا جواب علامہ نے خود مرحمت فرمایا۔

ڈاکٹر بہجت وہبی سے مل نہ سکنے کا افسوس ہے۔ میں کئی دنوں سے علیل ہوں انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ اب صرف گلے کی شکایت باقی ہے۔" ۲۷ر فروری

بظاہر یہ خط میرے اطمینان کے لئے کافی تھا۔ اور اس کے بعد حضرت علامہ نے اپنی بیماری کی طرف

کوئی اشارہ نہیں کیا۔ لیکن آخر اپریل میں جب مجھے کچھ دنوں کے لئے لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضرت علامہ بدستور علیل ہیں۔ وہ اس وقت اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کی نشستگاہ میں بیٹھے تھے اور اُن کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آواز نہایت کمزور تھی جیسے کوئی سرگوشیاں کرتا ہو۔ اٹھتے بیٹھتے ہر ضعف و نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے باادب عرض کی۔ "ڈاکٹر صاحب یہ کیا ماجرا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا آپ بالکل اچھے ہو گئے" فرمایا "کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کئی ایک علاج ہوئے لیکن گلے کی تکلیف بدستور قائم ہے۔ ممکن ہے مقامی خرابی ہو۔ ممکن ہے نقرس کا اثر"۔ میں نے زیادہ تفصیل سے حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا۔ اول کھانسی تھی پھر گلا بیٹھ گیا۔ اس کے لئے غرغرے تجویز ہوئے دوائیں لگائی گئیں مگر بے سود۔ آخر رائے یہ ٹھہری کہ ایکس رے (X RAY) کرایا جائے۔ ایکس رے ہوا تو پتہ چلا کہ قلب کے اوپر ایک رسولی پڑ رہی ہے۔ کیونکہ یہ علامت نہایت خطرناک تھی۔ اس لئے کچھ دنوں کے بعد اس عمل کا تکرار ہوا اور اب کے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ان کی زندگی خطرہ میں ہے۔ بہتر ہوگا "ڈاکٹر صاحب" وصیت کر دیں۔ میں نے ان حالات کو سُن کر عرض کیا کیوں نہ حکیم نابینا صاحب سے مشورہ کر لیا جائے۔ ۱۹۲۸ء میں جب ڈاکٹر صاحبان کی آخری اور قطعی رائے تھی کہ جراحت کے سوا گردوں کا اور کوئی علاج نہیں تو یہ انہیں کی معجز نما دواؤں کا اثر تھا کہ آپ کو شفا ہوئی۔ فرمایا "عجیب بات ہے مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تم دہلی جاؤ گے تو سب حالات ان کی خدمت میں عرض کرنا۔ ممکن ہوا تو ایک آدھ روز کے لئے میں بھی چلا آؤں گا۔"

اس زمانہ میں لاہور میں میرا قیام کوئی ہفتہ دو ہفتہ رہا۔ اور میں نے دیکھا کہ طرح طرح کی دواؤں کے باوجود حضرت علامہ کی صحت میں کوئی خاص تغیر نہ ہوا۔ ایک دن حفیظ جالندھری عیادت کے لئے آئے میں بھی موجود تھا انہوں نے مزاج پرسی کی تو حضرت علامہ نے اشارے سے پاس بلا لیا اور پھر یہ شعر پڑھا۔

سخن اے ہمنشیں از من چہ پرسی
کہ من با خویشتن دارم گفت گوئے

ان باتوں کو سن کر اگرچہ ہر شخص کو تشویش ہوئی مگر ان کے نیازمند کیا کر سکتے تھے۔ ان کے پاس بجز دعا کے اور تھا ہی کیا۔ غرض کہ میں ان حالات میں دہلی واپس آیا اور آتے ہی حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب قبلہ بڑی عنایت سے پیش آئے۔ میں نے حضرت علامہ کے مرض کی ساری کیفیت بیان کی تو بہت متردد ہوئے اور پھر دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگے "نیازی صاحب، گھبرائیے نہیں بیشک "ڈاکٹر صاحب" کے اعصاب کمزور ہیں اور ان کا قلب بھی ضعیف ہے لیکن مجھے ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق نہیں۔ آپ انہیں اطمینان دلائیے میں نسخہ تجویز کئے دیتا ہوں انشاءاللہ

بلاصحت ہوئی!" بس یہ دن تھا جب حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع ہوا اور باوجود طرح طرح کے قیمتی شوروں اور تدابیر کے جو ہمی ادر یرانی طب کے ماہرین نے کیں وہ آخر خام رہا۔ حقیقتاً انہیں جس قدر بھی فائدہ ہوا، حکیم صاحب کے علاج ہی سے ہوا۔ اور جب ان کی تدابیر ناکام ثابت ہوئیں تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔

حضرت علامہ نے حکیم صاحب کی دواؤں کے ساتھ مزید احتیاط یہ کی کہ جدید طریقہ ہائے تشخیص سے برابر امداد لیتے رہتے اور پھر ان کے نتائج سے بلا کم و کاست مجھے اطلاع کر دیتے۔ میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سب حالات بیان کر دیتا۔ اس اثنا میں ڈاکٹروں نے کئی نظریئے قائم کئے، مگر حکیم صاحب اپنے خیال پر جمے رہے۔ ان کا ارشاد تھا، "ڈاکٹر صاحب کے اعصاب میں برودت ہے۔ قلب ضعیف، جگر میں حدت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کو ہلکا سا دمہ ہے۔ ڈاکٹروں نے بلغم کے انجماد کو غلطی سے رسولی سمجھ لیا ہے۔" راقم الحروف کو اگرچہ فنی اعتبار سے رائے زنی کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن اتنا مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر لفظی اختلافات سے قطع نظر کر لی جائے تو بعد کے امتحانات سے حکیم صاحب ہی کی تشخیص کم و بیش صحیح ثابت ہوگی۔ حضرت علامہ ۹ مئی ۱۹۳۴ء کے عنایت نامہ میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلۂ صوت (LARYNX) ہے اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے۔ چار ماہ تک علاج ہوا کچھ خاص فائدہ اس سے نہ ہوا۔ جسم کی کمزوری بڑھ گئی ہے۔ درد گردہ اور نقرس کا حال تو حکیم صاحب کو خود ہی معلوم ہے۔ بعض ڈاکٹر کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر بھی گلے پر پڑ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔"

پھر فرماتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے مزید معائنہ کیا ہے ...... ایکسرے فوٹو لئے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دل کے اوپر کی طرف ایک نئی (GROWTH) ہو رہی ہے جس سے (VOCAL CHORD) متاثر ہے۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج الیکٹرک ہے۔ اور بہترین الیکٹرک علاج یورپ ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک تمام اندرونی اعضا اچھی حالت میں ہیں۔ اندیشہ ہے پھیپھڑوں پر اثر نہ پڑے ......
لیکن میں اس سے پہلے ہی مغربی اطبا کا امتحان کر چکا ہوں۔ حکیم صاحب سے مشورہ کئے بغیر یورپ نہ جاؤں گا۔ یورپ کے علاج پر روپیہ صرف بھی نہیں کر سکتا۔" ——— ۳ جون

ابھی میں ان باتوں کو حکیم صاحب کے گوش گذار نہ کرنے پایا تھا کہ اگلی صبح کو ان کا دوسرا خط موصول ہوا۔
"دو دفعہ ڈاکٹروں نے خون کا معائنہ کیا۔ پہلی دفعہ خون باسلیق سے لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ

ان میں ہر قسم کے جراثیم موجود ہیں۔ دوسری دفعہ انگلی سے لیا گیا اور نتیجہ یہ کہ حالت بالکل نارمل ہے۔"

——— ۱۰ر جون

میں اس اثنا میں حکیم صاحب کے مشورے سے ایک عریضہ لکھ چکا تھا اس کے جواب میں فرمایا۔

"آپ کا خط ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میرے تمام احباب کو تشویش ہے اور معالجوں کو بھی مگر میں خود حکیم صاحب پر کامل اعتماد رکھتا ہوں اور موت و حیات اللہ کے ہاتھ سمجھتا ہوں .... ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ فوراً لندن یا ویانا جانا چاہیے...... ان کے نزدیک اس (GROWTH) کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں ہے.......... کیا آپ نے حکیم صاحب اور اپنے امریکن دوست سے اس کا ذکر کیا؟ ...... کل شام ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر حکیم صاحب کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا دوسرا معجزہ ہوگا۔" ——— ۵ر جون

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان کے نزدیک حضرت علامہ کا مرض کس قدر خطرناک تھا۔ لہذا انہیں باربار مشورہ دیا جا رہا تھا کہ یورپ یا انگلستان تشریف لے جائیں۔ میں نے حکیم صاحب کی طرف سے ایک تسلی آمیز خط لکھا تو جواب آیا۔

"تشویش صرف اس بات کی تھی کہ دل کے اوپر جو خالی AREA ہے۔ وہاں ڈاکٹر ایکس رے کی تصویر سے ایک GROWTH بتلاتے ہیں جس کا علاج ایکسرے اکسپوزر (EXPOSURE) یا ریڈیم ہے جو یورپ ہی میں میسر آئے گا۔ اب معلوم ہوا کہ بحث مباحثہ کے بعد ان میں بھی اختلاف ہے۔" ۸ر جون

ویسے حکیم صاحب کی دواؤں سے فائدہ ہو رہا تھا جیسا کہ حضرت علامہ نے اسی والا نامہ میں اعتراف کیا "میری عام صحت بہت اچھی ہے۔ صرف آواز اونچی نہیں نکل سکتی۔ میں چاہتا ہوں خود حاضر ہو کر حکیم صاحب کی خدمت میں تمام حالات عرض کر دوں۔"

لہٰذا ۱۱ر جون کی صبح کو حضرت علامہ حکیم صاحب سے مشورہ کی خاطر ایک روز کے لئے دہلی تشریف لائے۔ اور حکیم صاحب نے انہیں دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا۔ حضرت علامہ بھی نہایت خوش و خرم واپس گئے۔ اب کے جو دوا تجویز ہوئی اس کے اثرات کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"آج ساتواں روز ہے۔ میں صبح کی نماز کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں...... بلغم ناک کی راہ سے بھی نکلتا ہے ...... آواز میں فرق ضرور آگیا ہے مگر نمایاں طور پر نہیں.... گلے میں خارش معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں یہ صحت کی علامت ہے۔ واللہ اعلم .... میرے تمام احباب منتظر ہیں کہ دیکھیں کب ڈاکٹروں کو شکست ہوتی ہے۔" ——— ۱۸ر جون

اب حضرت علامہ کی صحت بتدریج ترقی کر رہی تھی اور لاہور میں اسے طب کا ایک معجزہ تصور کیا جاتا تھا اسی طرح لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ گویا سوال حضرت علامہ کی صحت کا نہیں تھا۔ بلکہ قدیم اور جدید کے تصادم کا۔ حضرت علامہ خود فرماتے ہیں۔

"آواز میں جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں فرق آگیا ہے۔ عجیب معاملہ ہے جس سے انسانوں کے ضمیر میں جو کچھ گذر رہا ہے اس کا پتہ چلتا ہے۔ بعض لوگ میری بیماری سے محض اس بات سے دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں کہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے۔ ...... اب کی دفعہ دوا اور زیادہ طاقتور ہو تو اچھا ہے، تاکہ معجزہ کا ظہور جلد ہو" ——— ۱۸ر جون

مختصراً یہ کہ حکیم صاحب قبلہ کا علاج یہاں تک کامیاب ہو رہا تھا کہ حضرت علامہ نے سفر کا پروگرام مرتب کرنا شروع کر دیا۔ روڈز لیکچرز کے سلسلے میں ایک آکسفورڈ سے پہلے ہی دعوت آچکی تھی۔ پھر جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے ان سے تشریف آوری کی درخواست کی اور اس کے بعد:

"جرمنی سے خط آیا ہے کہ ترکی کی طرف سے بھی دعوت آنے والی ہے۔ بہرحال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے

برآور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے، نالۂ، آہ و فغانے ——— ۲۰ جون

لیکن صحت کی اس تدریجی ترقی کے ساتھ حضرت علامہ نے پرہیز کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس معاملہ میں ان کا مزاج بڑا نازک تھا۔ یوں وہ کوئی بہت زیادہ کھانے والے نہیں تھے۔ مگر کھانے پینے کی چیزوں میں شاعری تو کر سکتے تھے اُن کا برسوں سے معمول تھا کہ رات کو صرف دودھ دہی پر ہی اکتفا کرتے اور جی چاہتا تو کشمیری چائے بھی استعمال کر لیتے۔ اس موقع پر حضرت علامہ کے نیاز مند بالائی کی تقسیم پر خوب خوب لڑا کرتے تھے۔ دہی ہوئی بالائی ہی جتنی بالائی جو عام طور سے دودھ میں ہوتی ہے اُن کا کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا۔ یعنی گوشت میں پکی ہوئی سبزی ناشتہ صرف لسی یا ایک آدھ بسکٹ اور چائے کا ہوتا اور وہ بھی روزمرہ نہیں۔ خوراک کی مقدار بھی کم تھی اور اس اہتمام اس سے بھی کم۔ آخری دنوں میں جب بچوں کی جرمن اتالیق آگئی ہے تو ان کی تربیت کے خیال سے میز ہی کا انتظام کیا گیا۔ یہ چیزیں موجود تو تھیں مگر اتفاقی ضروریات کے لئے اور حضرت علامہ بھی ان کے ساتھ کھانے پر شریک ہونے لگے۔ مگر صرف دو ہی تین دن میں اپنی عادت سے مجبور ہو جاتے فرماتے "علی بخش" میرا کھانا لگ دے آؤ علی بخش پانی اور چلمچی لئے کمرے میں داخل ہوا۔ حضرت علامہ بیٹھے لیٹے اٹھ بیٹھے اور وہیں پلنگ پر نشست جاتی۔ تولیہ یا رومال زانوؤں پر ڈال لیا۔ علی بخش نے کھانے کی کشتی سامنے رکھ دی۔ احباب میں سے اگر کوئی صاحب بیٹھے ہیں تو انہوں نے آپ کی تسبیح کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ ہاں اگر کھانے کے بعد جلد آگئے تو وہ

بااصرار ہر شخص کو ان میں شریک کر لیتے۔ یہ تھا ان کے کھانا کھانے کا انداز اور ہر چند کہ اس میں تکلف یا اہتمام کو کوئی دخل نہ تھا۔ مگر ان کی رائے تھی کہ جو چیز بھی کھائی جائے خوش مذاقی سے کھائی جائے اس کا ذائقہ عمدہ ہو۔ رنگ اور بو خوشگوار ہو۔ ترشی اور سرخ مرچ انہیں بہت پسند تھی۔ پھلوں میں آم کے تو گویا عاشق تھے۔ غذاؤں میں کباب اور بریانی خاص طور سے مرغوب تھی۔ فرمایا کرتے تھے یہ "اسلامی غذا" ہے۔ گرمیوں میں برف کے استعمال کو ہر شخص کا جی چاہتا ہے لیکن حکیم صاحب نے گلے کی تکلیف کے خیال سے منع کر رکھا تھا۔ حضرت علامہ بار بار پوچھتے کہ برف کے متعلق کیا رائے ہے۔ ایک دفعہ لکھا مکہ شریف سے ایک شخص صراحی لایا تھا۔ اسی میں پانی ٹھنڈا کر لیتا ہوں مگر جب صحت کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو استفسارات کی بھرمار ہونے لگی۔ اب مزاج میں بھی لطافت اور شگفتگی آ چلی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حکیم صاحب قبلہ سے کہئے آپ انصار ہیں، میں مہاجرین میں سے ہوں کیونکہ میں نے زمانہ حال سے خیر القرون کی طرف ہجرت کی ہے، مدنی نہیں تو دماغی اعتبار ہی سے سہی۔ اس واسطے میرا ان پر حق ہے اور میں ان سے اسی سلوک کا متوقع ہوں جو انصار نے مہاجرین سے کیا تھا۔ میری عمومی صحت بہت اچھی ہے۔ نیند رات کو خوب آ گئی۔ البتہ آواز کھلنے کی آواز معدے سے آج چلغوزہ کھایا ہے۔ تازہ انجیر کی تلاش جاری ہے۔ سردی کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا لیکن ترشی کے لئے ترس گیا ہوں۔ لیمو کو تو ہاتھ نہیں لگاتا مگر کیا کسی اور قسم کا اچار بھی منع ہے۔ دہی کی اجازت حکیم صاحب نے دی تھی۔ ایک روز دہی کا رائتہ کھایا۔ مگر اس قدر میٹھا تھا کہ لطف نہ آیا۔ پودینہ اور انار دانہ کی چٹنی کے لئے کیا حکم ہے؟" ـــ ۲۰ جون

حکیم صاحب قبلہ ان تحریروں کو سنتے اور سن سن کر کبھی ہنستے کبھی مسکراتے۔ ان کے منہ سے حضرت علامہ کے لئے سینکڑوں دعائیں نکلتی تھیں اور وہ ان خطوں پر اس مزے کی گفتگو کرتے کہ گھنٹے دو گھنٹے ان کے یہاں خوب صحبت رہتی۔ ان کا قاعدہ تھا کہ حضرت علامہ کی فرمائشوں کا حتی الوسع خیال رکھتے۔ مغزیات اور پھلوں کے استعمال کی انہوں نے خاص طور پہ ہدایت کر رکھی تھی۔ یوں بھی ان کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کی غذا نہایت زود ہضم اور مقوی ہونی چاہیئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کبھی کبھی بدپرہیزی بھی کر لیتے۔ ۲۱ جون کے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں :-

"آواز میں کوئی فرق نہیں بلکہ ترقی معکوس ہے۔ اس کے سبب تین ہو سکتے ہیں۔

(۱) میں نے دہی کھایا اور لسی پی (۲) فالودہ پیا (برف ڈال کر) (۳) دوا کی خوراک بڑھ جانے سے تو ایسا نہیں ہوا؟"

ایک دوسرا خط ہے۔

"ہر چیز کے متعلق فرداً فرداً دریافت کیجئے۔ چائے، سبزی، پھل، گوشت، شربت وغیرہ علیٰ ہذا چاول، خشکہ، پلاؤ، شہد" ـــ ۲۷ جون

تقریباً یہی انداز طبیعت ان کا دواؤں کے متعلق تھا۔ دوا جو بھی ہو لطیف ہو، خوش ذائقہ ہو، خوش رنگ ہو بو ایسی کہ ناگوار نہ گذرے، خوراک کم اور مؤثر۔ لیکن چونکہ حکیم نابینا صاحب کی دوائیں اس معیار پر پوری اترتی تھیں اس لئے ان سے زیادہ تر اختلاف کھانے پینے کی چیزوں میں ہوتا۔ وہ کہتے ڈاکٹر صاحب کے لئے مغز عصفور یا مغز خرگوش بہت مفید رہے گا۔ حضرت علامہ فرماتے مغز اور اس کا استعمال؟ معاذ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے تو اس کے دیکھنے ہی سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ میں گوشت تو کھا لیتا ہوں مگر دل، گردہ، کلیجی وغیرہ کبھی نہیں کھائی۔ حکیم صاحب تدبیریں سوچتے۔ اگر مغز کو شوربے اور چاول میں ملا دیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں چلے گا۔ میں علی بخش کو الگ خط لکھتا مگر علی بخش کی تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی۔ کہ وہ کوئی کام حضرت علامہ کے خلاف منشا نہ کر سکتا۔ وہ فوراً کہہ دیتا۔ نیازی صاحب نے اس طرح کا خط بھجوایا ہے۔ حضرت علامہ ان باتوں کو سنتے۔ اور سنتے ہی مجھے لکھ دیتے کہ اگر مغز کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے تو کیوں نہ اس کا جوہر تیار کر لیا جائے۔

غرض کہ ایک ہی مہینے کے اندر حکیم صاحب کی دواؤں سے وہ فائدہ ہوا کہ حضرت علامہ شدید گرمیوں کے باوجود سفر کے لئے طیار ہو گئے۔ اب کے قصد سرہند کا تھا اور تقریب اس کی یہ کہ:۔

"چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے پیغام دیا ہم نے جو خواب تمہارے اور امیر شکیب ارسلان کے متعلق دیکھا تھا۔ اسے سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے اللہ تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔ مزید برآں جاوید جب پیدا ہوا تو میں نے عہد کیا تھا کہ ذرا بڑا ہو لے تو حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا"۔ ۲۹ر جون

چنانچہ ۲۹ر جون کی شام کو حضرت علامہ سرہند تشریف لے گئے اور ۳۰ کی شام کو واپس آ گئے۔ تاثرات سفر کے متعلق ان کے بعض عنایت ناموں کے اقتباسات یہ ہیں:۔

"نہایت عمدہ پاکیزہ اور پر فضا جگہ ہے۔ انشاء اللہ پھر بھی جاؤں گا"۔ ۲ جولائی

"مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے۔ سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا۔ جس کی بنا حضرت عمرو بن العاص نے رکھی تھی۔ اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانہ تک بحال تھا۔ اور موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا"۔ ۳ر جولائی

رفتہ رفتہ حضرت علامہ کی صحت اس قدر اچھی ہونے لگی کہ ڈاکٹروں کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی، ۵ر جولائی کا خط ہے:

"۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ ٹیومر یا گروتھ کا نظریہ صحیح نہیں۔ کیونکہ آپ کی صحت اور دوسرے حالات سے مطابقت نہیں کھاتا۔ اگر ٹیومر یا گروتھ ہوتی تو عام صحت اس قدر اچھی نہ ہوتی بلکہ اس کی حالت

روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی۔"

پھر لکھتے ہیں:

"یہ بات اب یقینی ہو گئی ہے کہ ٹیومر یا گروتھ نہیں۔ صرف شاہ رگ کا پھیلاؤ ہے، یا تو خون کے سمی مادوں کی وجہ سے یا نفس کے زیادہ استعمال سے بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی یہ شکایت ہو جاتی ہے۔" ——— ۱۱ر جولائی

"میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ٹیومر کا نظریہ ایکس رے نے غلط ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں گو ٹیومر نہیں عام شاہ رگ کا پھیلاؤ ہے اور یہ بھی ایک قسم کا SWELLING ہے۔ ان کی رائے میں یہ مرض خطرناک نہیں لیکن آواز کا طبعی حالت میں عود کرنا مشتبہ ہے .... اس کا علاج صرف یہ ہے کہ موجودہ آواز پر اکتفا کی جائے اور شاہ رگ کے مزید پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعہ روکا جائے۔" ——— ۱۳ر جولائی

گویا قدیم اور جدید کے درمیان جو تصادم مہینوں سے جاری تھا اس کا خاتمہ بالآخر قدیم ہی کی فتح پر ہوا۔ حکیم نابینا صاحب کے اس اعجاز کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ اس اثنا میں حضرت علامہ خود بھی اظہار تشکر کے لئے دہلی تشریف لائے۔ ان کی بیماری کو اب کم و بیش چھ مہینے گذر چکے تھے۔ شروع کے چار مہینوں میں ایلوپیتھک علاج ہوتا رہا۔ حکیم صاحب کی تدابیر کا نتیجہ یہ تھا کہ:-

"اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس ۶ ماہ کی بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا۔ کیوں کہ اس بیماری نے حکیم صاحب کی وہ ادویہ استعمال کرنے کا موقعہ پیدا کیا جنہوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا کہ تمام عمر میری صحت کبھی ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے۔" ——— ۲۳ر جولائی

لیکن حکیم صاحب کی اس معجز نما کامیابی کے باوجود آواز کا مسئلہ جوں کا توں قائم رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب گلے کی حالت بہتر تھی اور آواز بھی نسبتاً بڑھ گئی تھی۔ جیسا کہ حضرت علامہ خود فرماتے ہیں:-

"آواز کچھ رو بہ صحت معلوم ہوتی ہے مگر اس کی ترقی نہایت خفیف ہے۔ خدا جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ میں نے پھیپھڑوں اور دل کا معائنہ دوبارہ کرایا ہے۔ سب کچھ درست ہے حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے۔ کہ آپ کے روحانی اثر کی ضرورت ہے! انگلستان جاؤں گا۔" ۶ر اگست

لیکن آواز کا دھیما پن بدستور قائم رہا۔ اب حضرت علامہ نے گھبرا کر دواؤں کے متعلق رائے زنی کرنا شروع کر دی۔ یہ دوا ٹھیک نہیں ہے۔ اُس دوا سے فائدہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ نئی گولیاں کس شکایت کے لیے ہیں۔ انہیں گھلا کر استعمال کروں؟ گھلا کر استعمال کرنا مشکل ہے۔ فلاں دوا کی مقدار کیوں نہ بڑھا دی جائے اس کی

کیا وجہ ہے کہ دوسرے ہفتے آواز پر کوئی اثر نہیں پڑا؟ کیا آپ میرے خط حکیم صاحب قبلہ کو سُنا دیتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کئی ایک باتیں جواب طلب ہیں۔ آپ بھول گئے یا حکیم صاحب ہی نے خیال نہیں کیا؟" اور ماحصل اس تمام پریشانی کا یہ کہ

"دو ماہ میں آواز نے کوئی خاص ترقی نہیں کی اس واسطے ڈاکٹر صاحبان تسلیں بجا رہے ہیں کہ آواز درست نہ ہوگی۔ میں کبھی کبھی مایوس ہو جاتا ہوں۔ مگر حکیم صاحب کی توجہ اور دعائیت پر بھروسہ رکھتا ہوں" ـــــ ۱۸ر اگست

ایک طرف صحت کی عمدگی کی یہ کیفیت :۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے مگر تعجب ہے آواز میں کوئی تبدیلی نہیں" ۳ر ستمبر

دوسری جانب آواز کی پستی غرضکہ حضرت علامہ گھبرا گئے۔ ڈاکٹر انہیں یورپ کے سفر پر آمادہ کر رہے تھے، لیکن حضرت علامہ کو شاید خود بھی جدید طریقہ ہائے علاج پر کچھ بہت زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ البتہ ڈاکٹروں کی تنقید اور رائے زنی کو وہ پورے غور سے سنتے۔ ان کے پاس علم تھا۔ آلات تھے نظریے تھے۔ مفروضے تھے اور ان کی تردید کوئی آسان بات نہ تھی مگر ان کی دواؤں میں کوئی اثر نہ تھا۔ وہ حکیم صاحب کے ان الفاظ کو سنتے کہ "اعصاب میں برودت ہے اور جگر میں حدت" تو انہیں تعجب ہوتا کہ ان اصطلاحات کا فی الواقعہ کوئی مطلب ہے بھی یا نہیں مگر حضرت علامہ کیا کرتے۔ نہ ان کو سائنس کی ترقی سے انکار تھا۔ نہ آلات کی خوبی سے لیکن وہ دیکھتے کہ حکیم صاحب کی گولیوں میں اثر ہے، طاقت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "رسولی" اور بڑھاؤ کے نظریوں کی تغلیط انہیں سے ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ انگلستان نہ گئے۔

میں یہ سب باتیں حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرتا تو وہ کہتے آواز کی کشائش کے لئے وقت کی ضرورت ہے صحت ٹھیک ہو گئی تو گلا اپنے آپ کھل جائے گا۔ دراصل انہیں آواز کا اتنا خیال تھا بھی نہیں جتنا حضرت علامہ کی عام صحت اور قلب و اعصاب کی تقویت کا۔ ادھر جب سے لوگوں نے یہ سُنا کہ حکیم صاحب کا علاج کامیاب ہوا وہ ازراہ خلوص و عقیدت جس نسخہ کی تعریف سنتے اس کا ذکر فوراً حضرت علامہ سے کرتے۔ چنانچہ اب ان کے والاناموں میں اس قسم کے اشارات ہونے لگے۔

"ایک صاحب کہتے ہیں اگر جونکیں لگوائی جائیں تو بہت فائدہ ہوگا۔" ـــــ (۲۳ر جون)

"میرے مہربان فرماتے ہیں کہ کشمیر کی پرانی گل قند اس مرض کے لئے اکسیر ہے۔" (۶ر جولائی) "جراحوں کے ایک پرانے خاندان کے پاس شرطیہ لیپ ہے" (۱۶ر جولائی) "مشک کا استعمال کیسا رہے گا؟" (۱۹ر اگست)۔ ۱۸ر ستمبر کو لکھتے ہیں:

"عراق کے ایک ترک طبیب کے پاس شرطیہ علاج ہے۔ تمباکو میں چرس رکھ کر کھلائی جائے اور شکر کی بجائے گڑ استعمال کیا جائے۔ دو تین روز میں آواز صاف ہو جائے گی۔"

حکیم صاحب قبلہ ان تجاویز کو سنتے اور سن کر پریشان ہو جاتے مگر حضرت علامہ کے پاسِ خاطر سے کبھی آواز کش گولیاں اور کبھی کوئی لیپ روانہ کر دیتے جن سے شاید فی الحقیقت دفع الوقتی مقصود ہوتی۔ بہرحال وہ اپنی دواؤں میں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے کہ آواز کو ترقی ہو لیکن حضرت علامہ تعجیل کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلدی ممکن ہو انگلستان تشریف لے جائیں اور روڈز لیکچرز کے سلسلے میں فلسفۂ اسلامی کے تصوراتِ مکان و زماں کی تشریح کر سکیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے پریشان ہو کر لکھا :۔

صحت خدا کے فضل سے بہت اچھی ہے ..... زیادہ کیا عرض کروں ..... آٹھ ماہ کی علالت سے (اور علالت بھی ایسی کہ فی الحقیقت کوئی علالت نہیں) تنگ آگیا ہوں۔" ۳۰ ستمبر

لیکن چونکہ انہیں حکیم صاحب پر اعتماد تھا، اور اب ناک سے بھی بلغم کا اخراج ہو رہا تھا، لہٰذا حضرت علامہ کو یقین تھا کہ آواز بتدریج کھل جائے گی۔ اس اثنا میں انہیں چھینکیں بھی آنے لگیں تھیں اس طرح آواز میں خاصی کشائش پیدا ہو جاتی گو وقتی طور پر سہی۔ ادھر سینے کی حالت سے ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے بلغم چھن رہا ہے۔ اس لئے وہ بار بار حکیم صاحب سے کوئی اکسیر طلب کرتے :۔

"غرض کہ اب آواز کے لئے کسی ایسے اکسیر کی ضرورت ہے جو بہت جلد نمایاں اثر کرے۔ اور آج کل ایسا اکسیر سوائے حکیم صاحب کے اور کس کے پاس ہے۔ اگر نہیں ہے تو ان سے کہئے کہ اپنی طبی ذوق کی گہرائیوں سے پیدا کریں" ـــــ ۲ اکتوبر

ان دنوں حضرت علامہ نے صرف دو نئی کاہشیں اور محسوس کیں۔ اوّل یہ کہ وسط اگست میں ان کا سر دفعتًا چکرایا۔ بعد آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا۔ مگر یہ شکایت کچھ دنوں کے بعد خود بخود دور ہو گئی۔ ممکن ہے یہ اولین علامت ہو موتیا بند کی جس نے تین سال ـــ کے بعد ۱۹۳۷ء میں باقاعدہ ظہور کیا۔ ثانیاً یہ کہ ان کے دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد ہو جاتا تھا۔ یہ تکلیف اگرچہ روغن اوجاع کی مالش سے جاتی رہی، لیکن سال چھ مہینے کے بعد اس کا دورہ ضرور ہو جاتا۔ مجھے خوب یاد ہے حکیم صاحب کو اس درد کے ازالے کا خاص طور سے خیال تھا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ اس زمانے میں حضرت علامہ کو دن میں ایک آدھ ہچکی سی آجاتی جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چیخ کی شکل اختیار کر لی۔ مگر ان کے یہ عوارض اس قدر ہنگامی اور بے حقیقت تھے کہ حضرت علامہ نے انہیں کوئی خاص وقعت نہ دی۔ گویا آواز کی پستی کے سوا اب وہ بالکل اچھے تھے۔ ان کو تعجب تھا تو صرف یہ کہ اتنا بلغم کہاں سے آتا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔

صحت کی طرف سے اطمینان ہوا تو حضرت علامہ ازسرِنو اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے سیاحتِ افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو "مسافر" کے زیرِ عنوان ترتیب دیا۔ اور پھر بالِ جبریل کی طرف متوجہ ہوئے جس کے بعض اجزا ابھی تک نا تمام پڑے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے ان کے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں

کیا تھا۔ لیکن حضرت علامہ کی رائے تھی کہ اردو زبان میں جدید فلسفیانہ مطالب کا ادا کرنا مشکل ہے اور نہ بھی ہو تو انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار جس ایجاز و اختصار سے کیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ گول میز کانفرنس کی شرکت سے فارغ ہو جائیں تو ان کے زیر ہدایت ترجمہ پر نظر ثانی کی جائے اب اس کے علاوہ ایک اور تجویز ان کے ذہن میں آئی۔ یعنی اپنی چیدہ چیدہ نظموں کے ایک الگ مجموعے کی ترتیب اور ایک ادارۂ نشر و اشاعت کا قیام خاص۔ اسلامی ادب کی تخلیق کے لئے۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں کسے دخل ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو مرحومہ والدہ جاوید سلمہٗ بیمار ہو گئیں اور ان کی بیماری نے ایک تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ اس طرح قدرتاً حضرت علامہ کا ذہن اپنے خانگی امور کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور انہوں نے طے کیا کہ تعمیر مکان کا سلسلہ جو پچھلے دو تین برس سے معرضِ التوا میں ہے پورا ہو جائے حضرت علامہ کو دنیوی آسائش اور مال و دولت کی ہوس تو کبھی تھی نہیں ان کی اس خواہش میں بھی در اصل بچوں ہی کے سود و بہبود اور حفاظت کا خیال مضمر تھا۔ لہٰذا تھوڑے ہی دنوں میں ایک مناسب قطعۂ زمین میو روڈ پر خرید لیا گیا۔ اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمدؐ صاحب سیالکوٹ سے تشریف لے آئے۔ حضرت علامہ نے اگرچہ میکلوڈ روڈ سے اس وقت تک قدم باہر نہیں رکھا جب تک کوٹھی ہر طرح سے مکمل اور رہنے کے قابل نہیں ہو گئی۔ لیکن ان کی طبع نازک کو یہ سن کر بھی تکلیف ہوتی تھی کہ زمین کی خرید اور عمارت کی تیاری میں کس قدر اہتمام اور سر دردی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ان باتوں کو سنتے اور خطوں میں اکثر اپنے تکدرِ خاطر کا اظہار کرتے۔

وصیت کا مسئلہ اس سے پہلے طے ہو چکا تھا۔ اور بعض ضروری ہدایات وہ اپنے معتمد رفیق چودھری محمد حسین صاحب کو دے چکے تھے۔ ان کے نام ایک خط بھی تھا جو شروع جون میں ڈاکٹروں کی تشخیص کے زیر اثر لکھا گیا۔ اس میں جاوید سلمہٗ کی تعلیم اور بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ انہوں نے علی بخش کو چند ضروری ہدایات دی ہیں۔ اور پھر مسلمانوں سے دعائے خیر کی درخواست کی ہے۔ مسلمانوں کا انہیں کس قدر خیال رہتا تھا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیجئے جو علی گڑھ میں اشتراکیت کے خروج پر انہوں نے مجھے لکھے۔

"ANTI-GOD" سوسائٹی کا میں نے کسی سے سنا تھا۔ جس کا مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز میں گریہ و زاری کی کوئی انتہا نہ رہی"۔۔۔۔ ۲۵ ستمبر

اس طرح ۱۹۳۴ء بہ خیر و خوبی گذر گیا۔ ۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دہلی سے گذرے اور میں اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ واپسی پر انہوں نے حکیم صاحب سے ملاقات فرمائی۔ انہوں نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا۔ اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

لیکن جنوری ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود مرحوم کی محبت نے انہیں بھوپال کھینچ بلایا۔ ان ایام میں مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے خطبات کا سلسلہ جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام دہلی میں شروع تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری اور اہل جامعہ نے پھر حضرت علامہ سے درخواست کی کہ ان کے کسی ایک خطبے کی صدارت کرنا منظور فرمائیں۔ شروع شروع میں تو حضرت علامہ خرابی صحت کا عذر پیش کرتے رہے مگر جب خانم نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا تو ان کے دل میں خود بھی اس بات کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اگر ممکن ہو تو ان سے ملیں۔ ایک خط میں انہوں نے فرمایا:۔

"مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انہوں نے ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے۔۔۔۔۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے کلچرل تصادم میں نبی امی صلعم کی شخصیت اور قرآن پاک نے کیا حصہ لیا۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل اثرات کو دبائے رکھا۔ نیز خود مسلمان بھی دو ڈھائی سو سال تک یونانی فلسفہ کا شکار ہو گئے۔ ـــــــ ۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء

بہرکیف ۳۰ جنوری کی صبح کو حضرت علامہ دہلی تشریف لے آئے اور خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبہ کی صدارت کے بعد بھوپال تشریف لے گئے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں خاتون موصوف کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ سمجھیں جیسا کہ ان کے خطبات اور بعد کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے۔

بھوپال میں حضرت علامہ کا قیام شروع مارچ تک رہا۔ اس کی عمدگی ہوا اور حسن مناظر کی اکثر تعریف فرمایا کرتے تھے اور اپنے معالجین اور میزبانوں کے خلوص و توجہ کے دل سے شکرگزار تھے۔ ۵ فروری کے عنایت نامے میں لکھتے ہیں:۔

"موسم نہایت خوشگوار ہے۔ طبی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا۔ حکیم صاحب ہی کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ آج ۱۱ بجے ماورا بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوگا۔"

اس دوران میں حکیم صاحب کی دوائیں بند کر دی گئیں تاکہ نئے علاج میں حارج نہ ہوں۔ اس طرح جو اثرات ان کی صحت پر مترتب ہوئے ان کا مفاد یہ تھا:۔

"بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ضرور ہے مگر زیادہ وضاحت کے ساتھ ۸۔۱۰ مرتبہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا۔ نبض کی حالت اور علیٰ ہذا القیاس دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے۔" ۱۲ فروری

۸ مارچ کی صبح کو حضرت علامہ بھوپال سے دہلی تشریف لائے۔ حکیم صاحب کو نبض دکھلائی اور دو روز

ہائیکسی لینسی سردار صلاح الدین سلجوقی قنصل جنرل دولت مستقلہ افغانستان کے اصرار پر قیام فرما کر ۱۳ کی صبح کو لاہور پہنچے۔ اب حضرت علامہ کا معمول یہ تھا کہ اصل علاج تو حکیم صاحب ہی کا رہا۔ ہاں بیچ میں کوئی ہنگامی شکایت پیدا ہو گئی تو مقامی اطبا یا ڈاکٹروں سے رجوع کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ آواز کی اصلاح گو دیر میں ہو گی لیکن بہت ممکن ہے طبی علاج کے ساتھ ساتھ بجلی کا علاج بھی کارگر ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے میں والدہ جاوید سلمہ کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ آخر اپریل میں مجھے لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو میں نے علامہ کو بہت متردد پایا۔ ویسے ان کی اپنی صحت بہت اچھی تھی اور آمد شعر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ از راہ شفقت انہوں نے مجھے اپنے اکثر اشعار بھی سنائے۔ کہنے لگے اگر کتاب مکمل ہو گئی تو اس کا نام صور اسرافیل ہو گا۔ (یہ وہی مجموعہ ہے جو بعد میں ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا) ان دنوں انہیں سب سے زیادہ فکر گھر کی علالت کا تھا۔ میں دہلی واپس آیا تو ان کے والا ناموں میں زیادہ تر اسی کا ذکر ہوتا۔ آخر ۲۴ مئی کے مکتوب میں یہ افسوسناک خبر ملی:۔

"کل شام والدہ جاوید اس جہان سے رخصت ہو گئیں ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا۔ اور میرے اطمینان قلب کا "اللہ فضل کرے" ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔ باقی رہا میں، سو میری حالت وہی ہے۔ جو بھوپال سے آتے وقت تھی۔

یہ زمانہ حضرت علامہ کے لئے بڑی پریشانی کا تھا۔ انہیں اپنے نئے مکان جاوید منزل میں تشریف لائے غالباً دوسرا ہی دن تھا کہ بیگم صاحبہ کی ناگہانی موت کا صدمہ پیش آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال، حفاظت اور تربیت کا انتظام کیا ہو۔ ان کی اپنی طبیعت ناساز تھی۔ وکالت کا سلسلہ بند ہوئے تین چار سال گذر چکے تھے۔ ان کی زندگی میں کسب مال اور حصول منصب کی ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں۔ لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے غیرت و خودداری میں آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا۔ وہ کسی قسم کے احسان اور منت پذیری یا غرض جوئی کو تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت میں یہ ملت کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس نازک موقع پر اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے تعلق خاطر اور خدمت اسلامی کے جذبہ میں خود اپنی جیب سے حضرت علامہ کا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ تاکہ وہ حسب خواہش قرآن مجید کے حقائق و معارف پر قلم اٹھا سکیں۔ حضرت علامہ نے اعلیٰحضرت کے اس حسن سلوک کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور ہمیشہ ان کے سپاس گذار رہے۔ انہیں دنوں کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے میری لائف پنشن پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دی ہے۔ خدائے تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے عین وقت پر مجھ سے سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن مجید پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔" —— یکم جون

اس کے بعد اگرچہ متعدد ذرائع سے یہ کوششیں ہوئیں کہ حضرت علامہ مزید وظائف قبول کریں مگر انہوں نے نہایت اتکلد

کردیا اور یہی کہا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں۔ مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت دیتے ہیں میری ضروریات کے لئے [illegible] ہے حقیقت میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی، کہ حضرت علامہ سے اعلیٰ حضرت کا تعلق کیا ہے۔

۵ رجولائی کو حضرت علامہ ڈیڑھ مہینے کے لئے پھر بھوپال تشریف لے گئے تاکہ بجلی کا علاج مکمل [illegible] بائے بھوپال میں حضرت علامہ کا قیام بالعموم سر راس مسعود مرحوم ہی کے یہاں رہتا۔ اور سر راس مسعود ان کے آر[illegible] آسائش کا اتنا خیال رکھتے کہ خود حضرت علامہ کو بھی تعجب ہوتا۔ انہوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز [illegible] انھیں پیٹ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصلی [illegible] ضعف قلب ہے۔ لہٰذا انہیں چاہیئے نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں " ریاض منزل [illegible] میرا قیام بالائی کمروں میں تھا۔ میں جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے [illegible] دیتے تاکہ زینہ چڑھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز کو خیر میں نے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال [illegible] کچھ نہ کہا۔ لیکن تیسری مرتبہ جب پھر یہی صورت پیش آئی تو میں نے کہا۔ آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں [illegible] سنے "کوئی بات نہیں" کہہ کر ٹال دیا۔ "حضرت علامہ کہتے ہیں" اسی دن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا [illegible] سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں۔ آرام [illegible] بیٹھے رہیئے میں نے پوچھا کیوں؟ تو انہوں نے بتایا کہ "ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری اس قدر خطرناک ہے" [illegible] آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سر راس مسعود کے خلوص و محبت کا ان کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ ۱۹۳۷ء میں جب دفعتاً ان کی [illegible] کا سانحہ پیش آیا ہے تو حضرت علامہ کو بیحد صدمہ ہوا۔" ان کی آنکھیں مرحوم کی یاد میں اکثر اشکبار ہو جاتی تھیں [illegible] اور وہ جب کبھی ان کا ذکر کرتے درد بھرے دل سے کرتے۔

بھوپال سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کی صحت ایک خاص نقطے پر آکر رک گئی۔ ہنگامی تکالیف [illegible] انہیں زیادہ خیال نہیں تھا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر جمعیت سنگھ صاحب تشریف لے آتے اور ان کے دل اور پھیپھڑوں کے [illegible] سے اپنا اطمینان کر جاتے لیکن بجلی کے علاج اور حکیم صاحب کی دواؤں کے باوجود مرض کا استیصال نہ ہوا۔ [illegible] صحت اور بیماری کے درمیان جو کشمکش مدت سے رونما تھی اس کا نتیجہ کبھی کبھی ایک خراب ردعمل کی صورت [illegible] رونما ہونے لگتا۔ بھوپال سے واپس آکر انہیں ایک حد تک کمزوری کا احساس ہو رہا تھا" لہٰذا انہوں نے حکیم صاحب [illegible] سے گزارش کی ــــــ"

"دوا میں تین چیزوں کا لحاظ ضروری ہے۔ (۱) بلغم کا استیصال (۲) قوت جسمانی کی ترقی (۳) آواز پر اثر اگر صرف قوت جسمانی کے لئے حکیم صاحب کوئی جوہر تیار کریں تو شاید باقی وہ باتیں [illegible] کے لئے مفید [illegible] ۲۸ ستمبر ۵ ار اکتوبر کے کرم نامہ میں لکھتے ہیں ــــــ"

"وہی آنا جانے کا خیال ہے۔ ڈاکٹر انصاری سے خط وکتابت کر رہا ہوں۔ انہوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ اگر گیا تو فروری یا اپریل ۱۹۳۶ء میں جاؤں گا۔"

لیکن آخر اکتوبر میں جب مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب پر حضرت علامہ پانی پت تشریف لے گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے لئے کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنا ناممکن ہے۔ اس طرح یہ ارادہ ہمیشہ کے لئے ملتوی ہو گیا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس سفر کے لئے غیر معمولی اخراجات کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس امر کا افسوس رہے گا کہ حضرت علامہ یورپ نہ گئے۔ کیا عجب کہ اس طرح انہیں فائدہ ہی ہوتا!

کیونکہ بجلی کے علاج کی تکمیل ضروری تھی۔ اس لئے جنوری ۱۹۳۶ء میں ان کا ارادہ پھر بھوپال جانے کا ہوا۔ بایں ہمہ وہ آخر فروری تک لاہور ہی میں ٹھہرے رہے۔ یہ اس لئے کہ

"ایک ایرانی النسل سیدزادے کی دوا نے بہت فائدہ کیا۔ کیا عجب کہ آواز بھی عود کر آئے اس واسطے میں نے چند روز بھوپال جانا ملتوی کر دیا ہے۔" ۳ رجنوری ۱۹۳۶ء

مزید برآں "قادیانی احراری نزاع" سے متاثر ہو کر حضرت علامہ جن خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کر چکے تھے اب انہیں کا تقاضہ تھا کہ ایک مفصل بیان اس قضیئے کے متعلق شائع کریں اس لئے کہ پنڈت جواہر لال نہرو جن کو اس مسئلہ کی صحیح نوعیت کا مطلق احساس نہ تھا۔ خواہ مخواہ اس بحث میں کود پڑے تھے۔ حضرت علامہ کا یہ بیان کئی روز کی رد و کد اور کاوش کے بعد مرتب ہوا یہ کہنا مشکل ہے کہ ذہنی اعتبار سے مسلمانانِ ہند اس وقت جس دور سے گذر رہے ہیں اس کے ماتحت وہ اس سیاسی عمرانی مسئلہ کو فی الواقع سمجھے بھی ہیں یا نہیں جس کی ایک ہلکی سی تمہید حضرت علامہ نے اس بیان میں اٹھائی ہے۔ لیکن اگر ایک زندہ ثقافت کی حیثیت سے اسلام کا کوئی مستقبل ہے ــــ جیسا کہ یقیناً ہے ــــ تو ہماری آئندہ نسلیں ان کے بیش بہا اشارات سے فائدہ اٹھائیں گی۔

بہر کیف شروع مارچ میں حضرت علامہ دہلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جب سے ہز ایکسی لینسی سردار صلاح الدین سلجوقی دہلی تشریف لائے تھے حضرت علامہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دہلی سے گزرتے یا آتے جاتے ہوئے دو ایک روز ان کے یہاں ضرور قیام فرماتے۔ سردار صاحب موصوف کو بھی ان کی ذات سے عشق تھا۔ اور وہ اپنے جوشِ عقیدت کو بہت کم مخفی رکھ سکتے۔ حضرت علامہ روانگی کا ارادہ ظاہر کرتے تو ہز ایکسی لینسی کہتے "شام کو تشریف لے جائیے گا۔ ایک روز اور ٹھہر جانے میں کیا حرج ہے؟" حضرت علامہ بھی حتی الوسع ان کے پاسِ خاطر سے کچھ وقت اور ٹھہر جاتے۔ قنصل خانہ افغانستان کی یہ صحبتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ احباب کا مخصوص حلقہ حضرت علامہ کے ارشادات ہز ایکسی لینسی کی بذلہ سنجیاں فارسی کا شاید ہی کوئی دیوان ایسا ہو جو انہیں عزیز نہ ہو ــــ اس وقت کسے معلوم تھا کہ ہم لوگ حضرت علامہ کے فیضانِ صحبت سے اس قدر جلد محروم ہو جائیں گے۔

۹؍ اپریل ۱۹۳۶ء کو حضرت علامہ بھوپال سے لاہور تشریف لائے۔ یہ بھوپال میں ان کا آخری سفر تھا۔ ان کی صحت بظاہر نہایت اچھی معلوم ہوتی تھی اور وہ خود بھی ہر طرح سے خوش و خرم اور مطمئن تھے۔ میں اس زمانہ میں دہلی سے لاہور آچکا تھا اور مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں مستقلاً حاضر رہنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت کتنے ارادے تھے جو دل میں پیدا ہوئے مگر افسوس کہ بعد میں واقعات نے سب امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

لاہور پہنچ کر علامہ نے اول ضرب کلیم کی اشاعت کا اہتمام فرمایا اور پھر "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے عنوان سے وہ مثنوی لکھنی شروع کی جو ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں میں بھوپال ہی میں تھا جب ایک روز خواب میں دیکھا جیسے سر سید احمد خاں مرحوم کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرورِ کائنات صلعم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے۔ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا:

با پرستارانِ شب دارم ستیز باز روغن در چراغِ من بریز

پھر چند اشعار حضور صلعم سے عرضِ حال میں ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے حضرت علامہ کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مثنوی کی شکل اختیار کر لی۔

لیکن ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں حضرت علامہ کے نیازمندوں نے دفعتاً محسوس کیا کہ ان کی صحت بتدریج گر رہی ہے۔ پچھلے دو سالوں میں تو ان میں اتنی ہمت تھی کہ حسبِ ضرورت آسانی سے چل پھر سکتے۔ یہاں تک کہ متصل خانہ افغانستان اور دہلی ریلوے اسٹیشن کی بالائی منزلوں کا زینہ چڑھتے ہوئے۔ انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی اس میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ حرکت کرنے سے ان کا سانس اس وقت بھی پھول جاتا تھا مگر اب تو یہ کیفیت تھی کہ چارپائی سے اٹھ کر دو قدم چلے اور ہانپنے لگے۔ ہانپتے ہانپتے بدن ہلا اور دم کشی شروع ہو گئی۔ بالآخر حکیم صاحب کی خدمت میں اطلاع کی گئی۔ ان کی دواؤں سے افاقہ تو ہوا لیکن میں دیکھتا تھا کہ حضرت علامہ سے علاج کے بارے میں ایک بڑی کوتاہی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ اس کا دار و مدار محض خط و کتابت پر ہے۔ یا پھر سال چھ مہینے کے بعد ایک آدھ مرتبہ نبض دکھا لی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت علامہ ابتدائے مرض ہی میں کچھ عرصہ کے لئے دہلی تشریف لے جاتے اور حکیم صاحب قبلہ ان کی طبیعت کے روزانہ تغیرات ملاحظہ کرتے تو کیا عجب انہیں سچ مچ شفا ہو جاتی۔ لیکن میں نے جب کبھی یہ خیال ظاہر کیا انہوں نے کسی نہ کسی عذر کے ماتحت اسے ٹال دیا۔ مثلاً اب تو بڑی گرمی ہے۔ سردیوں میں دیکھا جائے گا۔ سردیاں آگئیں تو فرماتے "موسم خوشگوار ہو لے تو فیصلہ کروں"۔ دراصل ان کا مزاج اس قدر نازک تھا کہ وہ لاہور سے باہر رہ کر علاج معالجے کے بکھیڑوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان کی ساری توجہ صحتِ بدنی پر مرکوز ہو جائے اور ظاہر ہے کہ

یہ امر ان کی فطرت سے بعید تھا۔ مزید براں خیال ہو چلا تھا کہ سن و سال کے اعتبار سے ان کا زمانہ انحطاط کا ہے۔ لہٰذا حکیم صاحب کی دواؤں سے فائدہ تو ہوگا مگر دیر میں۔ ہاں البتہ کوئی اکسیر دریافت ہو جائے تو الگ بات ہے۔ وہ حکیم نابینا صاحب کو بھی اکسیر سازی کی ہدایت کرتے اور حکیم محمد حسن صاحب قریشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور کو بھی جن کے فضل و کمال اور قابلیتِ فن کا انہیں دل سے اعتراف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں جو شخص بھی ان کے پاس آیا خواہ وہ عامی ہو یا طبیب اور اس نے کسی دوا کا ذکر کیا تو حضرت علامہ اس کی باتوں کو پورے غور سے سنتے اور بسا اوقات ان کی دواؤں کا امتحان بھی کر لیتے تھے۔ اس امید میں کہ شاید طب قدیم کا کوئی نسخہ فی الواقع تیر بہدف ثابت ہو۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی حالت پر قانع ہو چکے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اگر صحت بالکل ٹھیک نہ ہو تو کیا مضائقہ ہے انہیں غم تھا تو صرف احتباس صوت کا۔ بچپن ہی سے ان کی عادت تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ فریضہ اس رنگ میں ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا تھا۔ اس کا انہیں بے حد قلق تھا۔

اپنی علالت کے باوجود خارجی دنیا سے ان کا تعلق ایک لحظہ کے لئے بھی منقطع نہیں ہوا بلکہ اس کا سلسلہ آخری وقت تک قائم رہا۔ اس لحاظ سے وہ ایک یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ اسلام اور اسلام کے انفرادی اور اجتماعی نصب العین کی دعوت میں انہوں نے جن مقاصد کو بار بار اپنی قوم اور دنیا کے سامنے پیش کیا وہ باعتبار فکر و دلیل اس قدر جامع اس قدر مکمل اور اس قدر مضبوط و محکم تھے کہ ان کا پیام دن بدن امت کے سینوں میں راسخ ہوتا گیا اور ان کے بڑے سے بڑے تنقید نگار کو بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی اجتماعی تحریکات اس وقت جو شکل اختیار کر رہی ہیں ان سے حضرت علامہ کبھی متفق نہ ہوئے مگر ان کی مخالفت تعصب و تنگ نظری اور رجعت پسندی کی بجائے جیسا کہ بعض تیز طبیعت اہل سیاست کہہ اٹھیں گے۔ ایک بہتر اعلیٰ تر اور پاکیزہ تر مقصد کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے ایمان و ایقان بالخصوص تخیلات اور فراست و بصیرت سے مجبور تھے اور ان کی قوم اور ان کا وطن کچھ مشرق کے دیرینہ انحطاط اور مغرب کے غیر معمولی استیلا اور کچھ سیاست و معیشت کے ہنگامی تقاضوں کے جوش میں ان کے عملی روش کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ان کی خدمت میں بعض نوجوان بڑے بڑے دعووں کو لے کر حاضر ہوئے لیکن ان کے زورِ استدلال اور زبردست منطق کے سامنے فوراً ہی خاموش ہو گئے۔ ان موقعوں پر وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا بجا ہے مگر ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ حضرت علامہ سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی یا ان کا طرزِ عمل بشری کمزوریوں اور سہو و خطا سے پاک تھا۔ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ "جدید" اور "حاضر" اور "عمرانی" اور "علمی" اور "علمی" حقائق کا نام لے لے کر ان کے ارشادات کو جذبات اور احساسات سے تعبیر کرتے۔ ان کی نگاہیں بجائے خود سطح سے آگے نہیں بڑھیں اور معمولی سی جرح و قدح کے بعد یہ حقیقت

آ سکتا ہے جاتی کہ ان کو نہ ماضی کا علم ہے نہ مستقبل کی بصیرت حضرت علامہ کا عمل کمزور سہی مگر ان کا خلوص، دیانت تو
مسلم ہے انہوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ اپنی سرگرمیوں پر نفاق اور ظاہر داری کا پردہ ڈالیں۔ بھلا جس شخص
کی نظر خالصتاً قرآنی ہو اور جو انسانیت کبریٰ کی اساس نبی امی صلعم کے اسوۂ حسنہ پر رکھے اس کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ خیر
علمی (SCIENTIFIC) اور واقعی (REALISTIC) بنیادوں کے زیر اثر اخلاق و معاشرت کا کوئی ذاتی اور
جماعتی (PRIVATE OR PUBLIC) یا نسلی اور وطنی تصور قبول کرے۔ لہٰذا جہاں ان کے اہل وطن نے
نقطۂ نظر کے اس اختلاف کے باعث اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ملکی مسائل کا حل ایک دوسری
شکل میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں خود مسلمان بھی ان کے خیالات و ارشادات کی صحیح گہرائیوں کا بہت کم اندازہ کر سکے۔
یوں دیکھنے میں حضرت علامہ کا تعلق ہر اس تحریک سے قائم تھا جسے وہ اصولاً اور مصلحتِ وقت یا مجبوری حالات
کی بنا پر ملت کے لئے مفید خیال کرتے لیکن چونکہ ان کی حیثیت مقدماً ایک مفکر اور مبصر کی تھی۔ لہٰذا ان کی سرگرمیاں
بیشتر مشورے نصیحت، رائے اور اس کوشش سے آگے نہ بڑھ سکیں کہ ہماری زندگی میں کسی غیر اسلامی عناصر کا
امتزاج نہ ہونے پائے۔ بایں ہمہ یہ کبھی نہ ہوا کہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کا جو نصب العین ان کے ذہن میں تھا اس کے
لئے کوئی عملی جد و جہد شروع ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ایسا کرنے میں ابھی ملت کو بہت سے مراحل سے گذرنا ہے اور
شاید اس لئے کہ فکر اور قیادت کے درمیان جو فصل ہے وہ محض آرزوؤں سے دور نہیں ہو سکتی۔ وہ خود فرمایا کرتے
تھے I AM NOT EVERY THING (میں سب کچھ نہیں ہوں) حقیقت میں اپنے حدود کا علم جس قدر
ان کو تھا شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ انہوں نے اپنی وسعت سے باہر کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں
ان کے انکسار اور فروتنی کا یہ عالم تھا کہ ان کا دامن عمل تکلف اور تصنع سے ہمیشہ پاک رہا۔ وہ جو کچھ بھی تھے اس
حیثیت میں سب کے سامنے آ جاتے جس طرح اچھے افکار کی تبلیغ میں انہوں نے نہ ادعا سے کام لیا۔ نہ تحکم سے بلکہ ہمیشہ اس
امر کے منتظر رہے کہ اگر کوئی شخص ان کی غلطیوں کی تصحیح کرے تو فوراً اسے قبول کر لیں۔ بعینہٖ انہوں نے اپنی کمزوریوں
کو کبھی اس خیال سے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ایسا نہ ہو ان کی قدر و منزلت یا احترام میں فرق آ جائے۔ یہ ان
کی گہری روحانیت کا زبردست ثبوت ہے۔ اور ان کی غیرت، خودداری اور عزتِ نفس کا ایک قابلِ رشک پہلو کہ انہوں
نے اپنے بشریت کے ہر نیک و بد کی ذمہ داری خود اپنی ذات پر لی۔ اس غیر معمولی ہمت اور جسارت کا سبب یہ ہے کہ حضرت
علامہ اپنی شاعری اور فلسفہ کے باوجود اول و آخر انسان تھے اور انسانیت ہی کا شرف ان کے مقصودِ نظر۔ بایں ہمہ
کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انہیں اپنی قوم سے بے عملی کے طعنے سننا پڑتے۔ حالانکہ ان کے نکتہ چیں اس امر کو فراموش
کر دیتے کہ ان کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے اور اگر عمل کے معنی ہیں نصب العین حیات کے لئے ترغیبات و ترہیبات
دنیوی کے باوجود ایک خاص قسم کی سیرت اور کردار کی بالارادہ پرورش تو حضرت علامہ کسی (صاحبِ عمل) سے پیچھے

نہیں تھے۔ ان کے ابنائے وقت نے کہا کہ وہ فرقہ وار ہیں، شہنشاہیت کی حمایت کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ملک کا فرقہ وار اور شہنشاہیت پسند طبقہ ان کے انقلاب انگیز نظریوں سے ہمیشہ خائف رہا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ حضرت علامہ نے ایک قسم کی خاموشی، الگ تھلگ اور تنہا زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی اور ان کے نیازمندوں کو بہ درجہ غایت افسوس ہوتا کہ ان کی متاعِ عزیز قوم کی بے حسی اور بے اعتنائی کے باعث کس طرح ضائع ہو رہی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ جمہورِ اسلام کو ان سے جو گہری عقیدت اور والہانہ تعلق تھا اس میں کوئی فرق آ گیا تھا۔ ہرگز نہیں برعکس اس کے جوں جوں لوگ ان سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان کے خلوص و محبت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ حضرت علامہ کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا تھا۔ اور ان کی سادگی پسند اور بے ریا طبیعت نے امیر غریب، اپنے بیگانے سب کو ایک نظر سے دیکھا۔ ان کے درِ دولت پر کبھی فرقِ مراتب یا امتیازات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں لوگ کہاں کہاں سے آتے اور کیا کیا خیالات اپنے دل میں لے کر آتے۔ ان میں عامی بھی ہوتے اور جاہل بھی۔ ان کے ساتھ پڑھے لکھوں کو بھی شریکِ محفل ہونا پڑتا۔ لیکن حضرت علامہ جس کسی سے ملتے بغیر کسی تکلف اور احساس عظمت کے ملتے۔ بسا اوقات وہ اپنے ملنے والوں کی گفتگوؤں سے ایک طرح کا ذاتی تعلق پیدا کر لیتے۔ لہٰذا حضرت علامہ کی صحبت سے جو شخص اٹھتا، ان کے انکسار رواداری اور وسعت اور کشادہ دلی کا ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا۔ نوجوانانِ اسلام اور ملت کے سوادِ اعظم کا تو خیر وہ سہارا تھے۔ وہ جو کچھ کہتے انہیں کی زبان سے کہتے اور جو کچھ سنتے انہیں کے کانوں سے سنتے۔ انہیں اطمینان تھا کہ جب تک ہمارے نبی اکرم صلعم کا عاشق اور ہمارے دین کا رازدار ہم میں موجود ہے۔ ہمیں یاس و نومیدی کے کتنے بھی سبق دیئے جائیں اقبال کا پیام اس سے کہیں بڑھ کر خودداری اور خود اعتمادی کی راہیں پیدا کرے گا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ہماری قوم بہ حیثیت قوم کسی علمی جدوجہد کا آغاز کرنا تو درکنار وہ حضرت علامہ کے ان معمولی ارادوں کا اتمام بھی نہ کر سکی جن کا وہ اکثر اظہار فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک علمی ادارے کی تاسیس، ادبیاتِ اسلامیہ کی تجدید، کوئی ثقافتی مرکز یا معارفِ اسلامیہ کی تحقیق و تفتیش۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شخصی طور سے ان کی محبوبیت اور غیر معمولی کشش دن بدن بڑھتی گئی۔ اور ان کی عزت و احترام میں مسلم و غیر مسلم سبھی شریک تھے۔ حقیقت میں حضرت علامہ کا قیام انسانیت کی ان بلندیوں پر تھا۔ جہاں اختلافِ عقائد اور تختگئ مسلک کے باوجود افتراق و تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے محبت خلق میں ہمدردی اور خیر کوشی کی وہ روح پیدا ہو جاتی ہے جو نتیجہ ہے سچی خدا پرستی کا۔ انہوں نے خود اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں ضبط و خودداری کی منزلیں بڑی احتیاط اور متانت سے طے کی تھیں اور ان کی رسوائی ایک لحظے کے لئے بھی گوارا نہیں کی۔ لہٰذا یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس شخص کو بھی ان کا قرب و اتصال حاصل ہوا اس نے ان کی عظمتِ ذات کا اقرار کیا۔ دوسری طرف ان کا علم و فضل تھا۔ اور فطرتِ انسانی کی نہایت

وسیع اور گہری معلومات۔ پھر ان کا ہمہ گیر اخلاق رس تخیل ان کی ذہانت وطباعی، جذب واکتساب کی غیر معمولی قوت اور خوب و ناخوب کا نہایت تیز ادراک، یہ اور ان کی وسعت مشرب اور خلوص وللہیت نے ان کو حسن سیرت کی ان رفعتوں پر پہنچا دیا تھا جن کو ہم تہذیب نفس اور شائستگی ذات کے انتہائی مدارج سے تعبیر کرتے ہیں مشرق و مغرب کی تو جیرہ دہ رگ رگ سے واقف تھے لیکن اسلامی دنیا میں بجز ان کے اور کون تھا۔ جو ثقافت حاضرہ کے انسانی ضمیر سے واقفیت کے باوجود اپنی آزادی ذات، توازن اور رواداری کو قائم رکھے۔ ان کی قوت تنقید نے حال سے بددلی اور ماضی کے احترام کے باوجود مستقبل کو فراموش نہیں کیا۔ حضرت علامہ کوئی خیال مست شاعر نہیں تھے بلکہ ایک حقیقت بین متفکر ملکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا۔ کہ وہ ایک زبردست قوت تھے۔ اور آج جب وہ اس دنیا سے کسی بہتر عالم میں تشریف لے گئے ہیں ان کی طاقت در اور حیات آفرین شخصیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

سلسلۂ کلام کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مجھے عرض کرنا چاہیے تھا کہ ۱۹۳۶ء کی سردیاں آئیں تو حضرت علامہ کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ اور ۱۹۳۶ء کے اختتام تک صحت کی یہ رفتار برابر قائم رہی۔ اس زمانہ میں ایسا بھی ہوا کہ بسا اوقات ان کی آواز نہایت صاف ہو جاتی علیٰ ہذا تنفس اور بلغم میں بھی کمی تھی۔ البتہ کمزوری کا احساس باقی تھا لیکن اس کے باوجود حضرت علامہ پلنگ پر لیٹے رہنے کے بجائے نشست کے کمرے میں آ بیٹھتے مگر انہوں نے خود پڑھنا لکھنا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ مارچ یا اپریل ۱۹۳۷ء میں موتیا بند کی علامتیں قطعی طور سے ظاہر ہو گئی تھیں بہرلیف اب ان کی خواہش تھی کہ قرآن پاک کے حقائق و معارف کے متعلق اپنا دیرینہ ارادہ پورا کریں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کس رنگ میں، تفسیر و تشریح یا ابتدائی مطالعہ کے لئے ایک مقدمہ؟ بالآخر موجودہ زمانہ کی اجتماعی تحریکات کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں یہ خیال دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا۔ کہ اس وقت ضرورت اسلام کے نظام عمرانی کی تصریح و توضیح کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کی مانند تشکیل جدید فقہ اسلامی پر قلم اٹھائیں اور یہ دیکھ کر کہ قرآن پاک نے دن مسائل کی رہنمائی کس انداز میں کی ہے۔ لیکن اس کے لئے وقت کی ضرورت تھی اور ان حضرات کی بھی جو فقہ اسلامی پر نظر رکھتے ہوئے جدید عمرانی رجحانات کو سمجھ سکیں۔ حضرت علامہ نے اس غرض سے یورپ اور مصر کی بعض نئی مطبوعات بھی فراہم کرنا شروع کر دی تھیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اس تصنیف کا کام استقصائے مسائل، ترتیب مقدمات اور تقسیم مباحث سے آگے نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ان کے غور و فکر اور گفتگوؤں کی دنیا میں۔ آگے چل کر جب وہ اپنی صحت سے ناامید ہو گئے تو اس ارادے کی ناکامی سے اس قدر شکستہ خاطر تھے کہ دو۔ ایک بار فرمایا "میں یہ کتاب لکھ سکتا تو اطمینان سے جان دیتا"۔

تشکیل جدید فقہ اسلامی کا ارادہ ملتوی ہوا تو ان کا ذہن جس کی تیزی اور سرگرمی جمود و تعطل کی بجائے دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ ایک دوسری جانب منتقل ہو گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اب صبح و شام ان کی

خدمت میں حاضر ہوتا اور گھنٹوں مختلف مباحث پر ان سے گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ حضرت علامہ نے فرمایا "لوگوں سے بات چیت کرنے میں بہت سے عمدہ خیالات سوجھتے ہیں۔ مگر بعد میں کوئی یاد رہ جاتا ہے اور کوئی نہیں"۔ میں نے خلاف ارادہ عرض کیا کہ میں نے تو اپنی بساط کے مطابق آپ کے ارشادات کا ایک روزنامچہ تیار کر رکھا ہے۔ کہنے لگے "ایکرمان کی طرح؟" میں اپنی بے مائیگی کے احساس سے خاموش ہو گیا۔ انہوں نے کہا "اگر تم اپنے ساتھ یادداشت رکھو تو بہت اچھا ہے۔ میں جس بات کو قلم بند کرنے کے لئے کہوں فوراً قلم بند کر لو"۔ لیکن ابھی دو ایک باتیں ہی درج یادداشت ہوئی تھیں کہ یہ امر واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ حضرت علامہ کے افادات ایک کتاب کی شکل اختیار کر سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ میں ہر روز عہد نامۂ عتیق یا اناجیل کا کوئی حصہ ان کو پڑھ کر سنایا کروں۔ یہ مشغلہ کئی روز تک جاری رہا۔ عہد نامۂ عتیق پر ان کی تنقید بڑے مزے کی ہوتی اور وہ اس کے انداز بیان اور مطالب کا مقابلہ بار بار قرآن پاک سے کرتے۔ دراصل ان کا خیال تھا کہ نطشے کی کتاب ALSO SPRACH ZARATHUSTRA اور اسی طرح ایک سی تصنیف THE BOOK یا WHAT AN UNKNOWN PROPHET SAID OF AN UNKNOWN PROPHE کے نام سے مرتب کریں اور اس کے لئے انہیں کسی مناسب ادبی اسلوب کی تلاش تھی۔

اس امر کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تشکیل جدید فقہ اسلامی کی طرح اس کتاب کا تصور بھی کوئی عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ کی صحت سالِ گذشتہ سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے بدن میں ایک قسم کی تازگی اور قوت محسوس کرنا شروع کی۔ اس سے انہیں پھر امید بندھ گئی کہ شاید کچھ مدت کے بعد سفر کے قابل ہو جائیں۔ اس خیال کے آتے ہی حکیم صاحب قبلہ سے درخواستیں ہونے لگیں کہ تقویت بدن کے لئے کوئی زود اثر اکسیر ایجاد کریں۔ ایک خط میں انہیں نے یہ بھی لکھا:۔

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تنِ خاکی مرا　　　ایک میں ہے زودمستی ایک میں ہے تاب و تب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبحِ ازل　　　دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی "روح الذہب"

جب سے حضرت علامہ کا گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں یورپ آنا جانا ہوا تھا۔ بالخصوص سیاحتِ اندلس اور افغانستان کے بعد ان کے دل میں برابر یہ شوق پیدا ہو رہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا جائے تاکہ دنیائے اسلام کی موجودہ ذہنی کشمکش اور اجتماعی اضطراب کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ اس ممالک کی سیر کرتے ہیں ان کی قوتِ مشاہدہ نہایت محدود بلکہ اکثر معدوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں بڑھ کر ان کی ایک دیرینہ آرزو تھی کہ وہ حرم پاک نبوی کی زیارت ۱۹۳۲ء میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے جب وہ موتمر اسلامیہ میں شرکت کے لئے بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت سفر حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن پھر جیسا کہ انہوں نے خود مجھ سے فرمایا "اس بات سے شرم آتی تھی کہ میں گویا ضمناً[23] "دربار رسول صلعم میں حاضر ہوں" خبر

کی نیت تو نہ ارادہ پیدا ہونے سے رہ گیا۔ مگر ان کے تاثرات دب نہ سکے اور ان کا اظہار اس نظم میں ہوا جو "ذوق و شوق" کے عنوان سے بالِ جبریل میں موجود ہے۔ اب ۱۹۳۷ء میں ان کی حالت بہتر ہوئی تو انہوں نے متعلقہ جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کر دی۔ خیال یہ تھا کہ ۱۹۳۸ء میں نہیں تو ۱۹۳۹ء میں وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ فریضۂ حج کی ادائگی کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہوں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے عالمِ تصور ہی میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ اُدھر ذوق و شوق نے ان کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور ادھر ان کی زبانِ جوش و مستی ترانہ ریز ہوئی۔

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم   نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام   گشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

انہوں نے خیال ہی خیال میں احرام سفر باندھا اور ارضِ پاک کو روانہ ہو گئے۔

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل   کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
خرد از راندنِ محمل فرو ماند   زمامِ خویش دادم در کفِ دل

کبھی وہ عین حرمِ کعبہ میں اپنی بے تابی کا اظہار کرتے۔

تنم وا ماند و جانم در تگ و پوست   سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز   کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اور کبھی دیارِ حبیب صلعم میں پہونچ کر ان کی بے جان روح کو تسکین و قرار کی ایک دولت ہاتھ آجاتی۔

دریں وادی زمانے جاودانے   ز خاکش بے صور روید معانی
حکیماں با سلیماں دوش بر دوش   کہ ایں جا کس نگوید لن ترانی

اب طبیعت میں آمد کا وہ زور تھا کہ رباعیوں پر رباعیاں موزوں ہوتی چلی گئیں۔ پچھلے سال کی برسات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز مجھ سے ارشاد فرمایا "نیازی صاحب! ارمغانِ حجاز کا مسودہ صاف کرنا ہے۔ عنوانِ کتاب اُردو رباعیات یا قطعات اس لئے کہ اوزان کی رُو سے غالباً انہیں قطعات کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ حضرت علامہ نے خود ان کو رباعیوں ہی سے تعبیر کیا ——— کا ذکر تو روزمرہ کی صحبتوں میں اکثر آتا رہتا تھا۔ لیکن مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ مسودہ کی تبییض کا وقت آپہنچا۔ ۱۹۳۶ء سے اشعار کی ترتیب و تسوید کی خدمت حضرت علامہ نے میرے ہی ذمہ کر رکھی تھی جس سے مجھے ان کی شاعری کے نفسیاتی پہلوؤں سے اور زیادہ گہرا اتصال پیدا کرنے کا موقع ملا۔ حضرت علامہ کی یہ آخری تصنیف جو ایک طرح سے حجاز کا خیالی سفرنامہ ہے ——— فرمایا کرتے تھے "اصل سفرنامہ تو وہ ہوگا جو حرمین پاک کی زیارت کے

بعد لکھا جائے گا۔" ان کی وفات سے مشکل ایک ہفتہ پہلے مکمل ہوئی میرا مطلب اس رباعی سے ہے جو آنے والے "مردِ مسلم" کے متعلق انہوں نے درج بیاض کرائی۔ صحیح معنوں میں اس تصنیف کو مکمل کہنا غلط ہے۔ کیونکہ رباعیات کی آمد اور ان کی تصحیح و ترمیم انتخاب اور قطع و برید کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ ایک دن جب میں اور چودھری صاحب حسبِ معمول ان کی خدمت میں حاضر تھے تو فرمایا "بیاض لے آؤ اور فہرست مرتب کر دو۔" قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ لمحے میرے اور چودھری صاحب کے لئے کس قدر تکلیف اور رنج کا باعث ہوں گے۔ میں نے فہرست کو ترتیب دے کر عرض کیا "اور اردو نظمیں؟" فرمایا "الگ عنوان دے کر ساتھ ہی شامل کر دو"

اردو نظموں کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ حضرت علامہ کا مشغلۂ سخن تو ہمیشہ جاری رہتا۔ وہ اگر چاہتے بھی تو اسے بند نہ کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک دن خود مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "آمدِ شعر کی مثال ایسی ہے جیسے تحریکِ جنسی کی۔ ہم اسے چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے۔" کہنے لگے "میں بلا ارادہ بھی شعر کہہ سکتا ہوں" اور بعض دفعہ ایک ہی شب میں اشعار کی تعداد تین تین سو تک پہنچ گئی۔ ایک دفعہ سو کر اٹھے تو یہ شعر زبان پر تھا

"دوزخ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے   خاکسترِ اسکندر و چنگیز و ہلاکو"

اور فرمایا "اس کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ غرض کہ ان مثالوں سے آپ ان کے جوشِ طبیعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے ایک طویل نظم ۳۶ء میں ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً یہ مشغلہ جاری رہا۔ اور متعدد قطعات، نظمیں اور رباعیاں مرتب ہوتی چلی گئیں بعض اشعار کشمیر اور اہلِ کشمیر کے متعلق تھے۔ خیال تھا کہ یہ مجموعہ شاید صورِ اسرافیل کے نام سے شائع ہو۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آخری اردو نظم جو انہوں نے کہی اس کی تاریخ ۷ر فروری ۳۸ء ہے —— چند شعر کا مختصر سا قطعہ جس کا موضوع تھا "حضرت انسان"۔

یوں حضرت علامہ کی علالت کو کم و بیش چار سال گذر گئے۔ پانچویں برس یعنی ۳۸ء کا آغاز ہوا تو ان کی طبیعت نے یک بیک پلٹا کھایا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ۳۶ء کے بعد حضرت علامہ پھر کبھی بھوپال نہیں گئے البتہ اپریل ۳۷ء میں دو ایک روز کے لئے دہلی ضرور تشریف لے گئے۔ تاکہ حکیم صاحب کو نبض دکھا سکیں۔ ظاہر ہے کہ مرض کے ازالے کا کچھ بہت زیادہ موثر طریق نہ تھا۔ معلوم نہیں ان کے آخری عوارض کی ابتدا کب ہوئی۔ لیکن جہاں تک میں اپنی قوت مشاہدہ پر اعتماد کر سکتا ہوں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان کی صحت آخر ۳۸ء سے گرنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس زمانہ میں حضرت علامہ کو دیکھ کر اکثر گھبرا جاتا تھا۔ بسا اوقات وہ اس قدر لاغر اور نحیف معلوم ہوتے تھے جیسے ان کے بدن میں خون کا ایک قطرہ نہیں۔ بایں ہمہ ان سے جو کوئی بھی خیریت مزاج دریافت کرتا۔ فرماتے "الحمد للہ بہت اچھا ہوں۔ اس زمانہ میں حکیم

محمد حسن صاحب قریشی نے ان کے لئے چند مرکبات تجویز کر رکھے تھے۔ جن سے فائدہ ہو رہا تھا۔ لیکن ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا۔ اور یوم اقبال کی تقریب خیر و خوبی سے گزر گئی تو انہیں دفعتاً ضیق النفس کے خفیف سے دورے ہونے لگے۔ اور ایک روز انہوں نے شکایت کی کہ پچھلی رات کا اکثر حصہ بے خواب گزرتا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے گرد کے مقام پر درد ہے۔ دو ایک دن تنفس کی تکلیف بھی رہی مگر اس کے بعد بتدریج افاقہ ہوتا گیا۔ رہی نیند کی کمی سو خیال یہ تھا کہ شاید تبدیلی وقت کی وجہ سے ایسا ہو کیونکہ حضرت علامہ دن کا اکثر حصہ سو لیتے تھے اور بے خوابی کے باوجود تھکن یا بے چینی محسوس نہ کرتے۔ ضیق النفس کے لئے قریشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا جس کے استعمال سے فوراً سکون ہو جاتا۔ ان کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کو دمہ قلبی CARDIAC ASTHMA ہے ضعف قلب کے باعث اور ڈاکٹروں نے اس کی تائید کی۔ اس تکلیف میں حضرت علامہ اکثر بیٹھے بیٹھے سامنے کی طرف جھک جاتے اور بسا اوقات پائنتی پر تکیہ رکھے اپنا سر اس پر ٹیک دیتے۔ ایک عجیب بات ہے کہ انہیں ایام میں انہوں نے دفعتاً مایوسی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ علی بخش سے اکثر کہا کرتے تھے ۱۹۳۸ء خیریت سے گزر جائے تو سمجھنا کہ اچھا ہوں۔" ۲۲ فروری کی شام کو مجھ سے شوپنہار کے متعلق گفتگو کرتے کرتے یک بیک کہنے لگے "نیازی صاحب! اس فلسفہ میں کیا رکھا ہے۔ کچھ بھی نہیں" میں سمجھا ان کا اشارہ عقل کی بے مائگی کی طرف ہے۔ کہنے لگے "ہرگز نہیں، علم کی مسرت کوئی مسرت نہیں مسرت یہ ہے کہ انسان کو صحت ہو اطمینان ہو۔ اس کے تین روز بعد یعنی ۲۵ فروری کی شام کو انہوں نے ضیق کو روکنے کے لئے حسب معمول جوشاندہ پیا۔ مگر دورے کی شدت میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اگلے روز ایلوپیتھک علاج شروع کیا گیا۔ اس میں کچھ دوائیں غالباً دورے کو روکنے اور کچھ نیند کے لئے تھیں۔ اس طرح چند روز آرام سے گزر گئے۔ مگر پھر ۳ مارچ کو آخر شب میں ان پر ضعف قلب کے باعث غشی طاری ہو گئی۔ اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے نیچے گر گئے۔ قریشی صاحب کا قاعدہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد حضرت علامہ کی خیریت معلوم کرنے اکثر جاوید منزل تشریف لے جاتے۔ اس روز بھی حسن اتفاق سے ایسا ہی ہوا۔ قریشی صاحب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ کو دم کشی سے بے حد تکلیف ہے۔ انہوں نے جہاں تک ممکن ہوا اس وقت مناسب تدابیر لیں اور پھر سیدھے میرے ہاں چلے آئے۔ ان کی اس غیر متوقع تشریف آوری سے مجھے ایک گونہ تعجب ہوا لیکن میں دریافت حالات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ انہوں نے خود ہی صبح کے پرخطر واقعہ کا ذکر کیا۔ کہنے لگے دل نہایت ضعیف ہے۔ جگر اور گردے ماؤف ہو رہے ہیں۔ مگر اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا۔" میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے کہا۔ "آپ فوراً جاوید منزل چلے جائیے اور حضرت علامہ کی حالت سے مجھے اطلاع دیجئے۔ میں دوائیں بھجواتا ہوں۔"

گویا یہ آغاز تھا حضرت علامہ کے مرض الموت کا لیکن اس وقت بھی ان کے استقلال اور دلجمعی کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حسب معمول نہایت اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔ "آج کیا خبر ہے؟ لڑائی ہوتی ہے یا نہیں؟ آسٹریا کا کیا حال ہے؟" دو تین گھنٹے کی حاضری کے بعد جب میں نے یہ دریافت کیا کہ قریشی صاحب

سے لیا جس کو یاد ہے تو مسکرا کر فرمایا ''میری طبیعت اس قدر اچھی ہے کہ اگر کسی موضوع پر تقریر کرنا پڑے تو اس کا سلسلہ تین گھنٹے تک جاری رکھ سکتا ہوں'' حضرت علامہ نے یہ اضافہ اس لئے فرمائے کہ انہیں زیادہ گفتگو سے منع کیا گیا تھا طبی اصطلاح میں ان کی نبض اگرچہ ''دمنلی'' تھی ـــ چوہے کی طرح نہایت ضعیف ـــ لیکن ان کا ذہن برابر صفائی سے کام کرتا رہا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قلب و دماغ عطا کئے تھے۔ ان کے معالج اگرچہ ابتدا میں گھبرا جاتے تھے لیکن ان کی قوت دماغی سے چند ہی روز کے بعد امید بندھنے لگتی تھی۔ کہ ابھی جسم کے امکانات باقی ہیں۔ اس سے پھر حضرت علامہ کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ ہر شخص کی طب انفرادی ہے۔ اور دوران علاج میں مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

حضرت علامہ کے تیمارداروں کے لئے یہ دن بڑے اضطراب کا تھا۔ بالخصوص اس لئے کہ شام کو انہیں ذرا ذرا سی دیر کے بعد ضعف قلب کا دورہ ہونے لگتا۔ ظاہر ہے کہ اس تشویش انگیز حالت میں خطوں پر اکتفا کرنا ناممکن تھا۔ اور اگرچہ حکیم صاحب کی خدمت میں مفصل اطلاع کر دی گئی مگر اب عملاً علاج قریشی صاحب ہی کا تھا۔ یوں بھی حضرت علامہ انہیں اکثر مشورے کے لئے طلب فرما لیا کرتے تھے اور پچھلے برس سے تو ان کا معمول ہو گیا تھا کہ ہر دوسرے تیسرے روز جاوید منزل تشریف لے جاتے تھے حضرت علامہ کو ان کی ذات پر بے حد اعتماد تھا اور وہ ان کی وسعت معلومات اور لیاقت و حذاقت سے متاثر ہو کر اکثر فرمایا کرتے تھے ''کہ شمالی ہند میں اب ان کے سوا اور کون ہے؟ اگر ان کا وجود ایک چھوٹے سے ادارے کی شکل اختیار کر لے تو ہندوستان نہ سہی کم از کم پنجاب میں ہماری طب کو بہت کافی فروغ ہو سکتا ہے۔ قریشی صاحب نے بھی جس تندہی اور دل سوزی سے حضرت علامہ کی خبرگیری کی ہے اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا ان کا تعلق محض طبیب اور مریض کا نہیں بلکہ ایک عقیدت مند، دوست اور خدمت گزار کا تھا۔ وہ ان ایام میں حضرت علامہ کی بیماری کے سوا اور سب کچھ بھول گئے کتنے مرکبات تھے جو انہوں نے محض حضرت علامہ کے لئے اپنے زیر نگرانی طیار کئے۔ وہ صبح و شام ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھ کر کبھی دوا کھلاتے کبھی مزے مزے کی باتوں سے ان کا جی بہلاتے۔ اکثر وہ ان کی ہتھیلیاں سہلانے لگتے اور پھر چپکے چپکے ان کے چہرے اور پاؤں کا معائنہ کر لیتے ـــ یہ اس لئے کہ ان کو ابتدا ہی سے خیال ہو چلا تھا کہ حضرت علامہ کا رجحان استسقا کی طرف ہے۔ خود حضرت علامہ کی یہ کیفیت تھی کہ ادھر قریشی صاحب نے جاوید منزل میں قدم رکھا اور ادھر ان کی تمام شکایات دور ہو گئیں۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے ''میرا سب سے بڑا علاج یہی ہے کہ حکیم صاحب پاس بیٹھے رہیں۔''

لہٰذا قریشی صاحب کی محنت اور توجہ سے چند ہی دنوں میں یہ حالت ہو گئی کہ حضرت علامہ کو لحظہ بہ لحظہ افاقہ ہونے لگا اور بعض دفعہ وہ اپنی خواب گاہ میں چل پھر بھی لیتے تھے۔ اس اثنا میں حکیم نابینا صاحب کی دوائیں آگئیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر مظفر الدین صاحب ان سے ضروری ہدایات لینے آئے ـــ حکیم نابینا صاحب اس وقت حیدرآباد تشریف لے جا چکے تھے۔ ـــ اس طرح اطمینان کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی مگر ان کے بعض نیاز مند

کا خیال تھا کہ اگر قریشی صاحب کے علاج میں ڈاکٹری مشورہ بھی شامل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے ممکن ہے ایسا کرنا مفید ثابت ہو۔ چنانچہ اب ڈاکٹر محمد یوسف صاحب سے رجوع کیا گیا۔ اور انہوں نے پورے خلوص اور توجہ سے اس امر کی کوشش کی کہ تخفیف مرض کی کوئی صورت نکل آئے۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر کیپٹن الٰہی بخش صاحب سے بھی مشورہ ہوا مگر حضرت علامہ کی اپنی طبیعت کا یہ عالم تھا کہ ایلوپیتھک دواؤں سے بار بار گھبرا جاتے اور ایک خاص میعاد مقرر کرنے کے بعد ان کا استعمال چھوڑ دیتے۔

یہاں پہنچ کر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ حضرت علامہ کا مرض فی الحقیقت کیا تھا۔ قریشی صاحب کہتے ہیں کہ انہیں منظم و اتساع قلب کی شکایت تھی۔ یعنی دل کے تناسب عمل میں نقص کا پیدا ہو جانا جس سے ان کے عضلی ریشے بڑے ہو کر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس طرح ان کے دل کی دہنی دیوار بہت زیادہ ڈھیلی ہو گئیں اور ان کے جوف پھیل گئے۔ ان کی رائے میں سانس کی تکلیف دمہ قلبی ہی کی وجہ سے تھی بالفاظ دیگر چونکہ دل کا عمل پورا نہ ہوتا تھا اس لئے یہ تکلیف رونما ہو جاتی۔ قریشی صاحب کی رائے تھی کہ حضرت علامہ کی کھانسی، بول زلالی، نبض کا ضعیف، سریع اور غیر منظم ہونا یہ سب اتساع قلب کے علامات ہیں۔ مزید برآں ان کا جگر بھی بڑھا ہوا تھا۔ اور اگرچہ اتساع قلب میں بھی دوران خون کے اختلال کے باعث جگر بڑھ جاتا ہے۔ مگر حضرت علامہ کا جگر پہلے سے ماؤف تھا۔ اتنا تو مجھے بھی یاد ہے کہ حکیم نابینا صاحب حضرت علامہ کے جگر کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ قریشی صاحب کے نزدیک حضرت علامہ کے گردے بھی متاثر تھے اور ان کو شروع ہی سے خیال ہو گیا تھا کہ استسقا کا خدشہ ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسری تشخیص یہ تھی کہ حضرت علامہ کو انیوریزما اورطی (اوزم) یعنی شہ رگ کی رسولی ہے۔ یہ اس لئے کہ جب ان کا دل کمزور ہو گیا تو خون کے مسلسل دباؤ نے شہ رگ میں جو ربر کے غبارے کی مانند پھیل گئی تھی۔ ایک گڑھا سا پیدا کر دیا جس نے رفتہ رفتہ ایک دموی رسولی کی شکل اختیار کر لی۔ یہی سبب دقت تنفس کا تھا کیونکہ قصبۃ الریہ (ہوا کی نالی) پر اس رسولی کا دباؤ پڑتا تھا۔ اس طرح حضرت علامہ کو مسلسل کھانسی ہوتی رہتی اور انیوریزما کے باعث چونکہ آواز کے ڈورے کھل گئے تھے لہٰذا ان کا گلا بیٹھ گیا۔

حضرت علامہ کے عوارض کی ان دو تشخیصوں کے متعلق جن کی تفصیل کے لئے میں قریشی صاحب کا ممنون احسان ہوں۔ اگرچہ راقم الحروف کا کچھ کہنا بے سود ہوگا لیکن اتنا ضرور عرض کرنا پڑتا ہے کہ زیادہ تر اتفاق رائے غالباً پہلی تشخیص ہی پر تھا۔ ۲۱ مارچ کو جب میرے دوست محمد اے۔ والش (ڈی سی ایم بی) حضرت علامہ کی عیادت کے لئے آئے ہیں اور ان کے ساتھ ڈاکٹر زلیسٹر بھی تھے تو ان کا (ڈاکٹر زلیسٹر کا) بھی یہی خیال تھا کہ حضرت علامہ کو اتساع قلب کا عارضہ ہے اور گلے کی تکلیف مقامی فالج کا نتیجہ۔ بہرکیف قریشی صاحب کی رائے ٹھیک ہے۔ حضرت علامہ کو لطیف مقویات اور مفرحات کا زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔ اور ان کے لئے مشک عنبر اور مروارید بہت مفید رہیں گے۔ ان دواؤں کا فی الواقع یہ اثر بھی ہوا کہ حضرت علامہ اگر کبھی

ی علاج کرتے تو ان کا استعمال برابر جاری رکھتے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی خیالات اور تجربات کی بنا پر طبِ قدیم کی خوبیوں کے قائل ہو چکے ے۔ جدید نظریوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان میں انسان کی حیثیت محض ایک "شے" کی رہ تی ہے اور اس کے نفسیاتی پہلو کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اول تو ان کی رائے یہ تھی کہ طب کا علم ممکن ہی نہیں اس ئے کہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم زندگی کی کنہ سے باخبر ہیں جو ظاہر ایک غلط سی بات ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ب جاننا کہ طب ممکن بھی ہے تو ہر شخص کی طب دوسرے سے جداگانہ ہوگی کیونکہ ہر انا (EGO) بجائے خود نا اور منفرد ہے چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اس نقطۂ نظر کے ماتحت اٹلی میں ل۔ جدید طب کی تشکیل ہو رہی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علم طب نے کیا ترقی کی ہے؟ حالانکہ نوعِ انسانی کو اس کی ورت بدوِ شعور ہی سے محسوس ہو رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ علم ہوتا۔ یا پھر ہ کی ابتدا اس وقت ہوگی جب تمام علوم و فنون کا ارتقا مکمل ہو جائے لیکن جہاں تک عملی مجبوریوں کا تعلق ہے ان کے لئے دواؤں کا استعمال ناگزیر تھا۔ مگر وہ ایلوپیتھک دواؤں سے بہت ناراض تھے۔ اس لئے کہ ان ں نہ ذائقہ کا خیال رکھا جاتا ہے نہ پسند کا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدمتِ خلق کے بجائے تجارت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں طبی دوائیں ہیں۔ کس قدر لطیف اور خوش مزہ! ان سے مسلمانوں کے ذوقِ مال اور نفاستِ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ جب وہ قرشی صاحب کے تیار کردہ خمیرہ گاؤزبان عنبری یا دواء المسک مزے لے لے کر چاٹتے تو اس امر پر افسوس ظاہر کرتے کہ ان کی خوراک کس قدر کم ہے۔ نتیجہ نہ سات فقط ن ماشئے! پھر ان کا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ دردِ گردہ کی شکایت جو انہیں مدت سے تھی۔ حکیم نابینا صاحب کے ہی علاج سے دور ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں جب ڈاکٹروں نے بار بار ان کی صحت سے مایوسی کا اظہار کیا تو یہ حکیم صاحب ہی کی دوائیں تھیں جن سے امید کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ اور وہ کم و بیش چار برس تک اپنے مشاغل کو جاری رکھ سکے۔ دورانِ علاج میں حضرت علامہ نے بارہا اس امر کا مشاہدہ کیا کہ جدید آلات سے بالآخر انکشافاتِ نبض ہی کی صدیق ہوئی۔ لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ ان کا اعتماد قدیم دواؤں پر دن بدن بڑھتا گیا۔ وہ کہا کرتے ے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربہ سے ٹھیک ثابت ہو رہے ہیں۔ آج کل کی دواؤں کا کیا ہے۔ ادھر یجاد ہوئیں ادھر متروک۔

۱۷ مارچ کے بعد جب سے طبی علاج از سر نو شروع ہوا حضرت علامہ کی صحت میں خفیف سا مد و جزر پیدا ہوتا رہا۔ اس خیال سے کہ اگر ان حالات کی اطلاع عام ہو گئی تو شاید لوگوں کی عقیدت مندی ان کے آرام میں حارج ہو۔ حضرت علامہ کی خرابیٔ صحت کی خبر مخفی رکھی گئی۔ ان دنوں معمول یہ تھا کہ حضرت علامہ کے متعدد احباب کے علاوہ ہم گ یعنی چودھری محمد حسین، راجہ حسن اختر، قرشی صاحب اور راقم الحروف صبح و شام حضرت علامہ کی خیریت معلوم تے اور پھر رات کو باقاعدہ ان کی خدمت میں جمع ہو جاتے یا پھر (ڈاکٹر کا لیجیٹ مسلم برادرہڈ کے صدر) محمد شفیع

صاحب جاوید منزل ہی میں اٹھ آئے تھے۔ تاکہ حضرت علامہ کی دیکھ بھال اور دواؤں کا خیال رکھیں۔ خدمت گزاری کے لئے علی بخش اور دوسرے نیاز مند موجود رہتے علی بخش بیچارہ تو کئی راتیں سویا بھی نہیں۔ حضرت علامہ کو دن میں تو نسبتاً آرام رہتا تھا اور وہ کچھ وقت سو بھی لیتے۔ لیکن رات کو ان کی تکلیف بڑھ جاتی۔ کبھی اختلاج ہوتا کبھی ضعف، کبھی احتباس ریاح ضیق کے دورے بالعموم پچھلے پہر میں ہوتے تھے۔ اور شفیع صاحب کو اس کی روک تھام کے لئے خاص طور سے جاگ کر دوائیں کھلانا پڑتیں۔ علی بخش رحما، دیوان علی —— حضرت علامہ کے ملازمین —— (اور احباب) ان کا بدن دباتے جب رات زیادہ ہو جاتی تو چودھری صاحب اور راجہ صاحب ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے تاکہ حضرت علامہ سو جائیں۔ اس وقت قریشی صاحب اور بھی زیادہ قریب ہو بیٹھتے اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت علامہ دیوان علی سے بلھے شاہ کی کافیاں یا پنجابی گیت سنتے اور مجھ سے فرماتے کہ میں بغداد یا قرطبہ کا کوئی ایسا افسانہ بیان کروں جس سے ان کو نیند آجائے آخر کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ کی طبیعت یہاں تک سنبھل گئی کہ راجہ صاحب سرکاری مشاغل کی مجبوریوں کے باعث غیر حاضر ہونے لگے اور قریشی صاحب سے دوا اور غذا کے متعلق بحث چھڑ جانا شروع ہو گئی۔ حضرت علامہ ان سے ہر دوسرے تیسرے روز اس امر کی خواہش کرتے کہ ان کی غذا کی فہرست میں اضافہ ہو تاکہ انتخاب میں سہولت رہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے "پلاؤ کھانے کو بہت جی چاہتا ہے" قریشی صاحب نے کہا آپ کھچڑی کھا لیجئے۔ فرمایا کیسی "جیسی ہوئی؟ کافی گھی کے ساتھ"؟" انہوں نے کہا "نہیں، گھی کم ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ کا جگر بڑھا ہوا ہے۔" حضرت علامہ کہنے لگے "تو پھر اس میں کیا لذت ہوگی۔ اس میں دہی کیوں نہ ملا لی جائے" قریشی صاحب بولے مگر آپ کو کھانسی ہے ..... دہی مضر ہے" فرمایا "تو پھر اس کھچڑی سے نہ کھانا اچھا ہے۔" بقول قریشی صاحب آخری ایام میں ان کی قوت تنقید بہت بڑھ گئی تھی اور مزاج میں بے حد ذکاوت اور نفاست پیدا ہو چلی تھی اس لئے ان کے سوالات کا ..... کا جواب دینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بعض دفعہ وہ (قریشی صاحب) خود بھی پریشان ہو جاتے۔ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ ان کی بعض علامات دوسرے اسباب کے نتیجے ہیں تو وہ اس شدت سے جرح کرتے کہ جواب بن نہ پڑتا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہر بات ٹھیک ٹھیک بیان کی جائے۔ ۱۶ اپریل کی شام کو جب راجہ صاحب اور سید عابد علی حسب معمول تشریف لائے اور ان سے مصلحتاً یہ کہا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں تو حضرت علامہ بہت خفا ہوئے۔ کہنے لگے "میں جانتا ہوں یہ باتیں تعلق خاطر کی بنا پر کہی جاتی ہیں۔ مگر اس طرح سننے والے غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ دواؤں کے متعلق بھی ان کا کہنا یہ تھا کہ میں انہیں صحت کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ اس لئے کہ شدت مرض سے میری خودی (EGO) کو نقصان نہ پہنچے۔"

باایں ہمہ ان کے اخلاق عالیہ اور کمال وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمولات اور روزمرہ کی زندگی میں انتہائی تکلیف کے باوجود کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنے ملنے والوں سے اسی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملتے جس طرح تندرستی میں ان کا شیوہ تھا۔ بلکہ اب انہوں نے اس بات کا اور بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا کہ ان کی

نع اور خاطر داری میں کوئی فرو گذاشت تو نہیں ہوتی۔ صحت کی اس گئی گذری حالت میں بھی وہ اگر کسی کے کام آسکے
ں سے انکار نہیں کیا اور اپنی قوم کے معاملات میں جہاں تک ممکن تھا حصہ لیا۔ انھیں اپنے احباب کے جذبۂ خدمت گذاری
ڑی قدر تھی۔ اور انہوں نے اپنی خلوتوں میں اس کا اظہار بھی کیا۔ ایک شام جب وہ انتہائی کرب کی حالت میں
علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ ہم نے اسے تسلی دی تو فرمایا۔ "رونے دیجئے تیس پینتیس برس کا ساتھ
جی ہلکا ہو جائے گا۔"

حضرت علامہ ایک زندہ انسان تھے اور آخر وقت تک صحیح معنوں میں زندہ رہے۔ وہ اپنے اردگرد کی زندہ
کو ایک لحظہ کے لئے فراموش نہ کر سکے برعکس اس کے یورپ اور ایشیا کے ایک ایک تغیر کا حال پوچھتے اور
پنے مخصوص انداز میں اس پر رائے زنی کرتے۔ لوگوں نے صرف اتنا سنا کہ آسٹریا کا الحاق جرمنی سے ہو گیا
حضرت علامہ نے فرمایا وسط ایشیا میں چار کروڑ ترک آباد ہیں۔ اتحاد اتراک پر اس کا اثر کیا رہے گا؟"
ں زمانہ میں اٹلی اور برطانیہ کے درمیان گفت و شنید ہو رہی تھی۔ حضرت علامہ اس کی ایک ایک
یل کو سنتے اور فرماتے "اگر اٹلی نے فی الواقع اتحادیوں سے مصالحت کر لی جیسا کہ واقعات سے
اہر ہوتا ہے۔ تو بلادِ اسلامیہ کو مجبوراً روس کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑے گا۔ اس طرح سیاستیات عالم پر
ن کے سبق آموز تبصروں کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار و افکار اور ارشادات کا سلسلہ ہر وقت جاری
ہتا۔ اپنی وفات سے دو روز پہلے وہ راجہ صاحب کے بعض احباب سے شاعر کی ملی حیثیت اور اسلامی
ن تعمیر پر فلسفیانہ بحث کر رہے تھے۔ ان کی گفتگوئیں لطفِ حرارت سے کبھی خالی نہ ہوئیں۔ اور اس
جولانیاں مرتے دم تک قائم رہیں۔ علی بخش اور چودھری صاحب کی چھیڑ چھاڑ مدت سے چلی آتی تھی۔ ایک روز
دھری صاحب کہنے لگے۔ "علی بخش کی مونچھوں کو دیکھتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں آخر ان کا رنگ ہے کیا؟
ر بال کو دیکھئے دوسرے سے مختلف۔" حضرت علامہ برجستہ کہہ اٹھے "مجھُنی"۔

ان کا یہ کہنا کہ دواؤں کا استعمال فائدے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اس لئے کرتا ہوں کہ میری
ودی (EGO) کو نقصان نہ پہنچے لفظ بلفظ صحیح تھا اور معلوم نہیں اس میں دواؤں کو فی الواقع کوئی دخل
تھا بھی یا نہیں بہر حال انہوں نے اپنی قوتِ ادراک اور ذہن کی بیداری کو جس طرح وضع طور پر قائم رکھا
سے دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ ایک رات جب ہم لوگ اس کوشش میں تھے کہ حضرت علامہ سو جائیں۔
دیوان علی نے گانا شروع کیا۔ اور گاتے گاتے سہ حرفی ہدایت اللہ کے چند اشعار پڑھ ڈالے۔ اس پر حضرت
علامہ یک بارگی اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے چودھری صاحب اسے کہتے ہیں۔ "بحرفے اینتے را می تواں کشت"
چودھری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں سر پر ہاتھ پھیرا اور ہوں کہہ کر خاموش ہو گئے۔ حضرت علامہ
فرما رہے تھے "مشرق کیا ایک طرح سے ساری شاعری کا پس منظر یہی ہے۔" میں نے عرض کی کہ ہدایت اللہ
نے موت و سکرات کا جو نقشہ پیش کیا ہے خلافِ واقعہ تو نہیں خود سورۂ ق میں بھی اس حقیقت کی

طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت علامہ نے جواب میں فرمایا۔ "مجھے حقائق سے انکار نہیں، انکار حقائق کی تعبیر سے ہے۔" اور پھر اپنی وہ رباعی لکھوائی جس پر سول ملٹری گزٹ کے کالم سیاہ ہوتے رہے یا جس سے اس کا منصب بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آیا۔ رباعی تھی۔

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست　　بہشتے بہر پاکان حرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(آخری رباعی اس کے چند روز بعد ہوئی۔)

حضرت علامہ نے اپنی بیماری کا مقابلہ جس ہمت اور استقلال سے کیا اس کو دیکھ دیکھ کر اُن کے تیماردار تو کیا معالجوں کو بھی خیال ہونے لگتا تھا کہ شاید ان کا وقت اتنا قریب نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت علامہ نے ایک لمحہ کے لئے بھی مریض بننا گوارا نہیں کیا وہ مریض ضرور تھے مگر انہیں مریض کی حیثیت میں زندہ رہنا منظور نہ تھا۔ ایک دفعہ جب ان کی غذا و دوا اور آرام میں خاص اہتمام ہونے لگا تو فرمایا "اس طرح کی زندگی گویا زندگی سے بغاوت کرنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں دنیا کے قابل نہیں رہا۔" تکلیف کی حالت میں انہیں بے شک تکلیف ہوتی۔ مگر ادھر ذرا احساس کم ہوا اور ادھر ان کی ساری شگفتگی عود کر آئی۔ اب ان کی باتوں میں جو لطف اور دلچسپی پیدا ہو جاتی جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں تھے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان کی طویل علالت نے ان کے ذہن پر کوئی اثر نہ کیا۔ انہیں کوئی اندیشہ تھا نہ پریشانی۔ ان کے پاس ناآشنا دل میں اضطراب اور خوف کی ہلکی سی جھلک بھی پیدا نہ ہوئی۔ گویا موت و حیات کے متعلق جو دلیرانہ اور جرأت آموز رویہ اُنہوں نے عمر بھر اختیار کر رکھا تھا۔ آخر تک قائم رہا۔ اس لحاظ سے وہ فی الواقع خودی کے پیغمبر تھے۔ موت سے بے خوفی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ جب ان کے معالجین کی بے بسی صاف صاف نظر آنے لگی۔ اس وقت بھی ان کو مکروہات دنیوی کا مطلق خیال نہ آیا۔ چنانچہ آخر شب میں انہوں نے جو نصیحت جاوید سلمہٗ کو فرمائی اس کا ماحصل بھی یہ تھا "میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں تم میں نظر پیدا ہو۔" ایک دن جب انہیں درد کی شدت بیتاب کئے ہوئے تھا مجھ سے کہنے لگے۔ "اللہ ہی اللہ ہے" میرے پاس ان الفاظ کا کیا جواب تھا۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے پھر فرمایا "یاد رکھو اللہ کے سوا اور کچھ نہیں۔" میں سمجھتا ہوں اس وقت ان کا ذہن وجود و عدم کے سمندروں سے الجھ گیا تھا۔ اور ان کا اشارہ حضرت بایزید بسطامی[۵] کے اس ارشاد کی طرف تھا جس کا انہوں نے "تشکیل جدید" میں بھی ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک دن حضرت کے حلقہ میں تخلیق کا مسئلہ زیر بحث تھا کہ کسی مرید نے کہا "جب کچھ نہیں تھا تو صرف خدا تھا" حضرت بایزید فوراً بول اٹھے "اور اب کیا ہے؟"

---

۵ حضرت بایزید بسطامی یا حضرت ابوسعید ابوالخیر اس وقت میرا حافظہ ٹھیک کام نہیں کرتا۔

صرف خدا ہے۔"

رہی اسلام سے ان کی شیفتگی سو اس کے متعلق یہ عرض کیا جائے۔ یہ داستان بڑی تفصیل چاہتی ہے، وہ اس کے مستقبل یا خود ان کے اپنے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کے مقدر ([illegible]) سے ایک لحظہ کے لیے بھی مایوس نہیں ہوئے۔ عالم اسلامی کے جدید رجحانات ظاہرا کس قدر یاس انگیز ہیں لیکن ان کی رجائیت میں سرمو فرق نہ آیا۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص بصیرت عطا کی تھی۔ لوگ ان کے پاس آتے اور بے چین ہوکر مادیت و وطنیت کے اس سیلاب کی طرف اشارہ کرتے جو بلاد اسلامیہ میں ہر طرف پھیل رہا ہے۔ حضرت علامہ فرماتے۔ تمہاری نگاہیں قشر پر ہیں اپنے ایمان کو مضبوط رکھو اور منتظر رہو کہ انسان کے اندرون ضمیر سے آخر آخر کس چیز کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت جب سیاست حاضرہ کی بیسہ کاریوں سے عوام اور خواص تو کیا۔ بڑے بڑے حجرہ نشین اور عبادت گزار بھی محفوظ نہ رہے۔ حضرت علامہ کے پائے استقامت کو جنبش تک نہ ہوئی۔ ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ حضرت سالک وغیرہ بھی موجود تھے۔ اور زعیم ترکی کی غیر معمولی فراست کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے کہا اتحاد مشرق کا خیال نہایت مستحسن ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگورہ، کابل اور طہران کا میثاق اتحاد اسلامی کا نتیجہ ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا بے شک، مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کی تکمیل کا راستہ اسلام ہی نے صاف کیا۔" البتہ ایک حقیقت آشنا مبصر کی طرح وہ اس بات کو خوب جانتے تھے۔ کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کی حالت کیا ہے اور ان کے ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا انہیں بڑا دکھ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم لوگ رات کو انھیں اچھی حالت میں چھوڑ کر آتے مگر صبح جب قریشی صاحب پھر ان کی نبض دیکھتے تو ضعف و نقاہت کی انتہا نہ ہوتی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلتا کہ حضرت علامہ ملت کی زبوں حالی پر دیر تک روتے رہے۔ انہیں جدید زمانے کے ان الحاد پرور نظریوں سے بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ جو اندر ہی اندر ہمارے جسد ملی کو کھائے جا رہے ہیں۔ مگر اس پر انہوں نے درویشانہ 'خاموشی' اختیار نہیں کی بلکہ آخر دم تک ان کا مقابلہ کیا۔ یہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ قوم اور ملت کی غیر اسلامی تفریق پر انھوں نے اپنا بیان اس وقت لکھوایا جب رہ رہ کر۔۔۔ ضعف اور اختلاج کے دورے ہو رہے تھے اور قریشی صاحب کو خطرہ تھا کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پر نہ پڑے۔ ان ایام میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

حقیقت را بہ رندے فاش کردند   کہ ملا کم شناسد رمز دیں را

ایک رات انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب   بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

اور اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کے نیازمندوں کو اضطراب ہونے لگا۔ وہ کہا کرتے تھے۔" میں نے اسلام کے لئے کیا کیا؟ میری خدمت اسلامی تو بس اس قدر ہے جیسے کوئی شخص فرط محبت میں سوتے ہوئے بچے کو بوسہ دے" ایک دن مجھ سے حدیث رسول صلعم پر گفتگو فرما رہے تھے۔ جب حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت کا

ذکر آیا کہ حضور رسالت مآب صلعم اپنے بعض اصحاب کے ساتھ اُحد پر تشریف لے گئے اور اُحد کانپ اٹھا تو حضرت علامہ کہنے لگے "یہ محض استعارہ نہیں" اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے۔ (MIND YOU ! IT IS NO METAPHOR) "یاد رکھو یہ محض استعارہ نہیں" انہیں حضور سرور کونین صلعم سے کچھ ایسا عشق تھا کہ آپ کا ذکر مبارک آتے ہی ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں۔ اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حضور صلعم کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں۔

اس دوران میں مرض الموت کی رفتار کچھ عجیب سی رہی۔ اول استسقا کا حملہ ہوا جس سے چہرے اور پاؤں پر ورم آ گیا۔ اب پیٹھ کے درد سے بھی خاصی تکلیف رہتی تھی اور حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ "میری دواؤں کی آزمائش اس میں ہے کہ پیٹھ کا درد جاتا ہے کہ نہیں" مگر پھر رفتہ رفتہ ان علامات میں تخفیف ہونا شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ قریشی صاحب ایک خاص مجبوری کے باعث دو روز کے لئے راولپنڈی تشریف لے گئے لیکن اگلے ہی روز بیماری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ حضرت علامہ کے بائیں جانب تمام جسم پر ورم پھیل گیا۔ اس حالت میں ڈاکٹر جمیعت سنگھ صاحب کو بلوایا گیا انہوں نے معائنہ کے بعد قطعاً مایوسی کا اظہار کیا اور دو ایک باتیں حضرت علامہ سے بھی صاف صاف کہہ دیں۔ بایں ہمہ حضرت علامہ مطلق پریشان نہ ہوئے بلکہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو سن کر انہوں نے اس طرح سوالات کرنا شروع کر دیئے جیسے کسی امر کی تحقیق مقصود ہو۔ ڈاکٹر صاحب گئے تو ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے کوشش کی کہ دو چار کلمات تسلی کے کہیں۔ مگر حضرت علامہ الٹا ان کی تسکینِ خاطر فرماتے ہوئے کہنے لگے "میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا" اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

تیسرے پہر ڈاکٹر جمیعت سنگھ پھر تشریف لائے۔ ڈاکٹر یار محمد خاں صاحب بھی ساتھ تھے۔ شام کو کپتان الٰہی بخش صاحب بھی آ گئے۔ اور باہمی مشوروں سے دواؤں اور انجکشنوں کی تجویز ہونے لگی۔ دوسرے دن قریشی صاحب بھی پہنچ گئے اب ہر قسم کی تجاویز ہو رہی تھیں قدیم و جدید سب۔

بالآخر وہ وقت آن پہنچا جس کا کھٹکا مدت سے لگا ہوا تھا۔ ۲۰ر اپریل کی سہ پہر کو جب میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بیرن فان فلٹ ہائم (VON VELTHEIM) اور ان کے ایک پارسی دوست سے گفتگو کر رہے تھے۔ اور گوئٹے اور نٹشے اور معلوم نہیں کس کس کا ذکر تھا۔ فلٹ ہائم گئے تو چند اور احباب آ گئے جن سے دیر تک لیگ، کانگریس اور بیرونی سیاسیات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ شام کے قریب جب

ان سے معالجین ایک ایک کر کے وہاں جمع ہوئے تو انہیں بتلایا گیا کہ حضرت علامہ کو بلغم میں کل شام سے خون آرہا ہے۔ یہ علامت نہایت یاس انگیز تھی اس لئے کہ خون دل سے آیا تھا۔ اس حالت میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ شاید وہ آج کی رات جاں بر نہ ہوسکیں مگر انسان اپنی عادت سے مجبور ہے۔ تدبیر کا دامن آخر وقت تک نہیں چھوڑتا۔ قریشی صاحب نے بعض دوائیں تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے اسی وقت راجہ صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے پوچھا کار ہے؟ کہنے لگے نہیں مگر کیا مضائقہ ہے۔ ابھی لئے آتا ہوں۔" چونکہ ان کی اپنی کار خراب تھی لہٰذا اتنا کہہ کر راجہ صاحب موٹر کی تلاش میں نکل گئے۔ ادھر ڈاکٹر صاحبان کی رائے ہوئی کہ کرنل امیر چند صاحب کو بھی مشورے میں شامل کر لیا جائے۔ اس اثنا میں ہم لوگ حضرت علامہ کا پلنگ صحن میں لے آئے تھے۔ کرنل صاحب تشریف لائے تو ان کی حالت کسی قدر سنبھل چکی تھی ــــ مطلب یہ کہ ان کے حواس ظاہری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ پھر امید بندھ گئی۔ لہٰذا طے ہوا کہ کچھ تدابیر اس وقت اختیار کی جائیں اور کچھ صبح۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحبان چلے گئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کو رات کے لئے ضروری ہدایات دیتے گئے۔ اب ہوا میں ذرا سی خنکی آچلی تھی اس لئے حضرت علامہ بڑے کمرے میں اٹھ آئے اور حسب معمول باتیں کرنے لگے۔ دفعتاً انہیں خیال آیا کہ قریشی صاحب غالباً شام سے بھوکے ہیں۔ اور ہر چند کہ انہوں نے انکار کیا لیکن حضرت علامہ علی بخش سے کہنے لگے کہ ان کے لئے چائے تیار کرے۔ اور نئے بسکٹ جو میم صاحب نے بنا کر بھیجے تھے کھلائے۔ اس وقت ہم لوگ یعنی قریشی صاحب، چودھری صاحب، سید سلامت اللہ اور راقم الحروف ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت علامہ نے راجہ صاحب کو یاد فرمایا تو ان سے عرض کیا گیا کہ وہ کام سے گئے ہیں۔ ۱۱ بجے تو اس خیال سے کہ ہم لوگ شاید ان کی نیند میں حارج ہو رہے ہیں چودھری صاحب نے اجازت طلب کی لیکن حضرت علامہ نے فرمایا "میں دوا پی لوں، پھر چلے جائیے گا۔" اس طرح بیس پچیس منٹ اور گذر گئے۔ حتیٰ کہ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آگئے۔ حضرت علامہ کو خوراک پلائی گئی۔ مگر اس کے پیتے ہی ان کا جی متلانے لگا اور انہوں نے خفا ہو کر کہا "یہ دوائیں غیر انسانی (INHUMAN) ہیں"۔ ان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر قریشی صاحب نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی جس سے فوراً سکون ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایلوپیتھک کی دوائیں استعمال نہ کریں گے۔ اور جب شفیع صاحب نے یہ کہا کہ انہیں اوروں کے لئے زندہ رہنا چاہیئے تو فرمایا "ان دواؤں کے سہارے نہیں۔ (NOT ON THESE MEDICINES)" اس طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ بالآخر یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ نیند کی طرف مائل ہیں ہم نے اجازت طلب کی۔ انہوں نے فرمایا بہت اچھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ ہو سکے تو قریشی صاحب ٹھہرے رہیں۔ بایں ہمہ

انہوں نے اس امر پر اصرار نہیں کیا۔ اس وقت ۱۲ بج کر ۳۰ منٹ تھے اور کسی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ آخری صحبت ہے جاوید منزل کی!

ہم لوگ حضرت علامہ کی خدمت سے اٹھ کر آئے ہی تھے کہ راجہ صاحب تشریف لے آئے اور آخر شب تک وہیں حاضر رہے۔ شروع شروع میں تو حضرت علامہ کو سکون رہا اور وہ کچھ وقت سو بھی گئے لیکن پچھلے پہر کے قریب بےچینی شروع ہو گئی۔ اس پر انہوں نے شفیع صاحب سے کہا کہ قریشی صاحب کو لے آؤ۔ وہ ان کے ہاں آئے تو سہی لیکن غلطی سے اطلاع نہ کر سکے۔ شاید تین بجے کا وقت ہوگا کہ حضرت علامہ نے راجہ صاحب کو طلب فرمایا۔ ان کا (راجہ صاحب کا) اپنا بیان ہے کہ جب میں حاضر ہوا تو "حضرت علامہ نے دیوان علی سے کہا کہ تم سو جاؤ۔ البتہ علی بخش جاگتے رہے۔ کیونکہ اب اس کے سونے کا وقت نہیں۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ پیچھے کی طرف کیوں بیٹھے ہو، سامنے آجاؤ میں ان کے متصل ہو بیٹھا۔ کہنے لگے قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ۔ کوئی حدیث یاد ہے؟ اس کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ میں نے دیا گل کر دیا اور باہر تخت پر آ بیٹھا۔ راجہ صاحب پہلے آئے تو ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی کہ حضرت علامہ رات کی دوا استعمال کریں مگر انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ فرمایا جب ہم حیات کی ماہیت ہی سے بے خبر ہیں تو اس کا علم (SCIENCE) کیونکر ممکن ہے؟" تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب کو پھر بلوایا گیا۔ حضرت علامہ نے ان سے کہا آپ یہیں کیوں نہیں آرام کرتے اور پھر ان سے قریشی صاحب کے لانے کے لئے کہا۔ راجہ صاحب کہتے ہیں "میں اس وقت کی حالت کا مطلق اندازہ نہ کر پایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب رات دیر سے گئے ہیں شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو" اس پر حضرت علامہ نے فرمایا کاش ان کو معلوم ہوتا مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔" پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو گذشتہ دسمبر میں انہوں نے لکھی تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب کہتے ہیں میں نے ان اشعار کو سنتے ہی عرض کیا کہ ابھی حکیم صاحب کو لاتا ہوں۔ یہ واقعہ ۵ ـــ ۵ کا ہے۔ راجہ صاحب گئے تو حضرت علامہ خواب گاہ میں تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ہدایات فروٹ سالٹ تیار کیا۔ حضرت علامہ بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہنے لگے۔ اتنا بڑا گلاس کس طرح پیوں گا؟" اور پھر چپ چاپ سارا گلاس پی گئے۔ علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی۔ اب اس کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ حضرت علامہ نے اول اسے شانوں کو دبانے کے لئے کہا پھر دفعتاً لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا لئے۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "یا اللہ" ـــ پھر فرمایا "میرے یہاں درد ہے"۔ اس کے ساتھ ہی

سر پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ علی بخش نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ تو انہوں نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح وہ آواز جس نے گذشتہ ربع صدی سے ملتِ اسلامیہ کے سینے کو سوزِ آرزو سے گرمایا تھا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ انہوں نے خود اپنے ارشادات کو کاروانِ اسلام کے لئے بانگِ درا سے تعبیر کیا تھا۔ اور آج جب ہماری اجڑی ہوئی محفل ان کے وجود سے خالی ہے تو ان کا یہ شعر بار بار زبان پر آتا ہے۔

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

---

۲۱ اپریل کی صبح کو میں سویرے ہی اٹھا اور حسبِ عادت جاوید منزل پہنچ گیا۔ لیکن ابھی پھاٹک میں قدم رکھا تھا کہ راجہ صاحب نظر آئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں سمجھا رات کی بے خوابی کا اثر ہے۔ میں ان کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "رات آپ کہاں تھے؟ آپ کا دیر تک انتظار رہا۔" وہ معلوم نہیں ہاتھ سے کیا اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو قریشی صاحب سر جھکائے ایک روش پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے ان سے حضرت علامہ کی خیریت دریافت کی تو ایک دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز میں ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا "فوت ہو گئے۔"

میں ایک لمحے کے لئے سناٹے میں تھا۔ پھر دفعتاً حضرت علامہ کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ پردہ ہٹا کر دیکھا تو ان کے نور آلود چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم اور سکون و متانت کے آثار نمایاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ بہت گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ میں پلنگ سے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ شاید وہاں اور حضرات بھی بیٹھے تھے۔ لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہاں راجہ صاحب کو دیکھا۔ وہ ان کی پائنتی کا سہارا لئے زار زار رو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر میں اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکا۔ اور بے قرار ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں حضرت علامہ کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ اب جاوید منزل میں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ یہ سانحہ کچھ اس قدر عجلت اور بے خبری میں پیش آیا کہ جو شخص آتا یہی کہتا "کیا ڈاکٹر صاحب فوت ہو گئے! علامہ اقبال ....." گویا ان کے نزدیک یہ خبر ابھی غلط تھی۔ حالانکہ وہ گھڑی تو جو برحق ہے اور جس کا ایک دن ہر کسی کو سامنا کرنا ہے آ پہنچی تھی۔ کل من علیہا فان، ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

جنازہ سہ پہر میں ۵ بجے کے قریب اٹھا۔ جاوید منزل کے صحن اور کمروں میں خلقت کا ازدحام تھا۔ معلوم نہیں ان کے غم میں کس کس کی آنکھیں اشک بار ہوئیں اور میو روڈ سے شاہی مسجد تک کتنے انسان جنازے میں شریک تھے۔ ہم لوگ لاہور کی مختلف سڑکوں سے گذر رہے تھے۔ شہر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا جدھر دیکھئے حضرت علامہ ہی کا ذکر تھا۔ جنازہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اخباروں کے ضمیمے، قطعات، اور مرثیے تقسیم ہونے لگے۔ دفعتاً خیال آیا کہ یہ اس شخص کی میت ہے جس کا دل دوبارہ رفتہ رفتہ اسلام میں اس طرح کھو گیا کہ اس کی نگاہوں میں اور کوئی چیز جچتی ہی نہیں تھی۔ اور جو مسلمانوں کی بے حسی اور اغیار کی چیرہ دستی کے باوجود یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا۔

گرچہ رفت از دست ما تاج نگیں ما گدایاں را بچشم کم مبیں

معلوم نہیں ساحر افرنگ کی تہذیب کے دلدادوں نے اسے کس کس راہ سے سمجھایا کہ اس کی قوم کی نجات تہذیب نو ہی کی پرستش میں ہے مگر اس کے ایمان سے لبریز دل میں نبی امی صلعم کی محبت بے اختیار کہہ اٹھی :-

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ جنازہ تو بیشک اقبال ہی کا ہے لیکن کیا اقبال کی موت ایک لحاظ سے ہندوستان کے "آدمی" مسلمان کی موت نہیں۔ اس لئے کہ وہ اسلام کا نقیب تھا۔ رازدار تھا۔ اور اب کون ہے جو علامہ مرحوم کی مخصوص حیثیت میں ان کی جگہ لے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مقامات عالیہ سے سرفراز فرمائے۔ اور ان کو اپنی رحمت اور مغفرت کے سائے میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

دانائے راز ـــــــ شارع قائدِ اعظم پر

پہلی ملاقات

از جناب محمد یامین نقش (علیگ)

رات میں ذرا دیر میں سویا، دماغ میں اپنے موجودہ حالات پر ایک ہیجان بپا تھا، خدا جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ قومی کردار، نوجوان نسل، تعلیمی حاصلات اور نہ جانے کیا کیا کہ .... عالم رویا میں پہونچ گیا اور دیکھا کہ کسی ضرورت سے گلبرگ سے چل کر شارع قائدِ اعظم تک گیا ہوں۔ ایک دوکان سے کچھ اشیائے ضرورت خریدنے کے بعد سڑک پر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ سے کچھ دور ایک جمِ غفیر اسکول کے بچوں، کالج کے طلبا، کچھ فارغ التحصیل اور کچھ ان پڑھ لوگوں کا کسی کو گھیرے میں لئے غل غپاڑہ مچا رہا ہے۔ طبعِ انسانی تجسس پسند ہے ہی، اس لئے لازمی تھا کہ میں دریافت حال کے لئے اس طرف بڑھوں، نزدیک پہونچا تو تھوڑی دیر کے لئے ششدر و حیران رہ گیا اور سوچا یہ کیا دیکھتا ہوں۔ نظر کہہ رہی تھی کہ دیکھ تیرے سامنے وہی ہستی ہے جس کو تو نے اگرچہ جیتے جاگتے نہیں دیکھا تھا مگر جس کا تو دل سے شیدائی رہا ہے اور اب بھی ہے مگر تخیل کہتی غلط، بالکل غلط، عالمِ ارواح کے باسی کا یہاں کاخ و کو میں گذر بعید از قیاس۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ پہلو سے آواز آئی جب میں قبول کرتا ہوں تو یہ جھجھک کیسی ؎ دلیلِ راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا۔

یہ سنتے ہی میں آگے بڑھا اور للکارا کہ اے نا اہل و نا قدر شناسو ہاٹ جاؤ اور اس محترم ہستی کو پریشان نہ کرو۔ میں بہت ہی ملائم آواز میں گفتگو کا عادی ہوں مگر اس وقت نہ جانے آواز سے تیزی اور درشتی اور تحکم کس طرح پیدا ہو گیا کہ تمام بھیڑ چھٹ گئی۔ میں اس کے بعد فوراً آگے بڑھا اور اس بزرگ ہستی کے پاس پہونچا جس کے لئے حالی کہہ گئے ہیں ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبِ جواناں ‌ ‌ ‌ دیرینہ سال پیرے بردلبش بیک نگاہے

اور بصد تعظیم ہاتھ میں ہاتھ لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ یہ بزرگ مجھے حیرانی سے تکنے لگے اور جب میں نے جذبات پر قابو پایا اور ان کی جانب دیکھا تو لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاکر پوچھا "عزیزمن تم کون ہو، مجھے کس طرح جانتے ہو اور میری تعظیم اس قدر کیوں کر رہے ہو۔ تم مجھے ان لوگوں سے جو مجھے ابھی گھیرے ہوئے تھے۔ اور نہ جانے

کیا کیا پھبتیاں مجھ پر کس رہے تھے۔ کچھ الگ قسم کے آدمی نظر آتے ہیں۔ میں نے عرض کیا حضور! جو چمنِ تعلیم آپ نے علی گڑھ میں لگایا تھا، جس کو دل و جگر کے خون سے سینچا تھا اور محبت سے پروان چڑھایا تھا، اسی چمن کا ایک پروردہ نہال ہوں۔ میں چھ برس کے سن میں اس کی آغوش میں سونپا گیا تھا۔ اور بارہ برس کے بعد اس سے الگ ہوا۔ میرا گوشت پوست، میری تعلیم و تربیت، میری زندگی، میرا شعور، میرا چال چلن اسی چمن کا مرہون منت ہے تو پھر آپ کو کیونکر نہ پہچانتا اور تعظیم دیتا۔ وہ ایک دل سوز انداز میں مسکرائے اور فرمانے لگے۔ عزیز من! میں تم سے بے حد مسرور ہوا۔ خدا کا شکر ہے، میری محنت اکارت نہ گئی اور میری عرق ریزی بیکار نہ گئی۔ اور جو کچھ میں سوچا کرتا تھا وہ کسی حد تک پورا ہوا نظر آتا ہے۔ سو تم اور تمہارے جیسے طلبا اس درس گاہ سے نکلے۔

میں نے عرض کیا مگر حضور آپ یہاں کہاں اور عالم ارواح سے یہاں کیونکر آنا ہوا۔ وہ مسکرائے اور بولے میاں اس راز سربستہ کو نہاں ہی رہنے دو، بہر حال چونکہ تم اس تعلیم گاہ سے تعلیم و تربیت پاکر نکلے ہو جو میں نے شروع کیا تھا تو اس قدر بتلائے دیتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد میری یہ خواہش تھی کہ اس اسلامی مملکت کو جس کا خواب کبھی میں دیکھا کرتا تھا اور جس کے لئے میرے گلستان کے پھولوں اور کلیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اسے دیکھوں اور یہ معلوم کروں کہ انہوں نے اپنے بچوں کی بھی تعلیم و تربیت کے لئے کچھ کیا ہے۔ یہ میری خواہش آج پوری ہوئی۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بہ دیدۂ پُرنم عرض کیا حضور یہ داستان اَن سُنی ہی رہ جائے تو بہتر ہے۔ کس کا دل اور کس کا جگر لاؤں جو اس دلخراش اور اندوہناک داستان کو حضور کے گوش گزار کروں۔ اگر آپ مصر ہیں تو اس خیال سے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ میں حضور کو یہاں کی افضل ترین درس گاہ تک لئے چلتا ہوں اور بجائے میری زبانی حالات سننے کے آپ اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ فرما لیں اور کانوں سے داستان سُنیں کہ سب حالات پوست کندہ آپ پر منکشف ہو جائیں۔ انہوں نے بہ لطف و کرم فرمایا مجھے تمہاری رائے پسند آئی ہے چلو بسم اللہ کرو اور قدم اٹھاؤ۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ان کو اپنے ہمراہ لے کر مختلف عمارات دکھاتا۔ نیلے گنبد پہنچا اور وہاں سے کچہری روڈ پر چل کر کالج کے پھاٹک سے گذرنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹھہرنے کو کہا۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ اور ٹھہر گیا۔ عین پھاٹک کے سامنے کچھ طلبا سگریٹ کا دھواں اڑا کر خوش گپی میں مصروف تھے اور موضوعِ گفت گو کچھ لڑکیاں تھیں کچھ نازنینانِ فلم تھیں۔ مگر جو کچھ ان کے متعلق کہا جا رہا تھا وہ اس تہذیب سے قطعی دور تھا۔ جو دانائے راز کی تھی۔ باتوں میں توجہ لینے والوں میں سے ایک بہت نازک اندام تھے، ایک سبز قمیض اور شلوار میں ملبوس تھے اور قمیض کے گریبان کے دونوں طرف جھالر ٹکی تھی، سر کے بال

شانہ پر گھونگر ڈال کر لٹکائے گئے تھے قلمیں ۔۔۔ گھنی تھیں اور کان کی لو سے نیچے تک لٹکی تھیں۔ مگر مونچھ ندارد تھی۔ ایک اور صاحب تھے جو گلابی شلوار اور قمیض میں ملبوس سر منڈے اور بڑی بڑی مونچھیں لٹکائے سلیم شاہی جوتی پہنے بکری کی طرح کھڑے پان چبا رہے تھے۔ اور بغیر اس بات کے سوچے کہ راہگیروں پر ان کی پان کی پیک کس طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھی۔ باتوں میں مگن تھے۔ میرے تیرا کی ساتھی کے منہ سے بے ساختہ استغفر اللہ نکلا۔ پھر پوچھا عزیزمن یہ سامنے جو کچھ دیکھ رہا ہوں کس صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں مسکرایا اور بولا حضور آجکل کچھ کالج کے طلبا کا یہی فیشن ہے۔ دریافت فرمایا کیا ان کو ٹوکنے سمجھانے اور دیکھنے والا کوئی نہیں۔ میں نے عرض کیا جن کو ان کی دیکھ بھال کرنا تھی جن پر ان کی اولین تربیت فرض تھی وہ اپنی دھن میں مست ہیں، نہ دین کی خبر ہے نہ دنیا کی۔ کلب کی زندگی ہے، عیاشی ہے، شراب نوشی ہے اور عالم اسباب سے کم آگاہی ہے۔ بہرحال اگر آپ کچھ اور آگے تشریف لے چلیں تو کچھ اور بھی سامان آپ کی نگاہ کے لئے موجود ہے۔ کیونکہ میں تو ہر حال سے چیخ و پکار کی صدائیں سُن رہا تھا۔ فرمایا چلو یہ بھی دیکھیں، ہم چل کر کچہری کے چوراہے پر ٹھہر گئے اسکول اور کالج کے طلبا کا ایک ہنگامہ خیز دریا تھا جو ٹھاٹھیں مارتا، جھنڈوں پر مختلف تحریکوں اور مطالبوں کے آویزے لٹکائے لئے جا رہے تھے۔ پوچھا یہ کیا حشر بپا ہے۔ عرض کیا کہ حضور یہ اپنے پرنسپل کو ایک کمرہ میں اور اساتذہ کو دوسرے کمروں میں بند کر چکے ہیں۔ اور اب ان کو دیس نکالا دینے جا رہے ہیں۔ حیرت ہو کر پوچھا کیا یہ بھی ممکن ہے۔ میں نے عرض کیا جشن کی کامیابی آپ کے پیش نظر ہے۔ پوچھا مگر یہ کیوں۔ عرض کیا اس میں کچھ اساتذہ کا بھی قصور ہے۔ اسکول اسکول، کالج کالج دھڑے بندیاں ہیں ایک دوسرے کے درپئے آزار ہیں۔ استاد اپنے تلامذہ کو اپنا آلۂ کار بنانے میں وقت صرف کرتا ہے۔ اپنے شیشے میں اتارتا ہے جس استاد اور شاگرد کے رشتے کو آپ یاد فرما رہے ہیں۔ اور جو علی گڑھ کی فضا میں پروان چڑھا تھا وہ یہاں نہ ہے نہ کبھی ہو سکے گا۔ پھر ان کچی کلیوں کو گلچین چمن یعنی سیاسی جماعتوں نے برباد کیا ہے اور جو دن ان کے پڑھنے سیکھنے کے ہیں، ان کو جماعتی سیاست کے بکھیڑوں میں برباد کیا جاتا ہے۔ آئے دن سر پھٹول اور مار دھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر سب سے بدتر چیز جس نے ان کو تباہ و برباد کیا اور کر رہی ہے وہ صوبائی تعصبات ہیں جن کو علی گڑھ نے فنا کر دیا تھا اور تمام ہندوستان کے طلبا کو علیگی بنا کے ایک کر دیا تھا۔ مگر آجکل پاکستان میں یہ لعنت آکاش بیل کی طرح دن دونی رات چوگنی پروان چڑھ رہی ہے۔ پھر جو کچھ تعلیم ہو بھی رہی ہے، وہ اس قدر ناقص ہے کہ اس سے تو جہلِ مرکب بھی زائد بہتر ہوگا۔ یہ سُن کر وہ فرمانے لگے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو جب موقعہ ملا تو انہوں نے اُس کو یوں برباد کر ڈالا۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے کے بعد اپنی افسردگی اور حسرت کو بیان نہیں کر سکتا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا "عزیزمن کیا یہاں کہیں ایسی جگہ بیٹھنے کے لا

میسر آسکتی ہے جہاں یہ شور و شر نہ ہو اور میں اطمینان سے باقی الضمیر تم کو بتا سکوں۔ میں نے عرض کیا کہ غریب خانے تک اگر حضور زحمت فرمائیں تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کچھ سوچ کر پھر فرمایا اچھا چلو تاکہ اطمینان کا سانس لوں اور تم کو سمجھاؤں کہ اگر اس کشتی کو گرداب بلا و فنا سے بچانا مقصود ہے تو کون سے اقدامات کرنا پڑیں گے۔

میں دانائے راز کو لے کر گھر پہونچا اور نشست گاہ میں بیٹھ کر چائے لانے کی اجازت چاہی مگر انہوں نے فرمایا عزیز من ان تکلفات کو الگ رکھو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور میری باتیں سنو۔ اور اگر تم سے ممکن ہو سکے تو اہل پاکستان کے گوش گذار کر دو۔ میں نے سر تسلیم جھکا دیا اور قلم اور کاغذ لے کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ بہت مصر ہوئے کہ میں برابر کی کرسی پر بیٹھ جاؤں مگر میں نے یہ کہہ کر کہ یہ سوء ادب ہوگا وہیں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی مگر چہرہ کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ دل و دماغ میں کوئی ہیجان بپا ہے اور وہ اپنے خیالات کو ایک مسلسل کڑی میں ترتیب دینے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ میں بھی خاموش محبت بھری نگاہوں سے انہیں تکتا رہا۔ وہ بھی نیچی نگاہیں کئے خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور یوں گویا ہوئے:

"جو کچھ آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی غایت اور منشا ہی آج کے خداوندان تعلیم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے جو یہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ فرد ایک نیک اور عمدہ قسم کا باشندہ ہو جائے۔ سوشل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کرے اور ان بھاری اور اچھے کاموں کا حوصلہ دلائے جس سے ملک کی عزت اور زینت ہو، مگر یہ سب صرف کتابوں کی تعلیم سے ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ایک عمدہ سوسائٹی سے ہوگی۔ مسلمانوں کی قدیم سوسائٹی تقریباً ختم ہو چکی ہے اور جو اکا دکا (ا) کی یادگار باقی ہیں۔ ان کا نہ بھرم رہا ہے اور نہ وہ اب قابل اعتنا رہی ہیں۔ کیونکہ نئی سوسائٹی جو تشکیل پا رہی ہے یا پا چکی ہے اس کی بنیاد بیرونی ممالک کے اصولوں پر پڑی ہے جو کسی مسلمان ملک کے لئے عموماً اور پاکستان کے لئے خصوصاً کسی صورت میں بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ خواہ ہو اسکول کے ہیں یا کالج کے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے قطعی بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اس کی وجوہ کیا ہیں۔ یہ اہل دانش و بینش کو خود تلاش کرنے ہوں گے۔ اساتذہ کا فرض اولین یہی ہے کہ وہ اپنے طلباء کو یہ ذہن نشین کرا دیں کہ اعلیٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ اولوالعزمی زندگی میں کامیابی کے لئے ازحد ضروری ہے۔ پھر مجھے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ حقیقی مذہبی تعلیم کا بھی فقدان ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ جب تک یہ تعلیم کے ساتھ شامل

کی جائے گی۔ نتائج خاطر خواہ نہ ہو سکیں گے۔ چند لمحوں میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہی ہے کہ ہماری نئی نسل کو رانہ تقلیدِ مغربی کی شکار ہے۔

مجھے یہ بھی نظر آرہا ہے کہ پاکستان میں تعلیم اور تربیت کو ہم معنی سمجھا جارہا ہے جو ایک عظیم غلطی ہے۔ تعلیم کا فرض یہ ہے کہ انسان کے اندرونی قوئی کو حرکت میں لائے اور شاداب و شگفتہ کرکے دل کے سوتوں کو کھولے اور اندر کے سرچی چشموں کے پانی کو باہر نکالے اور تربیت انسان کو احکام کے لائق بنادے۔ اس لئے جب تک تعلیم کے ساتھ تربیت بھی اچھی نہ ہوگی ملک میں اچھی سوسائٹی کا فقدان ہی رہے گا۔ اس لئے خداوندان معلم کو چاہیئے کہ پاکستان میں وہی طریقۂ تعلیم جاری کریں جس سے اول الذکر مقاصد پورے کئے جاسکیں۔

میں تم سے ملنے سے پہلے ایک اخبار فروشی کی دوکان سے گزرا تو کچھ اردو اخبار اٹھا کر دیکھے تو میری حیرانی کی انتہا ہی نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اتنی مدت قیام پاکستان کو گزری، مگر یہاں مفلسی، نالائقی، چوری چکاری، قتل، غارت، بدمعاشی اور چور بازاری کی خوب گرم بازاری ہے۔ یہ صورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں کی تعلیم حسب احتیاج وقت نہیں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حکومتِ وقت، قوم کے افرادِ عقل و فراست سے مشورہ کرے اور ایسا سلسلۂ تعلیم جاری کرے کہ جو مسلمانانِ پاکستان کو ذلت اور مسکنت سے بچائے اور اُن کو دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

اس قدر گفتگو کے بعد انہوں نے میری طرف بہ نظرِ التفات دیکھا اور فرمایا وقت اب تنگ ہے۔ اور مجھے واپس جانا ہے۔ جو کچھ ابھی مجھ کو کہنا ہے ایک داستان طویل ہے اس لئے اس بحث کو ختم کرتا ہوں اور اگر اجازتِ ربی ملی تو کل پھر آؤں گا اور اس سلسلے میں جو کچھ مزید کہنا ہے اسے ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اور جب سر کچھ کہنے کو اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ وہ نشست جہاں دانائے راز تشریف فرما تھے، خالی تھی۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ کروٹ

بدلی تو آنکھ کھل گئی۔ میری زبان سے نکلا سے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

پھر دل گواہی دیتا ہے کہ دانائے راز حسب وعدہ ضرور تشریف لائیں گے اور جو مزید مشورے مجھے تلقین فرمائیں گے میں ان کو اہل پاکستان تک بہن وعن پہونچانے کی کوشش کروں گا۔

دوسری ملاقات

میں آج صبح کو ناشتے کے بعد باہر نکلا اور پھاٹک سے باہر اور باہر سے اندر چکر کاٹنے لگا (ابھی) دوسرا چکر لگا یہ پھاٹک کی طرف سے جا ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ دانائے راز مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ میرے قریب پہونچنے تک وہ پھاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔ میں آگے بڑھا اور نہایت ادب سے ہاتھ میں ہاتھ لے کر بوسہ دیا۔ اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر صحن میں ان کو لے کر پہونچا جہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ ان کو بٹھا کر ابھی دل کی بات زبان پر لایا بھی نہ تھا کہ دانائے راز نے مسکرا کر فرمایا "خورد و نوش کی دعوت بیکار ہے آؤ میرے پاس بیٹھ کر میری باتیں سنو!

میں تمہیں تعلیم و تربیت اور سیاسی شعور کے متعلق کچھ سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کو کچھ حد تک کارخانۂ قدرت کو بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل ہے۔ وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے کہ دنیا کی آئندہ رفتار کو روک سکتا ہے، یا ترقی دے سکتا ہے۔ یا بہتر اور خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔ جب بچے پر نظر ڈالو تو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے اس کی عقل اور فہم میں ترقی ہوتی ہے اور ہماری تعلیم و تربیت اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے اس میں عمدہ اور صحت بخش عادتیں اور خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یا بری بری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے اس میں بدعادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہرحال لڑکپن کا موسم گذر جاتا ہے۔ اور جو کچھ بچے نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہے اس کا اثر اس کی زندگی پر رہتا ہے۔ یہاں ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) کا قول نقل کرنا بے جا نہ ہوگا کہ "لڑکپن کی طبیعت اس قدر اہم چیز ہے کہ آئندہ بھلائی یا برائی (سی) کی احتیاط یا بے احتیاطی پر منحصر ہے۔ اور یہ بچے کے مربیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔" عموماً لڑکپن کا زمانہ ۷ سے ۱۵ سال تک سمجھا جاتا ہے اور اسی زمانہ میں آئندہ بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش کرنا چاہیئے۔ اس عمر میں بچے کا دل ہر چیز کے سمجھنے کا متلاشی رہتا ہے۔ حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اور قوت غور مفقود ہوتی ہے۔ یہی زمانہ بچے کے لئے ذہنی عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ چونکہ اس وقت تعلیم و تربیت کو دل بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ اور اس تخم کو جس سے آئندہ نہایت دل پسند اجاذب نظر اور قبول خاطر پھول اور پھل پیدا ہوں گے بہت جلد اگا دیتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں اگر تربیت نہ ہو۔ تو جیسے جیسے ایام گذرتے جاتے ہیں عادات و اطوار میں پختگی آتی جاتی

یہاں تک کہ آخر کو عادت طبیعت سے مل جاتی ہے اور طبیعتِ ثانی کہلاتی ہے جس کا بدلنا آگے چل کر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو طالب علم کہ حقیقی تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رہتا ہے ان سے قوم اور ملت کی کیا امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں۔

اب میں تربیت کی طرف آتا ہوں، اس کے لئے صرف علوم مفیدہ کا پڑھنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ بچے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت میں بسر ہونا ضروری ہے جس سے دن بدن خیالات میں وسعت ہوتی جائے اور اس کی امنگ بڑھتی جائے۔ اور اس کے قوا شگفتہ اور شاداب رہیں۔ اور غیرت ہمیشہ ترقی کی طرف مائل رہے۔ یہ تسلیم کہ نماز پڑھنا روزہ رکھنا اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ فی نفسہ بہت اچھی اور عمدہ بات ہے۔ مگر اس کی تعلیم اگر ایسے بد طریقے سے ہو جیسے کہ اب مسلمانوں میں مروج ہے تو بجز اس کے کہ برے تعصبات بڑھیں، نیکی اور نیک دلی کے صفات ذمیمہ ترقی پائیں اور پھر دل میں رحم اور رقت، ہمدردی اور محبت، سچائی اور راستبازی مطلق اثر نہیں کرنے پاتی اور اس قسم کا تربیت یافتہ شخص فخر اسلام ہونے کے بجائے ننگِ اسلام ہو جاتا ہے۔ اس لئے راست باز، متدین، پرہیزگار عالی ہمت، مستقل مزاج اور رنج و الم میں ثابت قدم بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ کو صرف یہ سب کچھ بتایا ہی نہ جائے بلکہ اس کو سمجھنے کے مواقع بھی فراہم کئے جائیں۔ کہ فلاں چیز درحقیقت اچھی ہے اور ہر چیز کی قدر و قیمت محض اس کی اچھائی ہی پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت کو تعلیم کا بہت بڑا درس تسلیم کرتے ہوئے علی گڑھ میں طلباء کی تربیت پر حتی المقدور کوشش کی گئی تھی۔ اور تم کو دیکھ کر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔

آؤ اب ذرا مذہبی تعلیم پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ اگر پاکستان واقعی حقیقی ترقی کا خواہشمند ہے اور قوم کو تہذیب اور شائستگی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچانا چاہتا ہے تو ایسی مذہبی تعلیم ازحد ضروری ہے۔ جو ہمارے اسلاف نے شروع کی تھی کیونکہ پسندیدہ اخلاق مذہب پر مضبوطی سے قائم رہے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ عام تعلیم کا رواج بغیر شمولِ تعلیم مذہبی کسی قوم میں ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ افسوس کا مقام ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فکر کو اب تک فراموش کیا گیا ہے۔ آج پاکستان میں شرفا اور معززین اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط حال لوگ بھی مغربی تعلیم انگریزی طرز پر بچوں کی تعلیم و تربیت کراتے ہیں۔ بذاتِ خود یہ طریق کار قطعی معیوب نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ ان کو اپنی مذہبی اور دینوی تعلیم سے بھی بہرہ ور کرتے رہیں۔ کہ وہ صورتِ حال نہ پیدا ہو سکے جس کا انجام دہریت، الحاد اور مذہب سے قطعاً بے تعلقی ہو جاتی ہے۔ اور یہ اگر میری آنکھوں اور کانوں نے غلطی نہیں کی ہے تو پاکستان میں دن دونی اور رات چوگنی بلا روک ٹوک بڑھتی جا رہی ہے۔

اچھا یہاں یہ بھی بتا ہی دوں کہ اس سے تو کوئی ملحد ہی انکار کرے گا۔ کہ سچا مذہب جو درحقیقت خدا کی طرف سے دیا گیا ہو۔ اور جس میں فطرتِ انسان میں دخل در معقولات کر کے اس کو مسخ نہ کر دیا ہو وہ انسان کی کسی قسم کی ترقی کا

مانع نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ کیونکہ انسان کا تنزل لوازم انسانیت سے خدا کا مقصد نہیں ہے ورنہ انسان کو انسان بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ مگر جب کسی مذہب میں بھی لغو خیالات، بد تعصبات اور شرک و بدعت داخل ہو جائیں تو وہ انسان کی ترقی کا مانع بن جاتا ہے۔ اور جب لغو اوہام رسومات ملکی اور قومی کا اس میں خلط ہو جاتا ہے تو یہ سم قاتل بن جاتا ہے۔ تم پاکستان کی طرف نظر کر کے دیکھو تو تم کو میری اس گفتگو کا مفہوم بخوبی معلوم ہو جائے گا۔

بھائی میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ مقابر کی پرستش ہو رہی ہے۔ ان کو غسلِ صحت دیا جا رہا ہے۔ ان پر پھولوں کی چادریں ڈالی جا رہی ہیں۔ بیش قیمت شال اوڑھائے جا رہے ہیں، سہرا بندی ہو رہی ہے منتیں مانگی جا رہی ہیں اور سَم بالائے سَم سجدے کئے جا رہے ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا دنیا میں کامیابی سے جینے کی یہی باتیں ہو سکتی ہے۔

یہ قبول کرتا ہوں کہ کوئی قوم کوئی ملک آج ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کے خیالات نہ ہوں مگر یہ بات بھی نمایاں ہے کہ جس ملک میں مذہبی تعصب ناواجب اور جہالت آمیز توہمات اور خیالات احمقانہ اور وحشیانہ کم ہیں وہاں اسی قدر انسانیت کو ترقی ہے۔ لہٰذا اب یہ بہت ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم کو یا تو مولویوں کے ہاتھوں سے لے لیا جائے اور کچھ فہمیدہ ذی عقل و ذی علم لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ اور بعد از بحث و مباحثہ یہ بات قرار دیں کہ سلسلۂ تعلیم بہ نظر حالات زندگی اور مطالب دنیوی جو کارآمد ہو وہ تجویز کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مولویوں کو بھی دورِ حاضر کی ضروریات کے مدِ نظر رکھ کر ایسی تعلیم دی جائے جو ان کو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں کے مذہبی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ دوسرے ملکوں میں دیکھو گرجوں میں کوئی پادری اس وقت تک نہیں مقرر کر لیا جاتا جب تک کہ اس کے پاس مذہبی تعلیم کی ڈگری نہ ہو۔ پھر ان کی تنخواہ بھی معقول مقرر کی جاتی ہے۔ بجائے اس کے ہمارے یہاں کے مسجد کے ملا بیچارے در در کے بھکاری ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے اعلیٰ و ارفع خیالات کی امید رکھنا بھی تو جائز نہیں۔ ہاں تو جس طرزِ تعلیم کا میں ذکر کر رہا تھا وہ سب کام محض حکومت وقت ہی کی ذمہ داری، تو نہیں ہے اس کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ اور وقت بھی درکار ہوگا۔ مگر یہ ایسی مشکل نہیں ہے جس کا حل ممکن نہیں اگر اہلِ ملک کا دل، ارادہ اور صحت چاہے تو چشم زدن میں کروڑوں روپیہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ مگر پہلے اس کے کہ یہ معجزہ ابنائے پاکستان میں رونما ہو اہلِ پاکستان کے چال چلن، رہن سہن، نشست و برخاست اور ارادہ میں عمل میں تغیر لانا ضروری ہوگا۔ ہاں سرِ دست یہ ہو سکتا ہے کہ اس روش کو چلانے کے لئے حکومتِ وقت ہر کس و ناکس پر حسبِ توفیق ایک ہلکا سا ٹیکس لگا دے جس طرح میں نے سنا ہے کہ عالمگیری مسجد کی مرمت کے لئے سر سکندر مرحوم نے لگایا تھا۔ تو میری دانست میں اس قدر سرمایہ بہم پہونچ سکے گا کہ اگر تمام ملک میں نہیں تو اس کے بیشتر حصوں میں اس قسم کی تعلیم کو مروج کیا جا سکے گا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ مذہبی تعلیم مولویوں کے ہاتھوں سے لے لینی چاہیئے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ بیچارے

مولویوں کو متہم کیوں کیا جائے۔ کیا ان کو ایسی اعلیٰ تعلیم اور بہتر آسائش دی گئی ہے کہ ہم اُن سے اس سے زائد جو کچھ وہ کر رہے ہیں، کی امید رکھیں۔ مسجد ہی ایک ہی مسلم ہے۔ اگر اس کو واجبی اور حقیقی مذہبی تعلیم جو دینی اور دنیوی دونوں پر مبادی ہو، دی جائے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو جو آوارہ گرد راستہ مارے پھرتے ہیں۔ مسجدوں میں بٹھا کر اچھی تعلیم کے زیور سے کیوں نہ آراستہ کر سکیں۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف ان لوگوں کا موجودہ زمانہ کی روشنی میں اچھی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ بلکہ حسب ضرورت ان کے لئے گذر اوقات کے لئے تنخواہ بھی مقرر کی جائے تاکہ وہ سکونِ دل و دماغ سے اہم کام انجام دے سکیں۔ مگر آجکل یہ صورت ہے کہ بیچارہ مولوی جو نامکمل تعلیم کا مالک دردر کے ٹکڑوں پر مسجد میں زندگی گذارتا ہے۔ کس طرح بچوں اور بالغوں کو درست تعلیم سے آراستہ کر سکتا ہے۔ اور ان کا جہل مرکب دور کر سکتا ہے۔ یہ بات اہلِ ملک اور حکومتِ وقت کے لئے ایک بہت ضروری کام ہے اور یہ ان کے اشتراکِ عمل ہی سے سرانجام پائے گی۔

مجھے بہت افسوس اور رنج سے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس چوبیس سالہ زندگی میں پاکستان جو اعلیٰ تعلیم کہلاتی ہے وہ درحقیقت ایسی نہیں ہے۔ آجکل ملک میں جتنی یونیورسٹیاں ہیں ان میں کوئی خاطر خواہ ربط و رسم نہیں ہے۔ ہر یونیورسٹی ایک دوسری سے بازی لے جانے پر تُلی رہتی ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ ہر یونیورسٹی میں ہر قسم کی تعلیم دلانے کی کوشش کی جائے۔ جبکہ اچھے اساتذہ کی بھی ضرورت سے زیادہ ہی کمی ہو۔ بہرحال بی اے اور ایم اے تک خیر بجا ہے کہ ہر یونیورسٹی لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے بندوبست کرے مگر جہاں اس سے آگے قدم بڑھانا مقصود ہو تو ہر یونیورسٹی کے حالات کا جائزہ لے کر ہر ایک جگہ کسی خاص قسم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اُسے مختص کر دیا جائے۔ اور تمام پاکستان کے طلبا جو اس علم سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہوں۔ ان کو پڑھانے کا بندوبست کیا جائے اور ان کی اقامت کا بندوبست بھی۔ اس سے دو فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک تو اچھے اساتذہ کی ضرورت کسی حد تک کم ہو جائے گی اور دوسرے تمام صوبوں کے طلبا کو آپس میں گھل مل جانے کا موقعہ ملے گا جیسے کہ علی گڑھ میں تھا کہ کل ہندوستان کے طلباء وہاں آتے اور ایک ماں یا بھائی بن جاتے۔ بسردست جو حالت ہے وہ تو میری نظر میں ناگفتہ بہ ہی نظر آتی ہے طلباء کا یہ عالم ہے کہ جہاں کسی کو یونیورسٹی کی ڈگری ملی وہ اپنے آپ کو بہت عالم سمجھنے لگے۔ تاؤ اب آزادی ان کا ایمان بن جاتا ہے گو ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آزادی ہے کیا چیز۔ مجھے ان کی آزادی تو پادر ہوا آزادی نظر آتی ہے۔ پھر جب حب الوطنی کا جوش ابھرتا ہے تو ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حب الوطنی ہے کیا چیز اور کیونکر ہوتی ہے۔ سیاست جو ایک بڑا اور عمیق فن ہے اس میں بھی اپنے آپ کو لاثانی سمجھتے ہیں اور اس تخیل کے تحت وہ کچھ کیا جاتا ہے کہ جس سے ملک میں بجائے اچھائی تخریب پھیلتی ہے۔ اگر اسکول کے بچے اور کالج کے طلبا، شور و شغف مچاتے پھریں، ملکی ملکیت کو توڑیں پھوڑیں۔ دکانوں کو لوٹیں، موٹروں اور بسوں کو جلائیں، اہلِ ملک کو ذلیل و خوار کریں۔ لڑکیوں کی چادریں

اتارنے، اساتذہ کی ٹوپیاں اچھالنے اور آپس میں لپاڈگی ان کا شیوہ ہو تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان میں نہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے اور نہ سودمند تربیت ورنہ اس قسم کی لغو حرکات کا ہونا ممکن ہی نہیں ہو سکتا اور پھر میں تو یہی کہوں گا کہ اگر تعلیم کا انجام یہی ہے تو اس سے تو جہالت ہی بہتر ہوگی۔

یہاں یہ بہتر ہوگا کہ میں سیاسی شعور پر بھی کچھ کہتا چلوں، ایک وقت آتا ہے جب شعور خود ہی انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر طلبا کے لئے سیاسی امور میں شریک ہو کر دوسروں سے لٹھ پونگا ہونا ہرگز ان کے لئے مفید نہ ہے نہ ہو سکتا ہے طلبا کو چاہیئے کہ تحصیل علوم میں مشغول رہیں۔ کیونکہ سیاسی امور نہایت نازک اور باریک ہیں اور ان کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے بڑی معلومات وسیع علم اور بےحد وحساب تجربوں کی ضرورت ہے۔ مگر جب معلومات نہایت محدود ہوں اور علم بھی کچا تو ایسی صورت میں جو بھی رائے ان کی ہوگی وہ نہ سودمند ہوگی نہ درست۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس سلسلے میں جو اس وقت تفرقہ طلباء میں بن گئے ہیں وہ کس طرح ایک محکم اور باشعور قومیت و ملت کے فرد بن سکیں گے۔

اس متعدی مرض سے شفا پانے کا ایک ہی علاج ہے اور یہ ہے کہ طلباء نہ صرف سیاسی تگ ودو کو خیرباد کہیں بلکہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی خاطر خواہ حاصل کریں جب طلباء ان اوصاف سے متصف ہو جائیں گے وہ ہر وقت ملک کی بہتری کو پارٹی بازی پر ترجیح دیں گے اور حکومت وقت کے ہر مفید اقدام میں کوشاں رہیں گے اور اس طرح ملک کی آسودگی بہبودی اور خوشحالی میں معاون ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر سوائے شور وشغب اور بدتہذیبی کے ملک میں کچھ نہ ہوگا۔ اور ملک کا نہ جانے کیا حشر ہوگا۔ اور اس میں نہ صرف والدین اور اساتذہ بلکہ سیاسی لیڈر بھی متہم قرار دیئے جائیں گے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی طبقے سے، پارٹی، کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، اس وقت یہ سوچنا ہے کہ اگر طلبا کی تعلیم نامکمل رہ گئی اور عادات واطوار میں بےتہذیبی نے راہ پائی تو پھر ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔

دفعتاً دانائے راز نے سورج کی طرف نگاہ کی اور حیرت سے فرمایا اس قدر وقت گزرتا معلوم ہی نہیں ہوا۔ ابھی تو مجھے اور بہت کچھ تمہیں بتانا تھا ہر حال اس کو اب کسی اور دن پر بشرط اجازت اٹھا رکھتا ہوں۔ تو اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ میں کرسی سے اٹھا کہ بڑھ کر حسب عادت ہاتھ کو بوسہ دے کر آنکھ سے لگاؤں مگر وہاں پلک جھپکتے دیکھا کہ کرسی خالی ہے۔ میں حیرت زدہ اس کرسی کو دیر تک تکتا رہا۔ مگر اس امید پر کہ وہ اپنا پیام مکمل کرنے کے لئے ایک بار پھر اس فقیر کو ہدایت کریں گے اس آئندہ ملاقات کی امید میں سرشار ہوں ؎

دیکھئے کب آئیں اب دانائے راز
نغمۂ راحت سنائے دل کے ساز

تیسری ملاقات

ایک ماہ سے اوپر گذر گیا مگر دانائے راز حسب وعدہ تشریف نہ لائے میں بے حد پریشان تھا۔ کیونکہ جو پیغام مجھے دینا چاہتے تھے۔ وہ ابھی نامکمل تھا میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب تشریف لائیں اور اُن کا پیغام تکمیل تک پہونچے، کل میں ناشتہ کے بعد اٹھا ہی تھا کہ دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت ہی دیرینہ آرزو پوری ہونے کو ہے۔

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ کوئی بزرگ باہر تشریف لائے ہیں۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں میز سے اٹھا اور ملازم کو یہ کہتا ہوا کہ چمن میں کرسیاں لگادے تیزی سے باہر نکلا۔ دیکھا کہ دانائے راز میرے منتظر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے۔ میں نے حسب دستور ہاتھ میں ہاتھ لیا، بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور اُن کو چمن کی طرف لے گیا۔ میں نے ایک کرسی آگے بڑھائی اور وہ اُس پر بیٹھ گئے۔ اور مجھے بھی پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے بیٹھتے ہی عرض کیا " اب کے تو حضور نے انتظار کے تمام منازل طے کرا دیئے اور مجھ کو یاس کی حدود تک پہونچا دیا۔ فرمایا عزیز من! میں اب خود مختار تو ہوں نہیں دل تو یہی چاہتا تھا کہ فوراً آ ہی جاؤں لیکن مگر ہر چیز کے لئے ایک وقت اور دن مقرر ہے جس کو نہ جیتے جی انسان کو نہ بعد مرجانے کے روح کو بدلنے کی قدرت حاصل ہے میں نے تسلیم میں سر جھکا دیا۔

پھر فرمایا مجھے اس بات سے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ تم نے میرے پہلے پیغام کو جلد از جلد سپرد قلم کر کے اہل پاکستان کے سامنے پیش کر دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس کا کیا اثر لیتے ہیں پھر فرمایا کہ جو حالت میں پاکستان میں مسلمانوں کی دیکھ رہا ہوں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے عوام کی عموماً اور طلبا کی خصوصاً اخلاقی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ اور جو کچھ بھی پرانی قدریں اُن میں تھیں بھی وہ بھی کالعدم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب تو ایسا نظر آتا ہے کہ خدائی بھی درخور اعتنا رہتی نظر نہیں آتی اور عاقبت کے خیال کو تو محض ایک شعر پڑھ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

دنیاوی لذات مفہوم زندگی ہو کر رہ گئی ہیں اور مادی ترقی جو تھوڑی بہت ہوئی بھی ہے تو اس نے اخلاقی بنیادیں اس قدر کھوکھلی کر دی ہیں۔ کہ اگر جلد از جلد کوئی خاطر خواہ بند و بست نہ ہوا تو یہ نامکمل قلعہ بھی ریت کی دیوار کی طرح منہدم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں یہ بے حد ضروری ہے کہ ایک ایسا متوازن طریقہ تعلیم کا انتظام تیار کیا جائے جس سے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت، باہمی اختلاط اور مذہبی تعلیم کو بھی انتہائی اہمیت دی جائے۔ میں اس قدر پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ محض درسی کتابیں

جو حد سے زیادہ ناکارہ ہیں۔ پڑھا دینے سے قومی کردار نہیں پیدا ہوا کرتا۔ ملکی اور ملی ترقی کا راز اس نظام عمل و تعلیم میں مضمر ہے جو ضروریات وقت کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا جائے اگر دنیوی علوم کے ساتھ دینی نظریات اور اعمال بھی متوازن طریقے سے نہ داخل کئے جائیں گے۔ تو نتائج حسب دلخواہ اور بہتر مرتب نہ ہو سکیں گے۔

ایک وہ زمانہ تھا جب اساتذہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ اور سوسائٹی والدین اور طلبا ان کی عزت اور توقیر کرتے تھے۔ یہ اساتذہ مروجہ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کے عادات اور اطوار پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ اور نہایت سختی سے ان کا احتساب کرتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں امیر و غریب والدین کی اولاد ایک ہی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ وہ امرا کی دولت و حشمت سے مرعوب ہوتے تھے نہ غربا کی غربت اور عسرت سے نفرت کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ جب یہ طلبا تعلیم سے فارغ ہو کر کارزار حیات میں داخل ہوتے تو نہ صرف افق قوم پر آفتاب و ماہتاب بن کر ضوفشانی کرتے بلکہ اپنے اساتذہ کی عزت، شہرت اور ناموری کا باعث ہوتے۔ اپنے اسلاف کی تاریخ پر نظر ڈالو تو تم کو نظر آئے گا کہ ایسی حقیقت پسند زندگی اساتذہ اور ان کی متوازن تعلیم نے زندگی کی ہر شاہراہ میں وہ بلند کردار لوگ پیدا کئے جو آج ہمارے لئے ایک مشعل راہ ہیں۔ اگر کوئی صاحب سیف قلم تھا تو کوئی شاعر و منجم تھا کوئی سیاست داں ہوا تو کوئی مذہبی پیشوا بنا آج مغربی تعلیم باوجود اپنی تمام تازہ ترین معلومات و ترقیات کے ان کا جواب پیدا نہیں کر سکی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ پاکستان میں ان چوبیس سال میں بجائے اس کے کہ مشرقی اقدار کو فروغ دیتے مغربی تہذیب تمدن پر بے طرح مائل ہو گئے ہیں۔ مغرب کے ان چھوٹے نگینوں کی چمک دمک نے ان کی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دیا ہے کہ آپ کو اپنے نظریات تعلیم سے نہ صرف ایک قسم کی نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی ہے بلکہ ان کو غیر مفید اور بعید از کار جان کر ترک کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے پاکستان کے لئے یہ از حد ضروری ہو گیا ہے کہ جلد از جلد ایک متوازن طریقہ تعلیم کی ابتدا کی جائے۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اپنے سیاسی مفاد کے زیر اثر جہاں تک ہو سکا یہی کوشش کی اور بہت کامیابی کے ساتھ کی کہ دنیوی تعلیم کو دینی تعلیم سے الگ کر دیا جائے۔ اور ماسوائے علی گڑھ اسکول کے سب اسکولوں میں یہی طریقہ کار رواج پا گیا۔ جس سے ہماری تعلیم و تربیت کو سخت نقصان پہونچا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان میں اب تک خاطر خواہ نظام عمل و تعلیم کس وجہ سے روا رکھا جا رہا ہے۔ اگر پاکستان کے باشندے اچھے مسلمان ہیں تو ان کو اس بات پر اعتقاد ہونا چاہیئے کہ اسلام میں دین اور دنیا دونوں ایک چیز ہیں۔ اس لئے ان کے اسکولوں اور کالجوں میں ایسی تعلیم ہونا چاہیئے جو خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی کا سبب بن سکے۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ ادھر فوری طور سے خیال کیا جائے۔ اور جو بھی نظام تعلیم جاری کیا جائے اس میں دنیوی اور دینی تعلیم کو یوں سمو دیا جائے کہ پھر پاکستان کے مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں کو دہرا سکیں۔ اور دنیا

کو ایک بار پھر وہ سبق دیں جس کے لئے اہلِ مغرب پریشان و حیراں پھر رہے ہیں۔

صحیح مذہبی تعلیم کے فقدان سے اسلامی اقدار اور دینی روایات شعور سے غائب ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ مغربی مفکرین کے خیالات اور نقوش نے اس قدر اقتدار دل و دماغ میں حاصل کر لیا ہے کہ خدا، رسول، مذہب اور اسلام محض ایک دھندلا سا خاکہ بنتے جا رہے ہیں۔ آج اہلِ پاکستان مذہب کے بنیادی نظریات سے اس قدر بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے اذہان میں دینی اقدار اس قدر بے معنی ہو چکی ہیں کہ ان کا کردار کسی صورت سے بھی قابلِ تحسین نہیں رہا ہے۔ مادی زندگی کو ضرورت سے زائد اہمیت دی گئی ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں اس کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں لغو اور بیکار قرار دے دیا ہے۔ اگر اہلِ پاکستان کی تمنا ہے کہ وہ روح کی بلندی اور کردارِ اعلیٰ کو اپنائیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ عملِ نیک پر کاربند ہوں جس کی نشان دہی قرآن پاک میں نہایت صراحت سے کی گئی ہے۔ جب تک یہ ذہن نشین نہیں ہوتا کہ اصل زندگی وہ ہے جو اس زندگی کے بعد شروع ہوگی۔ تو کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ یہ بے راہ روی بند کی جا سکے گی۔ اگر قرآنی نظام اور احکامات پیشِ نظر نہ ہوں تو پھر معاشرے میں نہ ایمان صادق ہوگا نہ دیانت، نہ خوفِ خدا، نہ خیالِ عاقبت۔ مسلمانوں کو جس یقینِ محکم نے اعمال میں بلندی دی تھی۔ اور جس کے فیض سے انہوں نے انسانیت کو عروج کی انتہائی حدود تک اونچا کر دیا تھا۔ وہ یہی تھا کہ ان کو عاقبت میں بنیادی زندگی کے ہر قول و فعل کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ مگر آج چونکہ لادینی تعلیم نے اس یقین کو متزلزل کر دیا تو پھر اس کا انجام نہ جانے کتنے ناکس بے دکھا چکے، دکھا رہے اور دکھاتے رہیں گے۔ پھر سب سے بڑی خوبی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ سچ بات کی تلخی گوارا کرنے کو کوئی تیار نہیں ہے، اور جب تک یہ جذبہ پیدا نہ ہو سکے گا۔ کوئی صورت اس حالت کو بدلنے کی نظر نہیں آتی۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہر حکومت اپنے خیالات کو پیش کرنے اور ان کو عوام و خواص پر عاید کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور کسی نہ کسی حد تک خواہ پھسلاوے سے، مال و دولت کے ذریعہ سے، قانون کے زور سے کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے برعکس انسان کا چال چلن، ذہنی انقلاب، دیانت اور ایمانداری کا جذبہ تو راتوں رات نہیں بدل سکتا۔ اس کے لئے ایک مدت معینہ درکار ہوتی ہے۔ اگر پاکستان میں پھر قرآن اور رسول کے احکامات کو جاری کرنا اور اسلامی نظام کو مقصدِ حیات بنانا ہے تو اس کے لئے اپنے معاشرے کی بنیادوں کو از سرِ نو بھرنا ہوگا۔ اور اسلام کو بجائے زیبِ داستان کرنے کے زندگی کے گوشہ گوشہ میں بروئے کار لانا لازمی ہوگا۔ اور یہ محض اس وقت ہو سکے گا۔ جب پاکستانی اپنی نئی پود کو اسلامی معاشرے سے آراستہ کر سکیں گے۔ تاکہ ان کے دل و دماغ اسلامی روایات اور نظریات کا ترجمان اور علمبردار ہو کر عوام و خواص کو صحیح راستہ دکھا سکیں اور جو نقشِ پا ہمارے اسلاف زیست کی ہر راہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کو اجاگر کر کے ان پہ رواں دواں ہو سکیں۔

جب تک مسلمان سیدھے راستے پر چلتے رہے ان کا پرچم بلند رہا مگر جب ان کی معاشرت میں اغیار کی نشوونما اور تہذیب و تمدن کو راہ دی گئی تو ان کو اسلامی اقدار کی طرف بے توجہی ہونے لگی۔ آج کل نوجوان طبقے نے ضرورت سے زائد متوسط العمر طبقے کی کافی جسمانی زیبائش تن آسانی اور لہو لعب کو اپنانا شروع کر دیا ہے۔ اور اپنے اسلاف کی شاندار روایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ افسوس ہے تو اس بات کا کہ اگر اس ...... کے ساتھ انگریزوں اور یورپ کی قوموں کی خوبیاں بھی اپنا لیتے تو ان کی زبوں حالی کا یہ حال نہ ہوتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پاکستان والوں نے انگریزوں کے محاسن مثلاً حب الوطنی، قومی حمیت پابندی اوقات مذہبی پابندیوں کو اپنایا۔ اگر یہ ہوتا تو نہ ۳۰۳ نہ ۱۳۰۰ پر یہ افتاد پڑتی جس نے ہم کو دنیا کی مذہبی قوموں میں ذلیل کر دیا ہے۔ جب اقدار اسلامی ہی مفقود ہو گئیں۔ تو پھر تیزی سے مائل بہ تنزل نہ ہوتے تو کیا ہوتا اور بدعاتیں اب تو اس قدر لوگوں میں سرایت کر گئے ہیں کہ ان کی انسداد ایک ایسی مہم ہو گئی ہے جس کا سر کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔

جب کوئی قوم یا اس کے افراد احتساب عاقبت کی حقیقت ہی سے منکر ہو جائیں تو پھر ان میں ایسی مطلق العنانی آجاتی ہے جو ان کو اخلاق و عادات کی قید و بند سے آزاد کر دیتی ہے۔ اور وہ خود بابدیر اپنی اس روش سے اخلاقیات کو ایک غیر مفید اور بیکار مد سمجھ کر یوں فراموش کر دیتے ہیں کہ گویا اس کا وجود بھی تھا ہی نہیں۔ مگر پاکستان کی موجودہ حالت اور اس کے باشندوں کی موجودہ روش پر احتسابی نگاہ ڈالی جائے تو محض اس قدر نظر آئے گا کہ مقصد حیات اب یہی رہ گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے خواہ ایمانداری سے یا بے ایمانی سے، دھوکا دہی سے یا کشت و خون سے چوری سے یا بزور جلد از جلد جس قدر مال و زر لوٹ کھسوٹ لیں اسی قدر اچھا ہے۔ تاکہ وہ تن آسانی کی زندگی گذار سکیں۔ اخلاقی قدریں جب ختم ہو جائیں تو پھر سوائے نفسا نفسی کی گرم بازاری اور ہنگامہ آرائی کے اور کیا صورت مرتب ہو سکتی ہے۔ اور اس بے راہ روی نے ان تمام خوبیوں کو نیکیوں کو، قدروں کو قومی محبت کو اور حب الوطنی کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے حالانکہ یہی وہ اوصاف ہیں جن کو ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر ملت میں ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور دیکھا جاتا رہے گا۔ آج بھی جہاں انسانیت حیوانیت کا روپ نہیں دھار چکی ہے وہاں اب بھی اس کی قدر و منزلت ہے اور رہے گی۔

پاکستان کی اسلامی مملکت کو وجود میں آئے تقریباً ۳۰ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں ان کی نئی نسل جو پروان چڑھی اس کا حشر ان کے سامنے ہے۔ کس میں یہ دل گردہ ہے کہ ان تمام کوائف کا جائزہ لے جو اہل پاکستان کا مقسوم ہو چکا ہے۔ جب صراط مستقیم ہی سامنے نہ رہی تو منزل اور پھر وہ بھی غیر معینہ منزل تک

مادری زبان ہے۔ پھر یہ بھی کونسی بڑائی یا فخر کی بات ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو بلا ضرورت خراب کریں۔ اور دوسری زبان کے ایسے الفاظ گفتگو میں روا رکھیں، جن کے نعم البدل ان کی مادری زبان میں موجود ہوں وہ اس بات کو بھول رہے ہیں۔ کہ کوا جب بھی ہنس کی چال چلا ہے اپنی چال بھول گیا۔ اور اس کو خفت کا سامنا کرنا پڑا ہے خداوندانِ تعلیم اگر کچھ دیر کے لئے اس بات کو سوچیں کہ ہندوستان میں اگر چہ چھ سو برس مسلمانوں کی حکومت رہی مگر عوام الناس کی زبان فارسی نہ ہو سکی۔ ان کا دورِ حکومت ختم ہوتے ہی فارسی بھی تقریباً ختم ہو گئی۔ آج کتنے پاکستانی ہیں جو فارسی لکھ بول سکتے ہیں یا سمجھ بھی سکتے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ کوئی قوم ایسی مشکل سے نظر آئے گی جو کہ اوج کی راہیں طے کر رہی ہو اور اپنی زبان میں تعلیم نہ دے رہی ہو۔ سب سے روشن مثالیں ہمارے سامنے چین اور جاپان کی ہیں۔ خدا جانے اہلِ پاکستان کو اس بات کا کیوں خیال نہیں کہ جو قوم اپنی زبان اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو وقعت اور عزت کی نگاہ سے نہ دیکھے گی اس کی دنیا کی نگاہ میں کبھی عزت آبرو نہیں ہو سکے گی۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان ہی دنیا میں آج ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں بکثرت پڑھے لکھے لوگ ایسے موجود ہیں جن کو اس خیال سے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ وہ ایک غیر ملک کی زبان اور ادبیات کے زائد گویا نظر آتے ہیں۔ بہ نسبت اپنے اسلاف کی تخلیق کے جو اُن کی زبان میں کی گئی ہے۔

انگریزی زبان اور تعلیم نے پاکستانیوں کو اپنے مقصد کے باعث کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا احتساب آج یوں ہو سکتا ہے کہ ان کی بول چال، ان کا رہن سہن، ان کا لباس، ان کا اندازِ فکر سب ہی انگریزیت زدہ ہے۔ یہاں کے نوجوانوں کے لئے خدا اور رسولؐ، اسلام اور مذہب ایک برائے نام سی چیزیں کر رہ گئے ہیں۔ معلوم نہیں انہوں نے اب تک اسلام کی قید و بند سے آزاد ہو جانے کے لئے عیسائیت قبول کیوں نہیں کر لی۔

مجھے قطعی علم تھا کہ انگریز کی ذہنیت کیا ہے اور ہماری بے سروسامانی، بھوک، اُجڑی انجمن اور خانہ بربادی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک اس انداز سے زور لگایا تھا اور لگاتے رہیں گے۔ اور جب تک مسلمانوں کی روح اور ذہن کو مفلوج کر کے ایک ایسی قوم نہ بنا دیں جو رنگ و خون میں تو ہندوستانی ہو مگر تخیل، مذاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ حربہ کارگر ہو گیا تو زندہ دیا بدیر مسلمانوں کے بچے اپنے شاندار ماضی کو اس طرح بھول جائیں گے کہ ان کے دل و دماغ میں مٹتے ہوئے نقوشِ اسلاف بھی نہ رہنے پائیں گے۔ ایک ہی اندیشہ تھا۔ جس نے اس وقت مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ ان خطرات کے سدِ باب کے لئے یہ طریق کار بروئے کار لاؤں کہ مسلمانوں کو زمانہ کے ساتھ ساتھ بھی چلاؤں مگر ان کے دل و دماغ میں ان کے شاندار ماضی کے نقوش کو بھی روشن کرتا رہوں۔ اس کا

رسائی معلوم۔ نوجوان طبقہ کی ذہنیت جس قدر پسماندہ ہو چکی ہے اس کا اعادہ تضیع اوقات سے زائد نہ ہوگا۔ ان کی بے حسی نہ صرف والدین کے لئے بلکہ حکومت وقت کے لئے بھی ایک مصیبت ہوگئی ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ خود ان کے لئے بھی ایک طوق گلو افشار ہو کر رہ گئی ہے۔ جس سے دامن چھڑا نہیں سکتے۔ ان کی زندگی دیکھ کر نہ دل و دماغ کی تسکین نہ روح و جان کا سکون نصیب ہے۔ اسلام نے غیروں کو بھی اپنا بنا دیا تھا مگر آج یہ عالم ہے کہ بھائی بھائی کا اور دوست دوست کا دشمن نظر آ رہا ہے۔ آئے دن اخبارات سے پتہ

اس کا انجام سامنے نظر آ رہا ہے۔ خاندانوں کی شیرازہ بندی بکھر رہی ہے۔ والدین جن کو اپنی اولاد کی اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت دلانا تھی مال و زر کے اکتساب کی تگ و دو میں اس قدر مصروف ہیں کہ ان کو اس بے راہروی کا احساس بھی نہیں ہے۔ گھر کا ماحول اس قدر پراگندہ ہو چکا ہے کہ خدا کی پناہ ایک وہ زمانہ تھا کہ اگر گھر کے ماحول کی وجہ سے تربیت میں کچھ خامی رہ جاتی تو اسکول اور کالج میں اساتذہ پیار اور محبت یا تادیب سے اس نقص کو دور اور کمی کو پورا کر دیتے مگر افسوس اب درسگاہ میں بھی وہ نہ رہیں۔ اصل مقصد ہر ایک کے پیش نظر روپیہ ڈھونڈنا ہے۔ طالب علم کا معیار اخلاق اگر پست سے پست تر ہو جائے تو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں اور اگر کسی اہل دانش اور سوجھ بوجھ والے استاد نے روکنے یا ٹوکنے کی ذرا بھی ہمت کی تو اسی وقت گھیراؤ ہوگیا۔ اور ایسی بھلائی سوچنے والے کا قیام ناممکن ہوگیا۔ اگر یہ بے راہ روی جو نوجوانان پاکستان مغرب سے سیکھ رہے ہیں۔ روکی نہ گئی تو وہ دن دور نہیں جب بجائے ایک تہذیب یافتہ قوم کے اہل پاکستان وحشیوں سے بھی بدتر ہو جائیں گے۔

اب عزیزمن! مجھے صرف ایک بات اور کہنا ہے اور وہ یہ کہ آج تک اہل پاکستان یہ اہم مسئلہ بھی حل نہ کر سکے کہ ان کے یہاں تعلیم کس زبان میں دی جائے گی۔ جہاں تک میری یادداشت کام دیتی ہے اس مملکت کی زبان اردو ہی قومی زبان مان لی گئی تھی۔ مگر پھر بھی نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر یہاں انگریزی ہی کا رواج چل رہا ہے۔ اس سے زیادہ اس ملک کی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ انداز فکر بھی عجیب ہے کہ جس ملک میں آدمی کی اول نال گڑی ہو وہ اپنے کو غیر ملک کا آدمی بننے کی کوشش اور اس تہذیب و تمدن سے ناواقف ہونے کی سعی کرے جو کہ اس کی اپنی ہے۔ اور اس زبان کو صحیح طور سے استعمال کرنے سے بھی عاری ہونے کی ضرورت محسوس کرے جو اس کی

اندازہ کہ میں اپنے اندازِ فکر میں کہاں تک کامیاب رہا۔ علی گڑھ کی نوّے سالہ زندگی سے لگانا پڑے گا۔

پاکستان کے قیام کے بعد اصولاً تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ حکومت وقت فوراً ہی اسکولوں اور کالجوں کی دارالعلوم بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کو سامنے رکھ کر ڈالتی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ادھر کوئی توجہ نہ دی گئی اور پاکستان میں انگریز کی دی ہوئی فرسودہ بنیادوں پر محل تعمیر کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اردو میں وہ ذخائر موجود نہیں جن کی کالجوں میں ضرورت پڑے گی۔ مگر یہ اندازِ فکر بھی گریز کا ایک طریقِ کار تھا۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ نے یہ بات مکمل طور پر پایۂ تکمیل تک پہونچا دی تھی کہ اردو میں تعلیم کے لئے تمام سرمایہ موجود ہے۔ اور انہوں نے اس یونیورسٹی میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیں اور ایسی ہی تعلیم کی پاکستان میں بھی ضرورت تھی، ہے اور رہے گی۔ جب مغربی پاکستان میں صوبوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت نہ معلوم کون سے وجوہ اردو میں تعلیم دینے میں مانع ہوئے۔ مگر اب جب کہ مغربی پاکستان پھر مختلف صوبوں میں منقسم ہو گیا ہے تو ایک نیا اندازِ فکر ابھر رہا ہے اور سندھی بلوچی پشتو اور پنجابی کے محاذ ہر صوبے میں قائم ہو رہے ہیں اور اردو کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں تو ہندی اردو کا جھگڑا ایک حد تک قابل فہم تھا کیونکہ یہ ان تہذیبی اقدار سے انحراف پر تھا جس کی علمبردار اردو تھی مگر پاکستان میں تو اس قسم کی کوئی دقت نہیں ہے اور صوبائی زبانوں کو اردو کا حریف قرار دینے کا خیال ایک شر انگیزی اور ستم ظریفی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پاکستان میں اردو زبان ہر طرح کے کاروبار میں ملک کے اندر باہر اور نزدیک اور دور کام میں لائی جاتی ہے۔ پھر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک کسی طرف دور افتادہ گاؤں میں چلے جاؤ۔ وہاں اگر اردو نہ بولی جاتی ہوگی تو سمجھی ضرور جائے گی۔ اور تمام شہروں میں تو عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کے باعث اس پر عام زبان کا اطلاق پاکستان بھر میں ہو سکے۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر صوبہ کو اپنی صوبائی زبان میں ایک حد تک تعلیم دینا ضروری ہے مگر ایک مشترک زبان پاکستان کا ہونا تو لازمی اور لابدی ہے۔ اس سے صوبائی زبانوں کی تحقیر یا اہمیت گھٹانا مقصود نہیں۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ ان زبانوں کو وہ عالمگیر حیثیت اور مقبولیت حاصل نہیں ہے جس کا شرف اردو کو حاصل ہے۔ مگر یہاں یہ کہہ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو اردو پاکستان میں رائج ہو رہی ہے اور آخرکار رائج ہو گئی۔ اس میں صوبائی زبانوں کے وہ تمام الفاظ حسب ضابطہ داخل کر لئے جائیں گے اور ان کو رواج دیا جائے گا۔ جن کے مترادف الفاظ یا ان سے زائد موثر الفاظ اردو میں نہ ہوں گے اور جب اردو وسیلۂ تعلیم ہو جائے گا۔ تو اساتذہ اور طلبا میں یہ کد و بڑھے گی کہ ایک سلجھی ہوئی زبان پاکستان میں پیدا ہو جائے جس پر ان کو قدرت حاصل ہو اور اس پر وہ فخر کر سکیں۔ ایسی زبان پیدا ہو چکی تھی اگر ہندوستان میں اردو زبان سے تعصب کی بنا پر خلش نہ ہوتی تو وہ کبھی عثمانیہ یونیورسٹی کو اور اس تمام ذخیرہ کو جو اس

ذ میں ہم پہونچایا گیا تھا، تباہ نہ کرتے۔ اس لئے اس کا طریق کار یہی ہوگا۔ کہ تمام صوبائی زبانیں اور انگریزی زبان زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائیں مگر ابتدائی تعلیم سے انتہائی تعلیم تک سب کچھ اردو زبان ہی میں ہونا چاہیئے۔ مگر یہ پاکستان کے اہلِ دانش و بینش کو طے کرنا ہوگا۔ کہ کس درجہ تک صوبائی زبان اردو کے ساتھ چلے اور کہاں سے صوبائی زبانوں کے بجائے کلاسیکل زبانیں یعنی عربی، فارسی، فرنچ، جرمن وغیرہ پڑھائی جا سکیں۔ ہاں مگر اس وقت تک کہ تمام کمال تعلیم اردو میں نہ ہو جائے انگریزی کو ایک حد تک ساتھ ساتھ رکھنا پڑے گا۔ مگر وہ بھی بحالت مجبوری ورنہ اس کو بھی زبان حیثیت ہی سے پڑھنا پڑے گا۔

اگر پاکستان میں اردو کو ذریعہ تعلیم و تربیت بنایا گیا تو پھر یہ از حد اہم کام کرنا ہوگا کہ جو لوگ اس کام کے اہل ہوں کہ جلد از جلد تمام ضروری کتابوں کا مختلف زبانوں سے اردو میں تراجم کر سکیں ان کو ایک جماعت بنا کر ایک دار الترجمہ میں اس کام کے لئے لگا دیا جائے۔ ان کے ذمہ یہ کام بھی ہوگا کہ دوسری زبانوں کے ضروری الفاظ کو کس طرح اردو میں شامل کیا جائے۔ اس سلسلے میں حضرت آزاد مرحوم کی کتاب قواعد زبانِ اردو بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس دار الترجمہ کے قواعد و ضوابط کچھ اس طرح بنائے جائیں کہ یہ بیکار اور از کار رفتہ لوگوں کے لئے محض ایک ذریعۂ آمدنی نہ بن جائے۔ ہر شخص کو ایک خاص کام دیا جائے جس کے لئے مناسب وقت بھی مقرر کیا جائے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ کوئی نا اہل سے کام لے رہا ہے، تو اس کو فوراً خدمات سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اب تک جو کچھ اردو کے ترجموں کی تاریخ بتاتی ہے وہ بہت حوصلہ شکن ہے۔ ایک اردو کی ایسی لغت جس سے مترجم حضرات استفادہ کر سکیں، آج تک وجود میں نہ آ سکی۔ مولانا عبد الحق مرحوم بابائے اردو کی لغت کو بہ عجلت تکمیل تک پہنچانا چاہیئے۔ تاکہ ہر مترجم کو حسب ضرورت مترادف الفاظ میسر آ سکیں۔ ایران کی مثال سامنے ہے۔ انہوں نے کس حسن و خوبی سے یورپ کی زبانوں کے الفاظ اپنا لئے ہیں۔ اہلِ پاکستان کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

صوبائی تعصب کو مٹانے کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ طلباء کے لئے مدارس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سکے اقامت گاہیں بھی بنائی جائیں۔ اور ہر صوبے میں اور ہر بڑے شہر میں ایسے اسکول اور کالج بنائے جائیں اور ان میں کل پاکستان سے طلباء کو داخل کیا جائے۔ اگر فرض کیا جائے کہ کسی کالج میں ... طلباء کو داخل کرنا ہے تو ہر صوبے سے ایک مقررہ تعداد لی جائے۔ جو بورڈنگ میں رہائش پذیر ہوں اور جو طلبا اس شہر کے ڈے سکالر ہوں ان پر کوئی پابندی نہ ہو۔ وہ جس قدر تعداد میں داخلہ چاہیں لے سکیں اس طرح جب یہ تمام طلبا اسکول اور کالج میں ایک ساتھ رہیں گے۔ پڑھیں گے، کھائیں گے، بیٹھیں گے، کھیلیں گے کودیں گے تو ان میں خود بخود ہی یگانگت بھائی چارہ، دوستی اور ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ اور صوبائی تعصب بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گا۔ علی گڑھ اس کا کامیاب تجربہ پیش کر چکا ہے۔

اسی طرح سب اسکولوں اور کالجوں کی یونیفارم بھی ایک جیسی ہو۔ بند گلے کے ملٹری کٹ کا کوٹ ہو۔ رنگ بھورا سیاہ ہو یا کوئی اور ہو، جناح کاٹ ٹوپی۔ پاجامہ یا شلوار ہو۔ کپڑا بھی ایسا تجویز کیا جائے جو اس قیمت کا ہو کہ جن کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہو وہ بھی خرید سکیں۔ یہ نہ ہو کہ امراء تو زرق برق میں ملبوس نظر آئیں تو غریب گاڑھے میں۔ حکومت وقت خود ہی اپنی ملوں میں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار کرائے جو طلباء کو میسر آ جائے۔ اس میں طالبات بھی شامل ہوں۔ ان کے کپڑوں کے کٹ اور اسٹائل ایسے ہوں جو آرام دہ ہوں مگر نگاہوں کا مرکز نہ بن سکیں۔ میں جب علی گڑھ کا اسکول کھولنے کے ارادہ سے اٹھا تھا تو میں نے سب سے کہا تھا کہ اسکول اور کالج کے ساتھ اقامت گاہیں ضرور ہوں گی، اور اچھی صاف ستھری، اور وہاں طلباء کو اسلامی تربیت بھی دی جائے گی اور دینی زندگی سے پاک ذہن اور پاکیزہ روح کو بیدار کیا جائے گا۔ اس طرح بچوں کو بد اندیش والدین بعید کردار افراد کی زہر آلود فضا سے دور رکھ کر ان کی شخصیت کی تعمیر کا کام سرانجام دیا جائے گا۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم اس فضا میں بارہ سال رہ چکے ہو۔ اور تمہاری آپ بیتی تم کو بتا سکتی ہے کہ اس میں کس قدر کامیابی ہوئی تھی۔ میری نظر سے وہ کوائف زندگی جو تم نے علی گڑھ کے زمانۂ حیات کے بارہ سالہ قیام کے لکھے ہیں میری نظر سے گذرے اور مجھ کو ان کو پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

پاکستان میں بے دریغ روپیہ اسکولوں کی تعمیر پر خرچ کیا جا رہا ہے جس کا مقصد میری سمجھ سے قطعی باہر ہے۔ اس طرح روپیہ پانی کی طرح بہانا تو وہی ملک کر سکیں تو کر سکیں جن کے پاس بے حد حساب دولت ہو، پھر اسکول تو تیار ہو رہے ہیں مگر پڑھانے والوں کا فقدان ہے۔ اور جو پڑھانے والے ہیں بھی ان میں سے نوے فی صد تو ابتدائی تعلیم کے اساتذہ تعلیم کے اصول اوّل سے بھی نابلد ہیں۔ نہ ان اسکولوں میں پابندی اوقات ہے نہ کوئی تنظیم ہی ہے جن اسکولوں کو دیکھو ان میں ایک طوفان بدتمیزی بپا رہتا ہے۔ میں تمہاری طرف آ رہا تھا تو کمیٹی کے ایک اسکول پر میری نظر پڑی۔ ایک بوڑھا ناکارہ استاد کرسی پر پیر اٹھائے بیٹھا تھا۔ بلکہ اونگھ رہا تھا۔ بچے غل غپاڑہ اور لیادگی میں مست تھے۔ تم ہی بتاؤ جہاں ابتدائی تعلیم کا یہ حال ہو وہاں کی قوم کس طرح ابھر سکے گی۔ میری دانست میں تو پاکستان کی حکومت وقت ہی کو نہیں بلکہ ہر اہل عقل و ہوش کو اس قدر احساس ہو جانا چاہیئے کہ اس بنیاد پر تو پائیدار اور مستحسن عمارت تعلیم کا تعمیر ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے پہلا فوری کام تو قوم اور حکومت کے سامنے یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے ایک جم غفیر استادوں کا تیار کرے جس میں مستورات بھی شامل ہوں۔ مگر چونکہ ممکن ہے اس قدر صنف نازک نہ پائی جا سکیں، اس کام کے لئے تو اچھے چال چلن کے مردوں کو ہی تیار کیا جائے۔ جب استادوں کی یہ فوج ظفر موج تیار ہو جائے تو اسکولوں کی مشکل یوں حل ہو سکتی ہے بہ آسانی کہ ہر محلہ میں کچھ نہیں تو کم و بیش دس بارہ مساجد تو ضرور ہیں اور ماشاء اللہ کافی بڑی بڑی۔ اس لئے ان اسکولوں کے لئے ان کو استعمال کیا جائے۔

بجائے اس کے کہ نماز کے بعد دروازوں میں تالے ڈال دیئے جائیں۔ تاریخ پڑھو تو معلوم ہو کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک گھر اور مساجد اعلیٰ درجوں کی درسگاہیں تھیں۔ اور دنیائے اسلام کی یونیورسٹیاں جہاں سے اہل یورپ نے کسب کمال کیا۔ جامعہ مساجد ہی تھیں۔ ۴۰۵ھ سے لے کر ۱۲۶۲ھ ہجری تک اس قدر شاندار مدارس قائم ہوئے کہ جن کے حالات پڑھ کر فخر سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ پھر ان مدارس میں نہ صرف تعلیم مفت تھی بلکہ کتابیں، کاغذ، سیاہی، اقامت گاہیں، کھانا کپڑا اور علاج معالجہ بھی مفت تھا۔ مزید برآں ہر طالب علم کو حسب احتیاج خرچ بھی دیا جاتا تھا۔ یہ تھی فری تعلیم جس کا آج ڈنکا پیٹا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ حکومت اور امراء دربار کی فیاضی کا مرہون منت تھا۔ دولت مند لوگوں نے بڑے بڑے اوقاف اس کام کے لئے قائم کر دیئے تھے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اگر تعلیم ہے تو سب کچھ ہے۔ مگر پاکستان کے اہل ثروت ادھر خیال کریں تو کوئی ایسا کام نہیں کہ آجکل بھی اس قسم کے مدرسے جامعات اور کالج قائم ہو سکیں۔ جن کو اوقاف تعلیم سے چلایا جا سکے۔

اس کے بعد انہوں نے سورج پر نگاہ ڈالی اور مجھے بہ حسرت دیکھ کر فرمایا "عزیز من وقت واپسی کا ہوا چاہتا ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کے بعد میرا عالم رنگ و بو کی طرف سفر اب نہ ہو سکے گا۔ بہرحال جو کچھ بھی سمجھانا تھا میں تم کو سمجھا چلا ہوں۔ اور مجھے قوی امید ہے کہ تم اس پیغام کو بھی اہل ملک یعنی پاکستانیوں تک پہونچا دو گے۔ میری دلی دعا ہے کہ پاکستان دنیا میں راہ راست پر چل کر اقوام عالم کی مجالس میں ایک کامیاب ملک بن کر دکھائے۔ اور تم کہ جو میرے چمن علی گڑھ کے ایک نہال ہو۔ خدا ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور بامراد فرمائے آمین۔

اس دوران میں میں سر جھکائے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کہ یک لخت وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ میرے سامنے کی نشست خالی تھی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ کہ اگر واقعی دانائے راز سے یہ آخری ملاقات تھی تو کاش میں ان کے دست مبارک کو بوسہ دے کر آنکھوں سے تو لگا لیتا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اور یہ کہتا ہوا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

اقبال کے فلسفیانہ کلام کا عربی ترجمہ

۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار قاہرہ میں موتمر اسلامی کی تشکیل ہوئی تو ساٹھ اسلامی ممالک کے نمائندوں نے متفقہ طور پر علامہ اقبال کے "ترانۂ ملی" کو موتمر کے خصوصی ترانہ کے طور پر منتخب کیا۔ اس ترانہ کا اس وقت ہمارے فاضل دوست پروفیسر حسن الاعظمی ازہری (بعد میں پرنسپل عربک کالج کراچی) نے بہ تعاون ایک مصری شاعر منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس ابتدا کے بعد موصوف و مصری شاعر نے "شکوہ وجواب شکوہ" نیز کلام اقبال سے مزید منتخب اسلامی فلسفی اشعار کا وقتاً فوقتاً منظوم عربی ترجمہ کیا۔ یہ سب تراجم ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول عام ہوئے۔ ذیل کا مقالہ قارئین "العلم" کے لئے انھیں تراجم سے مقتبس ہے۔ (ایڈیٹر)

النشید الاسلامی

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

الصین لنا والعرب لنا والهند لنا والکل لنا
أضحی الاسلام لنا دینا وجمیع الکون لنا وطنا

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

بنیت فی الارض معابدها والبیت الاول کعبتنا
هو اول بیت نحفظه بحیاة الروح ویحفظنا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارے

توحید الله لنا نور اعددنا الروح له سکنا
الکون یزول ولا تمحی فی الدهر صحائف سوردنا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

فی ظل السیف تربینا وبنینا العز لدولتنا
علم الاسلام علی الایام شعار المجد لملتنا
بهلال النصر یضیء لنا ویمثل خنجر سطوتنا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

وأذان المسلم كان له   في الغرب صدىً يحمي منّا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

لو الوسمنا الكون لقد   طاولنا النجم برفعتنا
يا دهر لقد جربت على   نيران صفوف عزمتنا
طوفان الباطل لم يغرق   في الخوف سفينة قوتنا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

يا أهل حدائق أندلس   أنسيت مغاني عشرتنا
وعلى أغصانك أوكار   عمرت بطلائع نشأتنا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

يا دجلة هل سجلت   على شطيك مآثر عزتنا
أمواجك تروي للدنيا   وهي جواهر سيرتنا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

يا أرض النور من الحرمين   ويا ميلاد شريعتنا
يا روض الإسلام وجنته   في أرضك راحة هادمنا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

ومحمد كان أمير الركب   يقود لغورا لنصرتنا
إن اسم محمد الهادي   روح الآمال لنهضتنا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

دوت المنشودة إقبال   جرساً يحدو فيه الزمنا
لبيد قوافلنا الأولى   في البيداء ويبعث أمتنا

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

فوق الصحراء مدد الكلنا أسموتنا   كنا كان يطير الأذان جهارا
تترنم الصحراء في أفريقيا   بصلاتنا ونسابق الأمطارا
كنا نقدم للسيوف صدورنا   لم نخش يوماً غاشماً جبارا
وكأن ظل السيف ظل حديقة   خضراء تنبت حولنا الأزهارا

ثم يقول

لو غربت الآساد في آكامها   لم يلق غير ثباتنا الميدان
وكأن نمو العدل فعين صد   بالمؤمنين الروح والريحان

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ الا اللہ
سایۂ شمشیر ہیں اس کے بعد لا الٰہ الا اللہ

ذلك المؤمن المجاهد يخشى غمرة الحرب للورى يخشاه
تحت ظل السيوف يلقى نوى درعه لا اله الا الله

تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہے موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

لم يبق في يد مسلم من عدة سيف يصول به ليوم جهاد
ولو انه وجد السيوف فهل له ذوق الخلود وذوق الاستشهاد
من كان يجزع من منية كافر هل يستطيب مصارع الاجداد

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنۂ او حب مال و ترس مرگ

المؤمن الحق كان الله غايته الله كان له السمع والبصرا
والآن اضحى له المال كعبته وخوف الموت افناه ما شعرا

ہیچ کافر از اجل ترسندۂ؟
سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ؟
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک
آتش او کم بہا مانند خاک

سيان في الشرك هذا عابد ذهبا
يسعى الى جمعه او عابد حجرا
يا مؤمنا بلقاء الله ما لك في
تفر من الموت قد شيعت من كفرا
قد عاد قلبك ميتا بين اضلعه
كانه في حنايا الصدر مرقد قبر
من كان يحسب ان الموت هاوية
وانه عدم يستأصل البشرا
فيرى اما له يحط عنصرها
الى التراب ويلقى الموت محتقرا

تہ گردوں مقام دلپذیر است ولیکن خوشتر از ماہش و مہر است
بدوش شام نعش آفتابے کواکب را کفن از ماہ تابے
بہ کہسار چوں ریگ روانے دگرگوں می شود دریا بہ آنے
گلاں را در کمین باد خزاں است
متاع کارواں از بیم جان است

تحت قوس الأفلاك عيش جميل
وارى النور ينطفي و يحول
وعلى كاهل المساء ترى الشمس
نعشا يبكي عليه الاصيل
في سنا البدر للكواكب اكفا
ن تواري بها الشعاع النحيل
بينما هذه الجبال حصون
واذا صخرها كثيب مهيل
وتقيم الامواج في البحر ابرا
جا ومن اوجها الرفيع نزول
ورياح الخريف تكمن للزهر
وفي ثغره ابتسام بليل
ثم تأتيه ساعة يذهب الزهر
هشيما وقد طواه الذبول

ایس زاد المسافرین سوی المحو
فمن الموت والحیاة رحیل

نوا نشنیده در چنگے بمیرد / شرر نا جسته در سنگے بمیرد
ز شبنم لاله را گوہر نماند / دمے ماند دمے دیگر نماند
قضا را باده ہر جام کردند / چه بے دردانه اور انعام کردند
نا شناگاه مرگ ناگہاں را / جہاں ماه و انجم نام کردند
رب لحن ذاق البلابل سحرا / فی ضمیر الاوتار ضاق حنینا
شرر النار قبل ان یبلغ المهد / توارى تحت الرماد دفینا

قطرات الندى على الورد تجری
لؤلؤا سال على مرجان
لم تكن تسعد النواظر حتى
بدد المرج شملها فی ثوان
ان كأس الردى تطوف على الد
نيا وتسقي ابناءها اجمعينا
وبلا موعد ودون انتظار
تبعث الاولين والآخرينا
عالم الكون كله عالم المحو
الذی فيه مصرع العالمين

زندگی انسان کی ہے مانند مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا
شر الحياة كطائر مترنم / غنى فارقص حوله الاشجارا
ما كان اعذب لحنه لكنه / كالحلم دق فی الفضاء وطارا

آہ کیا آئے ریاض دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے
اے ہوس! خون رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم یہ خس آتش سوار
لا يعلم الانسان كيف اتى الى
دنيا المتاعب او متى يترحل
ما نحن فی الاكوان الا دوحة
اوراقها عما قليل تذبل
يا ايها الحرص ابك فی الدنيا دما
دنياك ليس بها لحی منزل
ان الحياة شرارة لم تبتسم
الا لتجعلنا لها احطابا
فی عرس دنيانا مآتم للردى
تهوى شيبا خافی البلا وشبابا

آہ یہ دنیا! یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
والمرء لم يبرح اسيرا حائرا
ما بين سحر الامس او لغز الغد

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت
ان الحياة تحلى الافهام مخيلة / يدرك اهلها والعيش غير مخلد
الموت فهذا هين كنسيمها / والعيش صعب من هنا الى الفرقد

زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں!
یہ افلاس میں دولت کے کاشانے ہیں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
ت سے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں
یب فغفوری ہو دنیا میں کہ شان قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
رش بزم طرب کیا عود کی تقریر کیا
درد مندان جہاں کا نالۂ شبگیر کیا
ہمۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا
یب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جان رفتہ آ سکتی نہیں

ن عد والبروق والزلازل والقحط والآلام والنوازل
ات دنیانا التی لا تلد الا خوبا جمر ہا متقد
اللوخ والقصر فی الصحراء والمدن المنیرعة الشماء
ریاض البلبل الرنان وفی تلال ... والغربان
تحم الموت بجیش لقد حصون تنفور وبطش نقیصر
اذ رأیت الموج فی البحر فالموت کامن لا غراق السفن
نغم العرد ولا شکوی الحزین ولا ابتسام البشراء مع الا
متشاق السیف بین الابطال ولا صد الصرخ التکبیر یثین
لا ینفض القلب فی الصدر ویرجع ... اذا دان الذہب

گو سراپا کیف و عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے "الم" کی سورہ بھی جزو کتاب زندگی
آرزو کے خون سے رنگین ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گرد ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائر دل کے لئے غم شہپر پرواز ہے
راز ہے انسان کا دل غم انکشاف راز ہے
غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے
شام جس کی آشنائے نالۂ یارب نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جام دل شکست غم سے ہے نا آشنا
جو سدا مست شراب عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوک خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

ان کانت الحیاۃ خمرا صافیا یعم ناس ... الی القدم
فھی الدموع للحیاۃ جدول تضفو بہ النفس تنبت ...

ان حیات خمرة الاٰمال لا ۔ یرقص الافوق امواج الاثم ۔ فاذا النهر بعد فلاث فی بحر ۔ یحیی الزهور والاعشابا
والله فی حکمته علمنا ۔ ان انشراح الصدر من تبدالم ۔ فضة تنبت الزمرد فی الارض ۔ وتسقی النخیل والاعنابا

آئی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورت رُخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجران قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں بن گئی
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ آئینہ نہیں

من رؤس الجبال ینحدر النهر طربا لامواج عذب الاغانی
ینقل الطیر عنه بین الروابی ما بین الغصون من الحان
لجند وراتجر الحسان تراه فی صفا البلور خلو الحزن
ثم تخفی نلک العیاه ضیاءً فی تلال منثورة وصخور

قطرات من النمیر طوتها فی ثنایا الرمال ایدی الفرق
ثم تجری بها الینابیع فی الار ض فتخطی بعد النوی بالتلاق

وحیاة الانسان نهر سماوی توالت بسیره الاقدار
کلما غاض ماؤه عاد فیاضا فیا ینقضی له تیار
شعلة النفس لا تصیر رمادا منوٴها خالد علی الازمان
کل شیٴ یمضی وکل حیاة تنقضی غیر جوهر الانسان

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کی جستجو رہتی نہ ہو
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

سر الخلود جری مع الدم فی العرو ق وخالط الارواح والاحیاء
لم یجنبنا الرحمن فی الدنیا سدیً وهو العلیم مشیئة وقضاء
لعارأیت الموت سیتملنا علمت بانه لن یستحیل فناء
الموت مثل النوم یبدل سکرة ولیعود صحو دادا ماً و بقاء
وکل ما فی البرایا من روعة وجلال
لولا یلد الهجر فیه لم یزد هو بالجمال

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

یزعم الجاهلون ان المنایا مغرب فیه للحیاة انقضاء
أفلم ینظروا الی الشمس یبدو نورها بعدما طواها المساء
تغرب النفس ثم یشرق صبح فیه للنفس بالخلود انقضاء

میں نے کہا کہ موت کے پردہ میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا؟

چون جہان کہنہ شود پاک بسوزند اورا
وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند

باساة الحجاز ہلا علمتم ان بوع الحیاة ارض الحجاز
ان سر الحیاة یکمن فی الموت فیحکی حقیقة فی مجاز

فرح المؤمنین فی سکرة المو ت بقرب المھیمن المتعالی
ھو اسمی من عیشة الخضر فی الد نیا طول الدھر والاجیال

لم حسبتم للمومنین ببرء ان ایمانھم یدای و ایجحیا
والذی ذاق من ید الوحی کاسا لیس یحتاج للدواء مسیحا
کل کون ابلتہ ابدی اللیالی احرقوہ لیصنعوہ جدیدا
یھدم البیت بعد حین لیبنی منزلا عالیا و قصرا مشیدا

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی
فی خضم الحیات یضطرب المو ج ولا یستقر فی ای حال
نور الحیاة فی الکون یاد کل شیئ بہ رھین انتقال
کل ذرات ھذہ الارض دوما فی احتدام وصدمة واشتعال
لا یعرنک فی الجبال سکون قد یحی السکون بالزلزال

لیس ذاک الثبات فی الفلک الدوّ ار والارض خدعة الانظار
لاتنی فی المسیر قافلة الکو ن ولا تنتھی من الاسفار
عالم دائم التجدد مدارک خطی لیس فی الطریق یوان
لا یمل التغیر الا خمول لیس یدری ما لذة الطیران

الحیاة الجھاد والجد للجد والوثبة والعزم ماضیا والبکور
یقطف الزھر فی الفروع ولکن فوق تلک الفروع تنمو زھور

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

فنا ملایین النجوم مبشر با فوار شمس فی السموٰت تولد
ونوم الردی سکر سیعقب نشوة بخمر حیاة فی الخلود تجدد

وتوزیع ایام البراعم موذن بخلق الزهور البا سماجا لا
ومصنع هل الكون بالخلق دائم فانی اری فیه السکون محالا
ولیس سوی التغییر فی الکون ثابت یغیر حالا ثم ینشئ حالا

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتی ہے چور
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر ہوتا نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

من رؤوس الجبال ينحدر النهر طربا كامواج عزاك غانى
ينقل الطير عنه بين الروابي ما يبث الغصون من الحان
كاخل ود الحور الحسان تراه في صفا البلور حلو الخرير
ثم تمضي تلك المياه سنيا في تلال منورة وصخور

قطرات من النهر طوتها في ثنايا الرمال ايدی الفراق
ثم تجری بها الينابيع في الارض فتحظى بعد النوى بالتلاق

فاذا النهر بعد ذلك في مجراه يحيي الزهور والاعشابا
نصله تنبت الزمرد في الارض ونسقي الشجر والاعنابا
وحياة الانسان نهر سماوی توالت بسيره الاقدار
كلما غاض ماؤه عاد فيا ضا فما ينقضي له تيار

دشعلة النفس لا تقيد بدارا ضوها خالد على الازمان
كل شیء يفنی وكل حياة تنقضی غير جوهر الانسان

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو خوب تر پیکر کی اس کی جستجو رہتی نہ ہو
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
سر الخلود جری مع الدم في العروق
وخالط الارواح والاحیاء
لم يحينا الرحمن في الدنيا سدى وهو الحكيم مشيئة وقضايا
لما رأيت الموت يشملنا علمت بانه لن يستحيل فناء
الموت مثل النوم يبدأ سكرة ويعود صحوا دائما ولقاء
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا
يا ايها المسلم ان الارض والسماء لك
ضياؤك القدسی اعلى من شرارات الفلك
ماجئت في الدنيا لتفنى وهي بالخلد تدوم
هل تصبح الشمس اقل قيمة من النجوم

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بیخواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا بقائے زندگی پاتا ہے یہ
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدہ پر کچھ نہیں

لقد دفنوانی التراب البذور فلم تفن فی لحدها الهامد
ولم تنطفیٔ نارها فی الحیاة علی طول مرقد هذا البارد
لقد لبست للحیاة الهناء وصاغت من الزهر اهی حلا
نبی غصنها ازاهر واستفادت من الموت تجدید الحیاة

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
حسنکدۂ لالہ زار کو بہار در رود بار
ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقد انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

حینما یسفر الصباح ندیا ناصحا فی مراکب الاشراق
یغسل النور فی المشارق ادرا ن الدیاجی من حلة الآفاق
یطیر الکری ومینن العشب وتمحو عزائم الکائنات
ویهب الاحیاء فی البر والبحر لیستقبلوا عرس الحیاة
واذا کان للخلائق ناموس یرینا الصباح بعد الظلام
فلن امتد هب لحیاة ولکن بعد لیل الحمام صبح البقاء

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

فوق السماء ایها الحمر سادات أخر
وفوق هذا المجد فی دنیاک مجد منتظر
بعد الحیاة ایها المحلم تبدء الحیاة
صالح دنیاکوا خراک مما هو الاله
ان البرا یا دول بها الفضاء حافل
لم تنقطع من لا الطریق هذه القوافل
وکم وراء عالم الاکوان من عوالم
فلا تضع حدا لما فی النفس من عزائم
کل الذی تعرفه لیس نهایة الوجود
فکم توارت مدن وراء هذه الوجود

ان هذا العش في البستان منذ البكور
طوال خلو ومؤمنا لبيرجود للطيور
فبعد هذا الظل يا بلبل ماء وهواء
رجنة اخرى يطيب في رياضها الغناء
الليل والنهار لله مال لاتساعان
فاطلب مقاما للعلى فوق الزمان والمكان

فصل گل از نسترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است
کان گوہر پرورے گوہر گرے
کم نگردد از شکست گوہرے
صبح از مشرق ز مغرب شام رفت
جام صد روز از خم ایام است
باده ها خوردند و صهبا باقی است
دوش ها خون گشت و فردا باقی است
هم چنان از فردهائے بے سیرت
هست تقویم امم پاشیده تر
در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد ره گیر است و ملت قائم است
اذا اسقطلت من هيرة في الربيع
تكم في بساتينه من زهور
وياربت لؤلؤ حطموها
لتوضع في التاج او في النحور
يغيب الصباح من المشرقين
ويمضي المساء من المغربين

وما زال يقبل هذا وذاك
جديدين في حلة النيرين
مئات السنين مضت في الحياة
وما استنفذت بحر ازمانها
وكم افرغ الشاربون الكؤو
س وما زالت الخمر في حانها
وكم زال امس فوافى غد
وكم اشرق النور بعد الظلم
يزول من الارض افرادها
وتبقى الشعوب بها والامم

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتئ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نو رات ہے۔ دھندلا سا ستارا تو ہے
چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
ذلک المسلم من اندلس سيجيل العزم في شمس مكانه
من سقاه العشق يوما خمره لم يعد في السكر محيا الحانه

واللیالی علمتنا عبرا فی الذی مر به غزو التتار
کفروا ثم اجتلوا نور الهدی فاهتدوا والهم راؤا ذاک المنار
عرفوا الاسلام فانقادوا له وغدا اعداؤه رکن حماه
عزت الکعبة وانهار الصنم وهوی الشرک بتوحید الاله
ان هذا العصر لیل فاتق ایها المسلم لیل الحادثین
وسفین الحق فی لج الهوی لا یری غیرک ربان السفین
انت کنز الله وانت یاقوت فی موجة الدنیا وان لم یعرفوک
محفل الاجیال محتاج الی صوتک العالی وان لم یسمعوک
لیس فی الوقت فراغ فاغتنم واملأ الدنیا باعمال شهیه
انت نور الارض تهدی اهلها لن یری غیرک فی الارض خلیفه

از تف آتش بر اندازیم گل تا بهر نمرود را سازیم گل
شعلهای انقلاب روزگار چون بباغ ما رسد گردد بهار
رومیان را گرم بازاری نماند
آن جهانگیری جهانداری نماند
شیشهٔ ساسانیان در خون نشست
رونق خمخانهٔ یونان شکست
مصر هم در امتحان ناکام ماند
استخوان او بتہ اہرام ماند
در جهان بانگ اذان بود است و هست
ملت اسلامیان بر دوست و هست
نحن بالایمان تبنی عرشنا لا نبالی الهول او نخشی مصابا
واذا الباغی رمی فی غرسنا جذوة الظلم جعلنا ها ترابا
ذهب الیونان والرومان والفرس کما باد فراعین الزمان
وهدی الاسلام مازال علی قمة الدنیا ینادی بالاذان

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
معیشة الفرد خیال والبقاء للامم
نکون قد اعد العبد اعداء الا علی اذ نادی العلم
منزلک العلوی لا تحجب صرحه الغیوم
انت من الجیش الذی غبار خیله النجوم
فی العالم الاول من مطالع الانوار کنت
والناطق الاخیر فی رسالة الرحمن انت
قم وانشر التوحید فی الدنیا ووحد الامم
فانت خیر من دعا وانت خیر من حکم

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ دل ناصبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ
اگر یوم رفت دل باقی نیست
یصف الموت بالجسم ولکن لیس یفنی من قوی النفس شیئا
تصعد الروح الی الخلود وتبقی عالم الغیب والشهادة حیا

لا تئن من مخافة الموت جهلا فبغیر الانفاس روحک تحیا

سر برکیقباد و اکلیل جم خاک کلیسا و بتاں حرم خاک
و لیکن من ندانم گوہرم چیست
دلے کہ ہم برتر از گردوں تنم خاک

هوی سریر کیقباد وانطوی اکلیل جم
واصبح الکل رمادا مثل هیکل الصنم
اما انا فلست ادری این یعلو نظری
انا تراب غیر ان أسّس دون جوهری

بگوشم می رسید از دل سرودے که جوئے روزگار از چشمه سارم
از تاب و تب پیشینه ام ابد از ذوق و شوق انتظارم
میندیش از کف خاکے میندیش بجان تو که من پایاں ندارم
قد تغنی قلبی فاسمع اذنی نغما فاق رنة الاوتار
وکانی رأیت نهر حیاتی نابعاً من صفاء عین ساری
ازلی بعنصری ابدی منزلی فی الخلود فوق المنازل
ان جسمی من التراب ولکن روحی البحر ماله من ساحل

تری نجات غم مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکر خاکی
بلازم خوف الموت کل عضل تری ان مقیاس الحیاة ترب

دل بیباک را ضرغام رنگ است
دل ترسنده را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است
از آں مرگے کہ می آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

یعلو علی الموت من تسمو ارادته وفی عزیمته اصل و ایمان
عمر الکواکب محدود وانت الی غیر انتهاء بکأس الخلد ریان
یری الجبان غزال القاع مرتعدا کانه أسد فی القاع ضرغام
ان الشجاع یخوض البحر مقتحما کانما الموج ازهار و ارواح
وموجة النهر فی عین الجبان بها غول و حومات و تمساح

هل یدفع الخوف آجالا محطمة
یجری علی الخلق فی احکامها القدر
ومن زکت نفسه بالطهر وائتلقت
فلیس یلحقها من موتها ضرر

ویقول: المؤمنون علی عنایة ربهم یتوکلون
لا خوف یفزعهم ولا هم فی الوغی یحزنون
یوم اضعفهم علی فرعون یجتز الرؤوسا
لا ترک فی القصاح ها رونا وفی الایمان موسی
انی رأیت الخوف فی الدنیا عدوا للعمل
هو مطفیء نور الحجا وسالب کنز الامل
یرمی الارادة بالتزلزل والعزیمة بالخور
ومن احتواه الخوف لا یجنی من الروس الثمر
المؤمن الوثاب تعصمه من الهول السکینة
والخائف الهیاب یغرق وهو فی ظل السفینة
تلقاه عند شبابه هرما قد انحنت حطت قواه
وتعثرت قدماه قبل الخطو وارتعشت یداه

في السلم قبل الحرب مسلوب شجاعته جائر
الصبر عنه نافر والّلب منه طائر

اعداؤكم يخفون سيف يقينكم قبل السيوف
ومرامهم أن تسرعوا بالخوف من قبل الحتوف
حتى تردوا انظروا انهم مثل الخناجر في الصدور
وهناك يقتطفون منكم من ارضكم قطف الزهور

الحقد والكذب الصراح وكل مكر أوردها
والياس والجبن المزلزل وكل غش والترائي
تلك الرذائل في شعوب الأرض الوباء لغنا
لولا المخاوف ما سمعنا باسمها تحت السماء
الشرك يصنع من خيوط الخوف أشنع البلاء
لولاه لم تسمع بكفر او نفاق او رياء
المؤمنون لهم من المولى أمان الأولياء
بلغوا الكمال فهم عن الدنيا وما فيها اغنياء
ثقة الكريم بنفسه يعلو بها فوق الزمن
والحزن سم قاتل لا اكثر الا سم الحزن
الموت والعزة الشماء والشرف المكين
هي خير ما للفتى به وهي الغنى للمؤمنين
دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

اما المفضض والمذهب ومفوف النضيد
فلقد تركناها لعباد الحطام وللعبيد

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں
في سكون المساء يختبئ الفجر وصمت الظلام حلم النهار
وسكون القبر يرقب البعث فلا فناء ومانی موکب الاقدار

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم / چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست
با نشانِ مردِ مومن با تو گویم / چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست
آية المؤمن أن يلقى الردى باسم الثغر مسرورا رضيا
لا ارى مؤمنا يجاهد الخوف اذا اقبل القضاء عليه
يتلقى الردى بصبر جميل وابتسام الرضى على شفتيه

تو پنداری کہ مرد امتحان مرد / نمیرد گرچہ زیرِ آسمان مرد
ترا شایاں چنیں مرگ است ورنہ / ز ہر مرگے کہ خواہی می تواں مرد
مات ولكن لم يمت فهو مخلد الثناء
كم من الذكرى حياة لا يشوبها الفناء

ان شئت ناجي مثله قبل نهاية الاجل
ان الحياة في الجهاد والخلود في العمل

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل دور ہے
اس بیاباں یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے وہ
ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو ہو کے بے دل سوئے بیت اللہ پھرے

اس بخاری نوجوان نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی
خنجر رہزن اسے گویا ہلال عید تھا
ہائے یثرب دل میں، لب پہ نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرت مدفون یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے
آہ یہ عقل زیاں اندیش کیا چالاک ہے
اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے

هل اتاكم حديث قافلة الحجاج
ج اذغالها هد ومريد
في طريق المدينة انتهب الركبان والمنزل المراد بعيد
يسأل العابرون عن ساحل الصحراء او الجموح عن بعيد
نقلتهم المخاوف بالموت وضلت بهم خيافي وبيد

غير ذاك الفتى البخاري لم يبرحه ايمان قلبه الوثاب
يمشي في الشوق سم المنايا كتمني الظمآن برد الشراب
ملأ جنبه المدينة شوق يتغني بنشوة التوحيد
ويرى الخنجر المصوب بالمصوب الى صدره كهلال الصيد
كان خوف الردى يقول له ارجع ويقول الايمان سر في اياب
ومضى آمنا وحل كريما وتلقته روضة الرضوان
قد يسير الحجيج في المحمل الشاهي في مأمن الاخطار

ونعيم الاشواق يعرفه من ذاق مرا خطار بين القفار
يخسر العقل نوره حين يرى فاقها بالهران خوف الخسارة
ان في لذة المتاعب الفا مضويا يفوق ربح التجارة

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل
في الكعبة العليا وتحتها يبا بفيض دما على البحر
بدأت باسماعيل عبرتها ودم الحسين نهاية العبر

سر خاک شہیدے برگ ہائے لالہ می پوشم
کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد
ارفعوا الورد والشقائق اكليلا ثناء على ضريح الشهيد
ذاك لون لنفسي الدم الذي انبت المجد وروى بحيلة الاتود

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں
في ثنايا الوديان تختبئ الحز لان خلف الشعاب خفيات
والبروق اللوامع استترت خلف ضباب السحائب الممطرات

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر مرگ پور مرتضیٰ چیزے دگر است
کس نداند جز شہید این نکتہ را کو بخون خود خرید این نکتہ را

ان الجبان یموت فی اوهامه
هذا الممات وخونه یفنیه
والحر تسعد المواطن کلها
بالعیش حتی موته یحییه
واری المنایا کالحیاة لنا وقت فی سوقها الاقدار والارواح
لا یشتری قبل الحین غیر هل یشتری المصباح الاصباح

سکندر با خضر خوش نکته گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصه بینی
بمیر اندر نبرد و زنده‌تر شو

العمر لا یقاس بالاعوام
والعقل لا یقاس بالاجسام
والیوم من عمر اسود الاجم
بالف عام من حیاة الغنم
الخضر قد قال له الاسکندر
مقالة علی سبیل الزمان توثر
عش ساعة فی لجج البحار
ومت شهید المرج والتیار
ولا تعش هو اکعیش الخامل
مقیل ابین صخور الساحل
الموت فی الوغی وفی المیدان
ولا حیاة الاسود الهوان

شنیدم در عدم پروانه می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و ساز یک شبے بخش
شرر پیدہ نگم گز رازجلوۂ من کہ تاب یک شبے تب دادو دارم
رایت الفراشة حول السراج
تحوم علی نارہ بالجناح
فحاولت انقاذها نا بثت
فانبتنی سنے مقال صراح
هبونی من رهوکم لحظة
امرج بها فی اللهیب اضطرابا
انال بها نشوة فی الجهاد
واصبح من بعد هذا ترابا
احب احتراقی بنار اشتیاقی
ولا ارتضی عیشة الخاملین
فما الفراشة فی النار یبلو
حیاة الجبان طوال السنین

راز ہی راز ہے تقدیر جہاں تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ہے گار فرصت کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز
عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

اذا کانت الاوقات امر سراجها
فان جهاد الحر يبادرنا القدر
جهاد الفتى يعلو به فوق قدره
وفوق امانى والمواهب الغمر
لقد بلغ الاسكندر الشوية التى
يقصر عن ادنى مراقدها السفر
رأى جبل الاقوام اسباب جيشه
علا حتى ذاب من رعبه الصخر

وتيمور بين الفاتحين مضت له
وقائع لم يسمع بهن زمان

يعرق شمس السهل ولو عرجايشه
كما السائب سے مثلا ار فيضان

يتور الجهاد الحى ساد محمد
بجيش على راياته الفوز الكليل
يكبر جند الله حول ركابه
فيهتف بالبشرى وبالنصر جبرئيل
ارى فرصة الاعمال ومضة بارق يضئ سناها المحتاز ويزول
الى الفوز جاهد ما استطعت ولا تنم
ففى القبر نوم بعد ذلك طويل
منازل وادى الصامتين على البلى
ستبقى بها حتى النشور مقيما
اذا العزم نادى فارم سهمك صاعدا
على قمة الافلاك وامض عظيما

شیخ الاساتذہ مولانا غلام یحییٰ ہزارویؒ

سید اشتیاق حسین اظہر سابق ڈائرکٹر اطلاعات سندھ و بلوچستان کی تالیف۔

ہے اس کتاب کی تالیف کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ایک طرح سے بہت سے علمار کی مختصر سوانح حیات بن گئی ہے۔

سید الطاف علی بریلوی (علیگ) کے مقدمہ نے اس کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے اہلِ ذوق حضرات کی معلومات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

قیمت آٹھ روپے

ملنے کا پتہ :- آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس
45/10 - ل - ا ناظم آباد، بی روڈ کراچی

[redacted]

اقبال اور تصوف

از جناب محمد سعادت مرزا۔ بی۔ اے ال ال بی عثمانیہ

علامہ ڈاکٹر اقبال نے بادی النظر میں تصوف پر ضرب کاری لگائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ مذہب اسلام ایک فطری پیام عمل ہے۔ اور عالم اسلام کے ایک زبردست صوفی جن کو دنیا حضرت غوث اعظم کے لقب سے یاد کرتی ہے، وہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ "التصوف کلها عمل"۔ تو پھر اس اختلاف آراء کی اقبال کے متعلق حقیقی وجہ کیا ہے؟ اس پر ہم سطور ما بعد میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ تصوف پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کا وجود نہیں۔ یہ بہت زمانہ مابعد کی پیداوار ہے۔ بلکہ لفظ صوفی بھی کئی صدی بعد کی ایجاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صوفی اور تصوف کے الفاظ زمانہ مابعد میں استعمال کیے گئے ہوں تو کیا آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ایسی ایک جماعت یعنی اصحاب صفہ کا وجود نہیں تھا؟ تو کیا اس سے نفس موضوع تصوف یعنی تزکیۂ نفس تصفیۂ قلب اور تجلیہ روح کی کیفیت ابتدائی مسلمانوں میں تھی۔ کالعدم ہو جاتی ہے۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مرتبہ خطبہ کے وقت یہ کہنا "ساری الی الجبل" حضرت عثمانؓ کا ایک شخص کو نظر بد کی تہدید بے معنی تھی۔ کیا تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے۔ کیا بانیٔ اسلام پیٹ سے پتھر نہیں باندھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو ایک روز بھی چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ ملی غلط ہے۔ تو کیا ان کا یہ عمل اضطراری تھا یا اختیاری؟ کیا اس سے ایسی نفس کشی مراد ہے جو غیر مذاہب میں رائج ہے۔ حضرت رسول اکرم صلعم کی تعلیم اور قول یہ ہے

لا رھبانیۃ فی الاسلام۔

کیا مسئلۂ وحدۃ الوجود، وحدت الشہود، فنا بقا، یہ قرامطی تحریک اور نو فلاطینیت کا اثر ہے۔ بقول اقبال تصوف قیود شرعی کو فنا کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے؟ اس خصوص میں اقبال اور پیرزادہ خان بہادر مظفر احمد کا باہمی مناظرہ ہوا تھا اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے تصوف اور خواجہ حافظ پر سخت چوٹ کی تھی۔ پیرزادہ نے مثنوی راز بیخودی بجواب اسرار خودی لکھی گو سقف ریز، خرد دجال وغیرہ جیسے ناشائستہ الفاظ تک نوبت پہنچی۔ مولوی اسلم جیراج پوری نے اقبال کی تائید کی۔ مگر وہ بھی کچھ تشفی بخش نہ تھا۔ اس لئے کہ مولوی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ اسرار تصوف سے

بلکل کورے تھے۔ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے ایک مضمون مندرجہ رسالہ ماہِ نو اپریل ۱۹۵۱ء میں روسی پرانے خیالات کو دہرایا ہے۔ اس میں بھی وہی استدلال کہ تصوف کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ ایک نوفلاطونی نظریہ ہے۔ وغیرہ

ہم یہاں کچھ اپنا خیال بھی تصوف کے متعلق اسلامی تعلیمات، قرآن و حدیث کی روشنی میں ظاہر کرتے ہیں۔ نفس کشی و رہبانیت اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام کے خلاف ہے۔ مگر ایک حد تک ریاضت ضروری ہے کیونکہ بغیر محنت کے انسان خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

محققین صوفیا کا یہ قابلِ قدر مقولہ ہے۔

می گویم کہ از عالم جدا باش   بہر جائے کہ باشی با خدا باش

اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے لئے بھی تو مشق اور مداومت کی ضرورت ہے۔

اکثر محققین صوفیا کرام نے سخت ریاضت بھی کی مجاہدے بھی کئے۔ ازدواجی زندگی بھی، تصنیفات و تالیفات کے سلسلہ میں بھی دفتر ذخیرہ چھوڑا۔ حال و قال کی مجلسیں گرم رہیں۔ مولانا رومی جن کو اقبال پیر رومی سے مخاطب کرتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ بہاؤ الدین نقشبند وغیرہم اور خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ نے تو بغرض تکمیل سنت نبوی نو د سال کی عمر میں عقد کیا تھا۔ اور اولاد سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ ایسی صورت میں کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوفیا کرام نے رہبانیت کی تعلیم دی ہے۔ وہ تو مجسم نمونہ تھے خُلق نبوی اور شرع کے سخت پابند تھے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر اسلام پر فلسفۂ یونان، ویدانت، بدھ مت کی تعلیم کا اثر نہ ہو تو کیا اسلام میں تعلیم تصوف خصوصاً وحدۃ الوجود اور مسئلۂ ارتقا کا وجود ابتدا ہی سے نہ تھا؟ ——

محققین اسلام میں امام غزالی امام جلال الدین سیوطی۔ مولانائے رومی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ جنید بغدادی۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی وغیرہم تو اس کے قائل نظر آتے ہیں۔ آیات اور احادیث بھی اس کی موید ہیں۔ آنحضرت صلعم پر ایک روز ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جانا۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کا بار بار سوال کرنا اور بالآخر آپ کا "من انا" فرمانا۔ واقعہ معراج شریف مسئلۂ قرب و بعد۔ آیاتِ معیت وغیرہ یعنی واللہ معکم اینما کنتم۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ہماری تائید میں شاہد عادل ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مصنف التکشف فی التصوف، معرکہ کی کتاب ہے۔ مولانائے موصوف خود اقبال کے استاد تھے۔ اور ایک غیر قوم کا محقق پروفیسر نکلسن کہتا ہے کہ اگر تصوفِ اسلام پر بیرونی عقائد، نو فلاطونی ویدانت وغیرہ کا اثر نہ ہو۔ تب بھی تعلیم اسلام ایسے رموز و اسرار سے خالی نہیں۔

ایسی صورت میں اسلام کے لاکھوں محققین صوفیاء کو موجبِ الزام ٹھہرانا کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ ہم کو عقیدہ نو فلاطونیت، ویدانت، تعلیم بدھ مت سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہم کو تو قرآن اور حدیث سے بحث ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے مولانا محمد حسین، ناظم عدالت (حیدرآبادی) کی تصوف پر تقریر سماعت فرمائی اور قرآن اور احادیث کی تصوف سے مطابقت پر خوش ہوئے۔

دراصل اسلام خالص توحید کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اور یہ توحید اتحادی نہیں بلکہ حلول اور اتحاد سے پاک ہے۔ ڈاکٹر نور الدین تعجب ہے کہ اس کو توحید وحدت اتحادی کہتے ہیں۔

غرض اسلام خالص توحید کا نظریہ پیش کرتا ہے، اس سے کما حقہٗ بہرہ اندوز ہونا اور خود پہ ایسی حالت طاری کر دینا، یعنی بحر وحدت میں غرق ہو جانے کا نام توحید ہے اور یہ خاص الخاص کی توحید ہے۔ بقول ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔ کیا حضرت رسولِ کریمؐ پہ اور کیا خاتم الولایت پر ایسی حالتِ جذب طاری نہ ہوتی تھی۔ سرآمدِ چشتیاں حضرت خواجہ حسن بصری۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہی توفیض یافتہ تھے۔

ڈاکٹر اقبال کے بیانات بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں تو وہ تصوف کا سخت مخالف ہے اور کہیں محققین صوفیاء کرام مولانا روم اور منصور حلاجؒ کے اقوال پیش کرتا ہے۔ مثلاً حضرت منصور حلاج کے نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے۔ وجود مصطفویت اس طرح بیانگ دہل کہتا ہے۔ ؎

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ایں سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ با انتہا بے انتہاست — عبدہٗ را صبح و شام تا کجاست
کس ز سر عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سر الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ھو عبدہٗ

مولانا اسلمی کہتے ہیں کہ "اب سوال یہ ہے کہ اقبال کے ھو عبدہٗ سے پہلے یعنی نغمہ منصور اور بایزید بسطامی؟ اور معلوم نہیں کن کن بزرگوں کی زبان سے گایا جا چکا ہے۔ اقبال وجودِ مصطفویت یا انسانِ کامل کو ھو عبدہٗ کہتا ہے۔ منصور نے انا الحق اور بایزید نے سبحانی ما اعظم شانی فرمایا۔ یہ بلند آہنگ دعاوی مجذوب کی بڑ سمجھے گئے اور انسان کی اس بلندی نصب العین کی حیثیت مقال کی مقال رہی اور عملی لحاظ سے وہ زمان و مکان اور جسم و جان کی مادی اور وہمی زنجیروں سے باہر نہ نکل سکا۔"

وجودِ مصطفویت کا قرب یا حصول اور اس کے لئے کائناتِ عالم کی تسخیر ضروری ہے یہی عمل ہے اور اسی سے زندگی کو بقا نصیب ہوتی ہے۔ اور انسان ذاتِ سرمدی سے مل جاتا ہے۔ سہ

از محبت چوں خودی محکم شود آتشش فرمانده عالم شود

"اقبال کی شخصیت اور پیام"

واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی وحدۃ الوجود اور محققین صوفیا کا مسلک قال ہی قال نہیں اور نہ ان کے دعاوی مجذوب کی بڑ ہیں۔ مولانا اسلم کا بیان کچھ واقعہ پر مبنی نہیں۔ اقبال کی خودی اور محقق صوفی کی خودی اور ہے اور ان کا مقولہ ہے لا یصح لشئ کنه فی الوجود۔ دور کیوں جائیں دکن کے محققین صوفیا، مکتب گیسو دراز قدس سرہٗ نے اس نظریہ کو اس طرح واضح کیا ہے۔ اور مرتبۂ عبدیت کو نہایت بلند وارفع مقام قرار دیا ہے۔ اور ان کی بیخودی عبدیت کی ہوشیاری کے ساتھ ہے۔ محمود محمود ہے، اور ایاز ایاز، باوجود تختِ شاہی تک پہنچنے کے، ایاز ایاز ہی ہے۔ یہ عینیت اتحادی نہیں، چنانچہ ایک محقق فرماتے ہیں سہ

ناصحو عبدیت ہے انا الحق کی بیخودی
حضوری کو نیٹ لازم ہے آداب ز قربِ شاہ پر مغرور ہونا

اگر ایسا نہ ہو تو قلبِ حقیقت لازم آتی ہے۔

دو حقیقت کے نہ تحقیق میں قاصر ہو کمال حاصل ہے عبدیت ہے نبودن نیستی ہے

عبد کی حقیقت عدمِ محض نہیں بلکہ عدمِ اضافی ہے۔

بہر حال اسلامی وحدۃ الوجود یا توحیدِ حقیقی اور ہے۔ نو فلاطونی اور ویدانتی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی توحید حلول و اتحاد، روپ وبہروپ اور تجزی سے پاک ہے۔ اسلامی وحدۃ الوجود میں عبدیت پر بیحد زور دیا گیا ہے تاکہ تکالیفِ شرعیہ باطل نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر اقبال خود پیر رومی کے [illegible] جن کا نظریہ یہ ہے یعنی "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" کے فرماتے ہیں سہ

جز و یکے و نیست پیوستہ بکل ورنہ خود باطل بدست از شیء کل

یہاں نظریۂ فلاطونی باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسلامی توحید میں عینیت اتحادی محض بنیت جس میں غیریت و عبدیت کا تصور نہ ہو باطل ہے حضرت شیخ اکبر جن کی تائید امام جلال الدین سیوطی شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ احمد جامیؒ وغیرہ نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ھوعین الاشیاء فی الظھور لا فی ذواتھا بل ھو ھو، والاشیاء اشیاء"

عبد باوجود لوازمِ عبدیت کے ایک نسبت خاص حق تعالیٰ سے ایسی رکھتا ہے جو کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

مولانا عبد اللہ صدر لنبی حیدر آبادی فرماتے ہیں ؎

تماشا گاہ ہے عالم کسی استاد کامل کا یہ ہم تم کیا ہیں گویا سینما کی چند تصویریں

گویا یہ سب اسی نور حقانی کی جلوہ گاہ ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری کا یہ کہنا کہ صوفیا کرام نے بڑی بلند آہنگی کی ہے۔ اور ان کی کیفیات اور وجدانیات پر حد کر دی ہیں۔ صحیح نہیں۔ اور تصوف کی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ صوفیاء کی یہ بلند آہنگی ان کی بے اختیاری ہے اور وہ مرفوع القلم ہیں۔ مولانا روم نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ جب کسی پر کوئی جن یا پری مسلط ہو جاتی ہے۔ تو اس کی زبان گویا جن و پری کی ہو جاتی ہے۔ وہ خود نہیں کہتا دلتا (سوانح مولانا روم مؤلفہ شبلی ملاحظہ ہو) حضرت بایزید نے مستی و سرشاری میں "سبحانی ما اعظم شانی" فرمایا۔ مریدین نے اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ "واللہ باراں من نبودم" اگر بار دیگر مجھے اس طرح کہتا ہوا پاؤ تو مجھ کو تیغ کر دینا۔ دوسری مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ تلوار چلنے لگی تو مریدین خود مجروح ہو گئے۔

صوفی سرمد اور عالمگیر کا واقعہ۔ ایک صوفی کی زبانی میں نے سنا تھا کہ صوفی سرمد نے عالمگیر سے فرمایا کہ تم گردن اڑانا چاہتے ہو، تمام عالم کی گردن اڑ جائے گی۔ آزما لو۔ آپ نے اپنا ایک ناخن ترشوایا تو معلوم ہوا کہ ہزاروں اشخاص کے ناخن اسی وقت جدا ہو گئے۔ خیر یہ تو ان اصحاب کی وجدانی کیفیتیں ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کا علم تصوف فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے اگر اس کو کوئی محقق صوفی مل جاتا تو ہمارا خیال ہے کہ وہ اسلامی وحدۃ الوجود کو افلاطونیت سے مخلوط نہ کرتا۔

اقبال کا یہ نظریہ کہ تصوف نے قوت عمل کو جو اسلام کی جان ہے سلب کر دیا ہے صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ صوفیوں نے تصوف کو بدنام کر رکھا ہے۔ اسلام نے کبھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی بلکہ اس نے تو ہندو اور نصرانی رہبانیت پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اور یہی سبق دیا ہے کہ تمہارا ہر فعل عبادت ہے بشرطیکہ وہ خدا اور رسول کے احکام کے مطابق ہو۔ اور جہاں کہیں رہو خدا کو حاضر ناظر جانو اور اس کو رگ گردن سے بھی قریب جانو ؎

نمی گویم کہ از عالم جدا باش بہر جائے کہ باشی با خدا باش

بقولہ تعالیٰ۔ ولا تلہیہم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ پیر رومی فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

صوفیا کے مشرب میں فی الحقیقت بیخودی خود کو فنا کر لینے یعنی سلب عقل و شعور نہیں بلکہ بیخودی خدائی ہے۔ انسانِ کامل

بنتا ہے۔ ایک دکنی محقق صوفی فرماتے ہیں ؎

خدا ہونا ہو تو خودی کا سر مونڈو　　خودی کھونا ہو تو کامل مرشد ڈھونڈو

یکا صوفی جو کچھ کرتا ہے اللہ کی حول و قوت سے کرتا ہے اور وہ تو راضی برضائے الٰہی ہے چنانچہ اقبال نے "رضا" کے مرتبہ کی وضاحت کی ہے۔ اقبال نے کسی نظر میں خودی، اپنی قدرشناسی، اپنی قابلیت و استعداد فطری کے صحیح استعمال پر زور دیا ہے۔ مولانا روم کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ مگر مولانا روم نے وحدۃ الوجود کے سوا ظاہری خودداری (خودی) کی بھی وضاحت کی ہے۔ صوفیا کی خودی کے مفہوم سے ان کو انکار کب ہے سعدیؒ بھی تو فرماتے ہیں

ع تو قدر خود شناس کہ گوگرد احمری

اب رہا یہ کہ تصوف بیرونی عقائد سے متاثر ہے۔ مختلف تمدنوں، عقائد اقوام مختلف علوم و فنون کی ترویج، فلاسفہ اور علمائے سائنس کے نظریوں کی وجہ سے اسلامی عقائد ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ مگر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان نظریوں کو عقائد اسلام کی کسوٹی پر پرکھے۔ اگر تعلیم اسلام کے مطابق ہو تو اس کو قبول کرے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ صوفیوں نے اسلام کی سچی تعلیم کو اپنی نت نئی بدعتوں اور رسومات سے نیز بعض دنیادار صوفیوں نے حرص و طمع کی خاطر پیر پرستی، قبر پرستی، ترکِ دنیا وغیرہ سے بدنام کر رکھا ہے۔ دراصل اقبال اس رہبانیت کا منکر ہے۔ اور اس کے خلاف صدائے احتجاج ہے مسلمانوں میں روحِ عمل پھونکنا چاہتا ہے جو اسلام کی شان ہے۔ وہی فقرا اور درویش تھے۔ جو دنیا کے سیاح جہاں جہاں جہاں گشت تھے۔ بقول مولانا حالی

ع ہر لنکا میں ڈیرا تو ہر بن میں گھر تھا

کیا صوفیائے کرام میں مجاہدین کی کمی تھی؟ کیا وہ خانقاہ کے صرف شیر قالین تھے نہیں بلکہ مرد مجاہد تھے۔ سچے مبلغ اسلام تھے۔ اقبال کو ان کی یہی آن پسند تھی۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری　　کہ سیل خوں بہا دیتا ہے نقش لوح تقدیری

آجکل ایسی تصنیفات کی ضرورت ہے جس میں بجائے کشف و کرامات، خوش اعتقادیوں کے صوفیائے کرام کی حقیقی تعلیم، مجاہدانہ کارنامے اشاعتِ اسلام و تبلیغ کے طریقے، غیر اقوام سے رواداری۔ زہد و اتقا ان کے عجیب عجیب کارنامے حقیقت پر مبنی ہیں۔ انسان کا کردار اور عمل بڑا موثر ہوتا ہے۔ حضرت غازی سالار مسعود سلطان الہند غریب نواز حضرت محبوب الٰہی، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جنوبی ہند میں حضرت مظہر ولی، بابا حیات قلندر، قادر ولی ناگوری، اسد اللہ زیبا صوفی سرمست قدس سرہم کے مشرکین سے مقابلے ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ کیا موجودہ صوفیا، یا ان کے پیروؤں میں حضرت شبیر امام حسینؓ ۔۔ ۔۔۔۔۔ کا ایسا جانشین نظر آتا ہے۔ جو اسلام کی حمایت میں اپنی جان قربان کردے۔ بقول حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہٗ

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ   دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دست یزید   حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

مشائخ اور علماء کو خانقاہوں سے نکل کر اپنی تبلیغ و ہدایت سے مسلمانوں کی اصلاح پر کمر باندھنی اور روح عمل پیدا کرلی چاہیئے۔ ——— افسوس ہے کہ زیادہ تر اب مشائخ کا پیشہ صرف پیٹ بھرنے کا رہ گیا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند   اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

تو کیا اس تین سو سال میں مشاہیر صوفیا پیدا نہیں ہوئے۔ مولانا شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی۔ مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی حضرت وارث علی شاہ، شاہ نیاز احمد بریلوی، قربی دیلوری سید محمد شاہ میر، عبدالحق مخدوم سادی مولانا مجیب اللہ پھلواروی، مولانا عبدالعلی بحر العلوم وغیرہ

ہم یہاں ڈاکٹر اقبال کی وفات پر جو نوحے غیر تقسیم ہندوستان کے شعرا نے لکھے تھے نقل کرتے ہیں۔ تاکہ یہ محفوظ ہوجائیں ——— غالباً یہ نظمیں اقبال کی سوانح میں شائع نہیں ہوئیں۔

نوحۂ اقبال از اختر بریلوی

آہ دنیا سے اٹھ گیا اقبال   شاعر باکمال و با اقبال
خوش بیاں، خوش نصیب، خوش قسمت   نیک خو، نیک طبع، نیک خصال
نکتہ رس، نکتہ سنج، نکتہ شناس   آدمی صورت و فرشتہ مثال
دوربیں، زیرک و فہیم و ذکی   آئینہ دار حال و مستقبال
حق رس و حق شناس و حق آگاہ   باہنر، باخبر، بلند اقبال
فہم و ادراک و فطنت و دانش   اس ہمہ داں کے تھے یہ اہل کمال
تھا جہاں دیدہ و مآل اندیش   دولت علم و فن سے مالا مال
مغربی فلسفہ سے تھا آگاہ   مشرقی نکتوں سے بھی واقف حال
نازش دودماں نیک دلاں   فخر اوتاد و صوفی و ابدال
آشنائے رموز درویشاں   واقف جادۂ حرام و حلال
اس کی شہرت سے گونجتا تھا جہاں   مشرق و مغرب و جنوب و شمال
تھا وجیہہ و شکیل و کوہ وقار   صاحب رعب و داب و جاہ و جلال

جسمِ خاکی میں اس کے تھی شاید — طاقتِ بوتراب و روحِ بلال
تھی طبیعت میں اس کے ہمواری — صفت خاص اس کی استقلال
خضرِ ملت تھا ناخدائے وطن — قوم کے حق میں تھا وہ گویا ڈھال
خاص عنصر تھے اس کے جود و سخا — تھا نہ کوتاہ اس کا دستِ نوال
اس کے افعال نیک و صالح تھے — قابلِ رشک اس کے تھے اعمال
نقش ہیں دل پہ اہلِ دانش کے — اس کے پند و نصائح و اقوال
ایشیا اس پہ رشک کرتی ہے — اس کی معدوم ہے جہاں میں مثال
شاعری اس پہ ختم ہے واللہ — کچھ نہیں اس میں جائے قیل و قال
شاعرِ اعظم ایشیا کا تھا — ہند ہی میں گری ہے اس کی نال
اس کے دم سے فروغِ اردو تھا — اس کے اٹھنے سے آگیا ہے زوال
اس سے دعویٰ کرے تقابل کا — نہ ہوئی آج تک کسی کی مجال
خوب ہوتا تھا اس کا استنباط — اور اس سے کبھی بڑھ کے استدلال
عارضِ تابناک اردو پر — تھا وہ پیشِ نظر چمکتا خال
شاعری میں نہ پاؤ گے اس کی — ہیچ شام و فراق و عیشِ وصال
تھا خیال اس کا ارفع و اعلیٰ — بال کی وہ نکالتا تھا کھال
اس پہ شاعری کا کیا کہنا — ہیچ تھے اس کے آگے رستم و زال
سن کے اس کا کلام آتا ہے — وجد صوفی کو محتسب کو حال
ہجر سے اس کے غمگساروں کی — ہو گئیں روتے روتے آنکھیں لال
رہ گیا شاہباز سدرہ نشیں — اس کے دم توڑنے سے بے پر و بال
خاک کو بھی نہ اس کی پہونچیں گی — ایڑیاں لاکھ رگڑیں گر نقال
اٹھ گیا اس کا سایہ دنیا سے — پر عنقا ہے آج اس کی مثال
سب ہیں غمگین اس کے مرنے سے — صاحبِ جاہ اور اہلِ کمال
سوگ میں اس کے ہیں کہیں وہ ہیں — اس کے ماتم میں ہیں اناث و رجال
میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا — روح لے اس کے جھاڑے جب پر و بال
حوریں غرفوں سے تاکتی تھیں اسے — اور کہتی تھیں سب تعال تعال

بات کل کی یہ ہے کہ تھا ہر سو — رونق افروز مہر اس کا جمال
آج عالم ہے اس کے ماتم میں — کل کی باتیں ہوئی ہیں خواب و خیال
کس طرح وہ جیئے گا اس کے بعد — زندگی جس کی ہو گئی ہو وبال
نازشِ بزمِ ایشیا نہ رہا — لٹ گیا شاعری کا بیت المال

اقبال ـ از طالب چکوالی بی۔ اے ال ال بی

اے کہ تو نے وا کئے عالم پہ اسرارِ حیات — اے کہ تو نے کر دیا شاداب گلزارِ حیات
اے کہ تو نے آسماں کے راز ہم سے کہہ دیئے — بزم انجم کر دیا تو نے ہی بازارِ حیات
نغمۂ ہندوستاں نکلا تھا تیرے ساز سے — اہلِ گلشن نے سبق سیکھا تری آواز سے
آہ کیا جادو تھا جو تجھ پر کیا احباب نے — اے مفکر ہم کو بھی آگاہ کر اس راز سے
اے تری حریت نوائی ہے حصارِ دیں میں تنگ — طبعِ رنگیں ہے طلبگار رنگکار شوخ و شنگ
اے کہ عالم کو تجھے دینا تھا پیغامِ عمل — تنگ نظری کے گوارا کر سکے کیوں رنگ ڈھنگ

اس پہ بھی تو ہند کا تھا شاعرِ جادو نوا — اب نہ سن پائیں گے محفل میں تری رنگیں صدا
جا رہے ہیں کیسے کیسے عندلیب اس باغ سے — برق صورت اس کا اب اقبال بھی جاتا رہا

علامہ اقبال ؔ از حفیظ الرحمٰن امین شہابی

ڈاکٹر وہ روحِ سخن — اس جہاں سے ناگہاں جاتا رہا
بن گئی بزمِ سخن ماتم کدہ — شاعرِ معجز بیاں جاتا رہا
ہو رہی ہے آج اردو سوگوار — شاید اس کا پاسباں جاتا رہا
کس قدر حیران ہیں اہلِ سخن — آج ان کا ہم زباں جاتا رہا
گلستانِ ہند ہے سنسان آج — بلبلِ ہندوستاں جاتا رہا
معرفت کہتی ہے آج اسلام کا — نکتہ داں و راز داں جاتا رہا

آج ہیں سب مضطرب جس کے لئے   وہ خدا جانے کہاں جاتا رہا
ذرہ ذرہ محوِ ماتم ہے کہ حیف   شاعرِ جادو بیاں جاتا رہا

۱۳۵۷ھ

کتابیات :-

۱۔ التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی ۔ مولانا اشرف علی تھانوی
۲۔ اقبال نمبر رسالہ جوہر دہلی مطبوعہ
۳۔ اسلامی تصوف اور اقبال : ڈاکٹر نور الدین مطبوعہ
۴۔ ڈاکٹر اقبال از عبد المجید سالک مطبوعہ
۵۔ مجلہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ مضامین ڈاکٹر ولی الدین متعلق وحدۃ الوجود و تنزلات ستہ مطبوعہ
۶۔ شرح عقائد جامی مؤلفہ مولانا عبد الحق سادی مدراسی قلمی
۷۔ مثنوی مولانا روم دفتر سوم مطبوعہ
۸۔ رسالہ ماہِ نو (کراچی) اپریل ۱۹۵۱ء مضمون خلیفہ عبد الحکیم
۹۔ اساس المعرفت مصنفہ شاہ کمال الدین صدیقی مطبوعہ حیدر آباد دکن
۱۰۔ التکشف فی التصوف مصنفہ مولانا اشرف علی تھانوی مطبوعہ
۱۱۔ HISTORY OF SUFISM, PROF. NICHOLSON.

امیر خسرو اور قوالی

قول یا قوالی حضرت امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے جس سے آج تک ہمارے فقرا و صوفیا کی محفلیں آباد ہیں ۔
علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ ہندی موسیقی نے "مشرف بہ اسلام" ہو کر قوالی کی صورت اختیار کی ہے ۔ اب تک حال و قال کی محفلوں میں ہزاروں اہلِ دل قوالی کے ولولہ انگیز اسلوب سے متاثر ہو کر وجد و رقص کر چکے ہیں ۔ قوالی ہماری موسیقی کا نہایت نادر دلکش اور قابلِ فخر اسلوب ہے جس کی ایجاد امیر خسرو نے کی اور حوصلہ افزائی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمائی ۔

مولانا عبد المجید سالک

اقبال کا نوجوان

از مولانا صلاح الدین احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور

جن صاحبوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ دیگر اکابرِ فن کے کارناموں کی طرح اقبال کی شاعری بھی تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ اُن کے شباب کی شاعری ان کی پختہ سالی کی شاعری، اور آخر میں اُن کی بڑھاپے کی شاعری لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں ان کا مخاطب صرف نوجوان اور موضوعِ سخن بیشتر وہ کیفیات رہی ہیں جو شباب سے خاص ہیں اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال اگرچہ اپنی جوانی ہی میں بلوغِ فکر کے اعتبار سے پختہ سال اور پختہ سالی میں پیر دانا ہو چکے تھے لیکن ان عناصر کے اعتبار سے جو ان کی شاعری، ان کی فکر، ان کے جذبات، ان کے محسوسات اور ان کے پیغام کے بنیادی عناصر ہیں۔ وہ ہمیشہ جوان رہے اور ان کے سخن کی حرارت اور ان کے پیغام کا خروش نوجوانوں کے خون کی روانی تیز کرتا اور انہیں تسخیر ذات اور تسخیر کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔ اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے۔

ان کی جوانی کی شاعری میں وہ سوز اور وہ سیمابی کیفیت موجود ضرور ہے جسے ان کے نظامِ سخن کی اولین خصوصیت کہنا چاہیئے اور جو آگے چل کر اُن کی فکری اور الہامی شاعری پر سر بسر چھا گئی لیکن ابھی اس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعر اقبال کے درمیانی اور آخری دور سے نسبت رکھتا ہے۔ اقبال کا شعر شباب، خودنگری اور خودشناسی کی ایک لطیف و جمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چونکتا ہے تو وہ اپنے گردوپیش پر بھی ایک نظرِ غائر ڈال لیتا ہے لیکن اس کے پاس اپنے مطالعۂ نفسی کے اظہار اور ایک دلِ دردمند کی پکار کے سوا کوئی پیغام نہیں ہے ـــ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہمعصروں کو فطری طور پر کوئی پیغام دینے سے ہچکچاتا ہے اور یہ اس کی حقیقت پسندی اور عظمت کا ایک قطعی نشان ہے۔ اس دور کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اس کی خودنگری اور خودشناسی ہے۔ اور اس کے بعد اس طوفان سے ابتدائی خروش اور اس کی اولین بےتابیوں کا ایک ہلکا سا اظہار ہے جو اس کے قلب و جگر میں پرورش پا رہا تھا۔ نوجوان، اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہبری کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ محض انہیں اپنے پردۂ دل کا ایک کونہ اٹھا کر دعوتِ نظارہ دے دیتا ہے ـــ

یہاں یہ سوال بھی نہایت درجہ دلچسپ ہے کہ اس منزل پر خود اس کی اپنی زندگی کیا کیفیت تھی اور اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز سے جاری تھی ـــ اس کا جواب خود شاعر نے ایک نہایت لطیف پیرائے میں یوں دیا ہے۔

ایک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال، کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے، اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اُس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

بظاہر یہ ایک لطیف مکالمہ ہے لیکن غور کیجئے تو اس کے ذریعے سے نوجوان شاعر نے اپنے نوجوان ہمعصروں کو نہ صرف اپنی سیرت کی تعمیر کا ایک ہلکا سا منظر دکھایا ہے بلکہ اس پیرلزم (؟) اس روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ایک واضح تصور بھی اُن کے سامنے رکھ دیا ہے، جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور عطر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہر طبیعت اور اس انداز تربیت سے آراستہ ہو کر تکمیلِ تعلیم کے سلسلے میں یورپ گیا تو اسے دیار و امصارِ مغرب میں اپنی فکر کو جِلا دینے اور اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت انگیز اثر اس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپ کی جارحانہ وطن پرستی سے بیزار ہو گیا اور ملتِ اسلامیہ کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اس کے ذہن میں اُبھرا اور اس کو یقین کامل ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانانِ عالم کی نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خاص اسلامی اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے ظاہری ڈھانچے سے نہیں بلکہ روحِ اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بیسیوں بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

چنانچہ یورپ کے دورانِ قیام میں اُن کے جن خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا وہ اکثر و بیشتر اسی تاثر کے سرمایہ دار ہیں۔ پنجاب کے بابائے اردو یعنی شیخ سر عبدالقادر مرحوم بھی انہی دنوں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے مقیم تھے مگر وہ اقبال سے ایک سال پہلے مراجعت فرمائے وطن ہو گئے تھے۔ ان کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اقبال نے انھیں ایک مراسلہ منظوم لکھا جو ان کے پہلے مجموعہ بانگِ درا میں تمام و کمال موجود ہے۔ یہ مراسلہ بظاہر ایک دوست کا خط ہے مگر درحقیقت اس انقلاب روحانی اور دردِ پنہانی کا طوفانِ عظیم جو ان ایام میں شاعر کے دلِ درد آشنا میں کروٹیں لے رہا تھا۔ فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چین سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محو رُخ سعدی و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ملتِ اسلامیہ کے ایک حساس نوجوان کے سینے میں جس قسم کے احساسات تلاطم برپا کر رہے تھے، یہ نظم لطیف ان کی ایک ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اقبال نے خود شناسی اور خود نگری سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیقِ دور افتادہ کو شریک کیا ہے۔ اپنے معاصر نوجوانوں کو اس نے کوئی پیغام نہیں دیا۔ اگرچہ اپنے سینہ کو چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوتِ ہم نفسی ضروری ہے۔ ہمارے موجودہ مطالعہ کے اغراض کے لئے اقبال کا یہ خط اور ایک اسی زمانہ کی غزل جسے میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، آج سے پچاس برس پہلے کی ایک نادر تصویر ہے جس میں ایک نئے مسلم نوجوان کے خدوخال بڑی خوبی سے نمایاں ہیں۔ اقبال نے اسے کوئی تلقین نہیں کی، البتہ ایک سراپا درد شخصیت کو محسوسات کے اظہار کے ذریعے بے نقاب ضرور کیا ہے۔ اور وہ غزل یہ ہے جو حقیقتاً اقبال کی شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، کہ اسی شان سے مڑ کر اس کا کاروانِ سخن ملت کی پہنائیوں میں داخل ہوتا اور اپنے مقصودِ منتظر کی طرف آگے بڑھتا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا
سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہ گذر بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

فرنگ کی ذہنی غلامی سے انکار اس کی سطوتِ دنیوی

کے تاثرِ مذموم کا احساس، احیائے اقدارِ اسلامی کی آرزو نے شدید، عشق کے اس مفہوم کا آغاز جو آگے چل کر شاعر کے سارے سخن پر محیط ہو گیا۔ اور اس سوز و دردِ دل کی تابناک کیفیتوں کا اظہار جس سے خود شاعر آتش بجاں تھا یہ متعدد کیفیتیں اس غزل کے محض چند اشعار سے واضح ہوتی ہیں۔ اور ان جذبات کی نمائندگی کرتی ہیں جو اس دور کے ایک حساس نوجوان کے دل میں موجزن تھے۔ یہ جوان اپنے عہد کا ایک مثالی جوان تھا، وزخوشا وقتے وخرم روزگارے کہ اس بلند سطح کے نوجوان ہماری سوسائٹی میں اُبھرتے اور فروغ پاتے اور اپنی خاموش تلقین سے ہزاروں نوجوان دلوں میں گرمیٔ احساس کی ایک برقی رو دوڑا دیتے تھے۔

پھر وہ دور آیا کہ جب اقبال نے پختہ سالی کی منزل میں قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا جس کی رو سے شاعر یا مفکر اپنے احساسات براہِ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبال اس بارے میں بہت وضعدار تھے اور انہوں نے اس حق کا اس وقت تک استعمال نہیں کیا جب تک وہ نوجوانی کے دائرے سے نکل کر صحیح پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے۔ اور دیکھئے یہاں بھی ان کے مخاطبین محض نوجوان تھے یہ سچ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ نوجوان کا نام لیکر اُس سے خطاب نہیں کیا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان کے موضوعاتِ سخن میں سے کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا تعلق نوجوان مرد، مردِ جواں ہمت اور اس کے عمل اور اس کے کردار سے نہ ہو۔ بہرحال موجودہ مقالے میں میں نے اپنے آپ کو محض ان مثالوں تک محدود رکھا ہے جن میں نوجوان سے بدیہی طور پر خطاب ہے یا اس کی طرف صاف صاف اشارات ہیں۔

بانگِ درا کی معروف نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں اقبال نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے اور وہ نوجوانِ اسلام کی پیشِ نظر زبوں حالی کا تلخ جائزہ لیکر خاموش ہو گئے، ابھی انہوں نے اسے صرف شرمسار کیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلے نہیں لگایا اور نہ اس منزلِ گم کردہ کی طرف اشارہ کیا ہے جسے از سرِ نو حاصل کرنا اس کے لئے مقدر ہو چکا تھا، مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساسِ ندامت اقبال کے مخاطب نوجوان کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا اس کے بعد پیدا ہونے والا جذبۂ یقین۔ فرمایا کہ،

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اک قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب رنگ خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لیکن تنبیہ و توبیخ کا یہ انداز آگے چل کر یکسر بدل جاتا ہے اور اگر کہیں موجود ہوتا بھی ہے تو محض عارضی طور پر۔ اقبال اب ان کے سامنے نور و تسخیر کے نہایت روشن تصورات پیش کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ انہیں اس انداز سے جذب کریں کہ گویا یہ اسی کے لئے خلق کئے گئے تھے۔

مرے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزمگاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اقبال نے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو تین جدید تصورات دیئے تھے۔ خودی۔ فقر اور عشق یا یوں کہیے کہ ان تین الفاظ کے نئے مفاہیم کئے تھے، یہاں ان تصورات کی تفصیل و تفسیر کا نہ موقع ہے نہ وقت لیکن مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ احساسِ خودی سے مراد عظمتِ انسانی اور اس کی خوبیوں، ذمہ داریوں اور بلندیوں کا احساس تھا۔ فقر کے معنی مسکنت نہیں ہے بلکہ وہ سیر چشمی اور بے نیازی کی کیفیت ہے۔ جو ادنیٰ دنیوی فوائد کی طرف سے بعض سعید ارواح میں پیدا ہو جاتی ہے عشق کا مطلب کسی مہ جبیں لعبتِ ہندی کا عشق نہیں ہے۔ بلکہ وہ گرمیٔ دل اور جذبہ کامل ہے جس سے مالا مال ہو کر انسان ایک بلند روشن اور پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے اور بڑے بڑے کارنامے ایسی آسانی سے سرانجام دے پاتا ہے کہ وہ ادنیٰ حساب دانی جسے عقل کہا جاتا ہے حیران و سرگشتہ رہ جاتی ہے۔ ان تصورات کو اقبال نے مومن کی ذات گرامی میں یکجا کر دیا ہے۔

یہ بات بالکل عیاں اور قطعاً طالبِ ثبوت نہیں کہ ہر نسل میں جدید تصورات کے قبول کی توقع ہمیشہ نوجوانوں ہی سے کی جاتی ہے۔ کسی نسل کے بڈھے خواہ وہ کیسے ہی دانشمند کیوں نہ ہوں، نئے تصورات کو کبھی خوش آمدید نہیں

کہنے، بلکہ ہمیشہ ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اقبال اس بارے میں سرسید احمد خاں سے زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان کے تصورات اس کلیۂ عام سے مستثنیٰ ہرگز نہیں تھے۔ اور اس امر میں شک کی قطعاً گنجائش نہیں کہ شاعر مشرق نے بالارادہ اور بالقصد اپنے جدید تصورات نوجوانانِ اسلام ہی کے سامنے پیش کئے اور ان کی تفصیل و تشریح کے سلسلے میں انہیں کو اپنا مخاطب بنایا۔ ایک داخلی ثبوت اس دعوے کا یہ بھی ہے کہ بیشتر وہ خوبیاں جو اقبال ان تصورات کے مجموعے یعنی مردِ مومن میں مرکوز کرتا ہے۔ وہ محض جوانوں ہی میں پائی جا سکتی ہیں مثلاً سوزِ عمل۔ وسعت، بے کرانی۔ پروازِ بے نیازی۔ قوت اور بے خوفی ایک اور ثبوت اس نظریہ کا یہ ہے کہ اقبال نے ان میں بعض تصورات کو جن اشکال میں مجسم کیا ہے۔ وہ بھی اپنی بنیادی خصوصیات کے لحاظ سے جوانی ہی کی صفات سے متصف ہیں مثلاً اقبال کا محبوب پرند شاہین جو فطرتِ بلند نگاہی، قوت اور گرمیٔ خون کا پیکر ہے۔ شباب ہی کی صفات کا مظہر ہے۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

پھر یہ کہ:

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اور شاہین کا ذکر ہے تو ایک نوجوان کے نام شاعر کا وہ پیغام بھی سن لیجئے جس میں شاہین کو نمونۂ زندگی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اور اب گریز ہے:۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور اسی سلسلۂ رشد و ہدایت میں اپنے فرزند عزیز جاوید سلمہٗ سے یوں خطاب کرتے ہیں:۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جس عشق کی طرف ان اشعارِ آبدار میں اشارہ کیا گیا ہے اس کی کچھ مزید تشریح ملاحظہ ہو:۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ایک بڑی حد تک اس کی الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب ہی نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ پیش گوئی ٹھیک اسی طرح الفاظ کے معیار پر پوری اترتی ہے جس طرح تبت اور چین کی بیداری اور مغربی اثرات سے آزادی کی پیشگوئی، کہ یہ واقعہ ان کی وفات کے برسوں بعد معرضِ وجود میں آیا۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ

کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دل طور سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

دنیا کی امامت کے فرائض کے لئے شاعر مشرق فرسودگان بے عمل اور پیران بے مصرف کی تلاش میں نہیں تھا۔ بلکہ اس کی تمام تر امیدیں اور تمنائیں جوانوں ہی سے وابستہ تھیں۔ وہ اُن میں سے ہر صاحب دل نوجوان کو ملت کے مقدر کا ستارہ قرار دیتا ہے اور اسی کیف یافت میں پکار اٹھتا ہے کہ

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اور پھر قلندری کی شان میں یوں گہر ریز ہوتا ہے کہ:-

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا
ہنگامے ہیں میرے تیری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گذر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اُتر جا
توڑا نہیں جادو میری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اور پھر چلتے چلتے قلندر ہی کی زبان سے جوان تشنۂ علم و عرفان کو ایک نکتہ کی بات سمجھا جاتا ہے۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو میرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے
الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنی پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

اور آخر میں — تشنۂ علم نوجوان کے عین مقابل مست عمل نوجوان کی ایک تصویر بھی دیکھتے چلئے:-

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہو ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے اک چنگاری

حضورِ اقبال

از جناب ساجد اسدی جیپوری

(یہ نظم اب سے چالیس سال پیشتر حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی میں ۱۹۳۷ء میں یوم اقبال پر پڑھی گئی تھی)

اے خوشا اقبال مشرق مرحبا   تیری ہستی پر ہے نازاں ایشیا
جلوہ گر تو جب کہ صورت ہوا   جگمگایا ذرہ ذرہ ہند کا
تیری تابش حسنِ مشرق ہی نہیں
چشمِ مغرب بھی تو خیرہ ہو گئیں
دامنِ اردو کو جو دیکھا تہی   تیری دنیائے حمیت ہل گئی
وقف کر کے تو نے اپنی زندگی   جامِ مشرق میں مئے مغرب بھری
"ٹیمس" اور گنگا کا سنگم کر دیا
قطرۂ شبنم میں طوفاں بھر دیا
کتنی پھیکی تھی ہماری شاعری   اک کہانی سی گل و بلبل کی تھی
تو نے لیکن وہ ترقی اس کو دی   کرتی ہے انگلش کی اب یہ ہمسری
یہ بدولت تیرے مالامال ہے
تو جہانِ شعر کا اقبال ہے
شعر کے پردے میں قدرت کے پیام   خلق کو دیتا رہا ہے تو مدام
تیرا ہر شعرِ تصوف کا کلام   ہے مئے عرفاں کا اک رنگین جام
این مثل را تو حقیقت کردہ
شاعری جزویست از پیغمبری

جامِ دل میں لے کے عرفاں کی شراب   شاعری کی ڈال کر منہ پر نقاب
اور سے تو اپنی الہامی کتاب   بن کے آیا مشعلِ راہِ صواب
خوب دانم راز این عشوہ گری
تو لیے پردہ کتنی پیغمبری
نکلے آیا تو جہاں میں رہنما   درد لیکر اپنے دل میں قوم کا
تیرا ہر اک لفظ ہے بانگِ درا   قوم کو بیدار جس نے کر دیا
تیرا نغمہ صورِ اسرافیل ہے
اور قلم تیرا پرِ جبریل ہے
"گوئٹے" المانوی مشہور تھا   آسمانِ شعر کا جو ماہ تھا
جب رہینِ شیوۂ مشرق ہوا   اور سلامِ شرق تا مشرق کو دیا
در جوابش گفتنی پیغامِ مشرق
آفتابے ریختی بر شامِ شرق
اے جہانِ شاعری کے آفتاب   ہو کر اک ذرہ تجھی سے فیضیاب
پیش اب کرتا ہے اپنی آبِ دوست   ہے خجالت سے مگر تو آب آب
تحفۂ ساجد عقیدت کے یہ پھول
اے تو ہے عز و شرف گر ہوں قبول

مئے باقی

(علامہ اقبالؒ کے چند فارسی قطعات کے منظوم ترجمے)

از جناب عبداللہ خاور ایم اے

(۱)

متاعِ من دلِ درد آشنائے است نصیبِ من فغانِ نارسائے است
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوشتر کہ ہم خاموش وہم خونیں نوائے است

ہے دل برباد بھی، درد آشنا بھی
ہے قسمت میں فغانِ نارسا بھی
مری تربت پہ ہے لالے کا اک پھول
جو ہے خاموش بھی خونیں نوا بھی

(۲)

ندانم دل شہیدِ جلوۂ کیست نصیبِ او قرارِ یک نفس نیست
بصحرا بُردمش افسردہ تر گشت کنارِ آبجوئے زار بگریست

ہوا ہے دل شہیدِ نازکس کا
قرار اس کو نہیں حاصل کوئی پل
فسردہ ہے سرِ دامانِ صحرا
کنارِ آبجو گریاں مسلسل

(۳)

دگرگوں کرد لادینی جہاں را ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ با صدیقؓ دادی بشورے آور ایں آسودہ جاں را

دگرگوں کر رہے ہیں خاکداں کو
جو آثارِ بدن کہتے ہیں جاں کو

عطا مسلم کو ہو وہ تفسیرِ صدیقؓ
کہ جو تڑپا دے اس آسودہ جاں کو!

حرم از دیر گیرد رنگ و بوئے
بتِ ما پیرک ژولیدہ موئے
نیابی در برِ ما تیرہ بختاں
دلے روشن ز نورِ آرزوئے

حرم میں دیر کا سا رنگ بو ہے
ہمارا پیر اک ژولیدہ مو ہے
نہیں ہم تیرہ بختوں میں وہ اک دل
کہ جو چشم و چراغِ آرزو ہے!

(۵)

سبوئے خانقاہاں خالی از مے
کند مکتب رہِ بطحٰی کردہ راطے
ز بزمِ شاعراں افسردہ رفتم
نواہا مردہ بیروں رفت از نے

سبوئے خانقہ محروم مے سے
مدارس ہو گئے بے فیض کیسے!
یہ بزمِ شاعرانِ مردہ دل ہے
کہ نغمے مردہ ہو کر نکلے نے سے!

(۶)

مرا از دردِ پنہاں زعفرانی
ترا اود خوں زچشم ارغوانی!
سخن اندر گلوئے من گرہ بست
تو احوال مرا ناگفتہ دانی!

ہے چہرہ دردِ پنہاں سے فروزاں
ہے اشکِ خوں سے نم دامانِ مژگاں
جو گھٹ کر رہ گئی ہے بات دل میں
نمایاں تجھ پہ ہے حسنِ گریزاں!

(۷)

دلے برکف نہادم دلبرے نیست
متاعے داشتم غارتگرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر
مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

ہے دل ویراں کوئی دلبر نہیں ہے
متاعِ غم کا غارت گر نہیں ہے
مرے دل میں ترا جلوہ سما جائے
کوئی بھی مجھ سے تنہا تر نہیں ہے

(۸)

مسلمانیم و آزاد از مکانیم بروں از حلقۂ نہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے بہائے ہر خداوندے بدانیم

مسلماں ہم ہیں آزاد مکاں ہیں
ورائے حلقۂ نہ آسماں ہیں
ہمیں بخشا گیا وہ ذوقِ سجدہ
کہ سب اصنام نقشِ رائیگاں ہیں

(۹)

کسے کو فاش دید اسرارِ جاں را نہ بیند جز بہ چشم خود جہاں را
نوائے آفریں در سینۂ خویش بہارے می تواں کردن خزاں را

کوئی سمجھے اگر اسرارِ جاں کو
خود اپنی آنکھ سے دیکھے جہاں کو
وہ نغمہ دل میں کر تخلیق ہمدم
بہاروں میں بدل دے جو خزاں کو

(۱۰)

نگہدار آں چہ در آب و گلِ تست سرور و سوز و مستی حاصلِ تست
تہی دیدم سبوئے این و آں را مئے باقی بہ مینائے دلِ تست

تری دولت، متاعِ حسنِ ذاتی
سرور و سوز و مستی تیرا حاصل
سبو خالی ہیں بزمِ غیر کے آج
مئے باقی کا ساغر ہے ترا دل!

(۱۱)

نکو می خواں خطِ سیمائے خود را　　بدست آور رگِ فردائے خود را
چو من پا در بیابانِ حرم نہ　　کہ بینی اندر و پہنائے خود را

وہ ہے تیرے مقدر کا ستارا
مقید کر کہ "فردا" ہے شرارا
قدم رکھ بڑھ کے صحرائے حرم میں
کہ تیری وسعتیں ہوں آشکارا

(۱۲)

سحرگاں کہ روشن شد در و دشت　　صدا زد مرغے از شاخِ نخیلے
فرو ہل خیمہ اے فرزندِ صحرا　　کہ نتواں زیست بے ذوقِ رحیلے

سحر آئی، جبینِ دشت جھلکی
کسی طائر کی گونجی دشت میں لے
اُٹھا خیمہ، بس اے فرزندِ صحرا
کہ تیری زندگی ذوقِ سفر ہے

(العلم کے لئے محبی سید مصطفٰی علی بریلوی صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں)

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اقبال

علامہ اقبال اور مغربی تہذیب

از ڈاکٹر راجہ غلام سرور سابق صدر شعبۂ فارسی کراچی یونیورسٹی

علامہ اقبال کے بنیادی طرز فکر معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ ان کے طرز فکر کی بنیاد کیا تھی؟ یہ ضروری ہے کہ ان کی زندگی اور اُن کے ماحول پر نگاہ ڈالی جائے۔

علامہ اقبال کی زندگی تین حصوں پر مشتمل ہے

پہلا حصہ ولادت سے لے کر ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصہ میں انہوں نے پہلے اپنے خاندان کے ماحول میں اپنا بچپن گذارا۔ ان کے خاندان کا ماحول دینی اور صوفیانہ تھا۔ اس لئے ان کے لوحِ قلب پر پہلا بنیادی نقش دینی اور صوفیانہ تعلیم کا بنا۔ اس کے بعد وہ فارسی اور عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے معلم کے سپرد کئے گئے جو لسانی اور دینی تعلیم میں مہارت رکھتے تھے۔ اور جنہوں نے اس ابتدائی دور میں اقبال کو نہ صرف فارسی اور عربی کے ساتھ دینی تعلیم دی، بلکہ انہوں نے اُن کے سامنے اسلامی اخلاق کا صحیح نمونہ بھی پیش کیا۔ یہ دوسرا بنیادی نقش تھا جو اقبال کے لوحِ قلب پر بنا۔

اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے اقبال لاہور گئے۔ جہاں انہوں نے عربی زبان کے ساتھ مغربی اور اسلامی فلسفہ کی تعلیم پائی۔ اور ایک انگریز معلم اور مفکر کی صحبت میں مغربی اور اسلامی طرز فکر سے آشنا ہوئے۔

ان کی تعلیمی زندگی ۱۸۹۹ء میں ختم ہوگئی۔ اور وہ ۱۹۰۵ء تک لاہور کی دو مشہور درسگاہوں میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ضمنی طور پر انہوں نے تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان اور اس کے اسباب و علل ان پر روشن ہوئے۔

اسی دور میں انہوں نے اپنے ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ بھی کیا۔ اور مسلمان قوم کی بے بسی اور پستی کے دردناک مناظر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔

اسی زمانے میں اس ملک میں سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کشمکش کی بنیاد پڑی۔ وہ ان تمام امور اور

واقعات سے متاثر ہوئے۔ ان کی طرزِ فکر کے بنیادی نقوش یہی ہیں۔

۱۹۰۵ء میں ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جبکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے عازم یورپ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سہ سالہ قیام کے دوران میں انگلستان اور جرمنی میں مغربی اور اسلامی فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کے اعلیٰ تحقیقی کام کا خاص موضوع اسلامی اور ایرانی تصوف تھا جس پر انہوں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد انہوں نے انگلستان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔

یورپ کے قیام کے دوران میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے اپنا بہت سا قیمتی وقت مغربی تہذیب وتمدن کے مطالعہ اور مشاہدہ میں صرف کیا اور ان کی حقیقت بیں آنکھوں پر وہ تمام حقائق روشن ہوئے جن سے وہ اُس وقت تک ناآشنا تھے۔ اور اسی ناآشنائی کی بناپر وہ جن کو نہ صرف اچھا سمجھتے رہے بلکہ انگلستان جانے سے پہلے ان کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔

انہوں نے وہاں خاص طور پر وطنیت، قومیت، ملوکیت، جمہوریت اور سرمایہ داری کے مغربی نظریات کا عمیق مطالعہ کیا۔ اور ان پر مذکورہ نظریات کی اصلی حقیقت واضح ہو گئی۔

اس کے علاوہ انہوں نے مغربی تہذیب وتمدن کے محاسن اور قبائح پر خود مغربی حکما کی آرا کا مطالعہ بھی کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یورپ میں ذہنی اور فکری انقلاب کی بدولت علوم وفنون اور صنائع نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور سائنس دانوں کی پیہم کوششوں سے فطرت کے بہت سے سربستہ راز یکے بعد دیگرے کھلتے گئے ہیں اور نوعِ انسانی اس سربستہ رازوں سے آشنا ہوتی گئی۔ —— لیکن

ان سائنسی ترقیوں اور ایجادوں نے دینی عقائد کی بنیادوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا ہے اور اُس صانعِ حقیقی پر اعتقاد کی بنیادوں کو کلی طور پر ہلا دیا ہے۔ اخلاق اور روحانیت کو یکسر محو کر دیا گیا ہے بلکہ لوگوں کو دین اور ایمان اور فضیلتِ اخلاق سے قطعی طور پر بیگانہ اور بےتعلق بنا دیا گیا ہے۔

عقلِ انسانی کی روز افزوں بوالعجبیوں سے مادیت کو تو ترقی ضرور ہوئی لیکن روحانیت کو یکسر زوال آگیا اور سائنس اور دین کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ظاہر بیں لوگ فقط ایسے ہی واقعات اور حادثات سے متاثر ہوتے ہیں جن کا تعلق فقط ظاہر سے ہوتا ہے اور ان کی عقل ان باریک رشتوں کو نہیں دیکھ سکتی جو ان واقعات کو ترتیب دیتے ہیں۔ لیکن عمیق نگاہیں ایسے واقعات اور حادثات کے محرکات کو ڈھونڈتی ہیں اور نتائج کے اسباب معلوم کرتی ہیں اور ان حلقوں کو تلاش کرتی ہیں جو حادثات کو ایک زنجیر کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کا تعلق دوسرے طبقے سے ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مغربی تہذیب وتمدن کی کارفرمائیوں

اور ترقیوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا بلکہ ان کے اسباب وعلل پر بھی عمیق نگاہ ڈالی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ان نتائج کو بھی معلوم کیا جو مغربی تہذیب وتمدن نے پیدا کئے تھے اور جن سے اس وقت تک اہل مشرق بالعموم ناآشنا تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ علامہ اقبال پہلے شخص تھے جو اس حقیقت سے کماحقہ واقف ہوئے اور نیز وہ پہلے شخص تھے جن کے موج قلب پر مغربی تہذیب وتمدن کے برے اثرات کے نقوش مرتسم ہوئے اور انہوں نے ان سے بیزاری کا احساس کیا تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ وہ دور ہے جس میں اقبال کی طرزِ فکر نے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔

یورپ سے واپس آنے پر ان کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اور وہ علمی، تدریسی اور قانونی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب اس برصغیر میں سیاسی بیداری عام ہو چکی تھی اور حصولِ آزادی کے لئے کشمکش کے جذبات بھی زیادہ تیز تر ہو چکے تھے۔

علامہ اقبال جن کی زندگی کا بہت سا حصہ عالمی اور بالخصوص اسلامی تحریک اور انقلابوں کے مطالعہ میں صرف ہو چکا تھا، ایسے وقت میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اس سیاسی کشمکش میں شامل ہو گئے۔ لیکن ان کا شمول محدود اور طریق کار جداگانہ تھا۔

وہ مسلمانوں میں ذہنی اور فکری انقلاب کے داعی تھے اور چونکہ خداوند تعالیٰ نے ان کی فطرت میں شاعری کو ودیعت کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے شعر کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنایا اور اپنے احساسات کو شعر کے پردے میں پیش کرنا شروع کیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ یہ ہولناک جنگ چار سال تک جاری رہی۔ اس کے خاتمے پر مغربی طاقتوں نے مسلمان ممالک پر وہ انسانیت سوز مظالم توڑے جن سے انسانیت کی روح کانپ جاتی ہے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ عالم کی سیاسی عظمت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ مسلمان ممالک کی تقسیم اسی نظریہ "وطنیت" پر کی گئی جو مغربی تہذیب کی پیداوار تھا چنانچہ جو نئی اسلامی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ان سب پر مغربی طاقتوں کا غلبہ تھا۔ جس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ مغربی طاقتوں کی ہوسِ ملک گیری روز افزوں ہے۔ اور بالخصوص مسلمان ممالک ان کی ہوس کا نشانہ ہیں۔

علامہ اقبال ان سیاسی تغیرات سے بہت متاثر ہوئے اور مغربی طاقتوں کی ہوسِ ملک گیری سے ان کے قلب میں ان کے خلاف ایک جذبۂ تنفر پیدا ہوا۔

یہ برصغیر بھی عالمی سیاست سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور بالخصوص مسلمان قوم کی ذہنی اور فکری غلامی اور محکم ہو گئی اور ان کے تاریک مستقبل کا ہولناک منظر بھی علامہ اقبال کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

ان دردناک حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے عزمِ صمیم کیا کہ وہ مسلمان قوم کو ذہنی، فکری اور سیاسی غلامی سے

نجات دلانے میں سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ ان کا یہی وہ عزم محکم تھا جس نے بعد میں مغربی تہذیب کے خلاف جہاد کی صورت اختیار کی۔
اس برصغیر میں مغربی سیاست کے خلاف جہاد کا آغاز تو بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن علامہ اقبال ہی وہ عظیم سیاسی مفکر ہیں جنہوں کے اُس کے خلاف ذہنی اور فکری جہاد کا آغاز کیا۔ اور اس عظیم مقصد میں کامیابی کے لئے انہوں نے شاعری کو اپنا اسلحہ قرار دیا۔

اگر مغربی تہذیب کے خلاف علامہ اقبال کی فکری کوششوں کا عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوششوں کے دو دور ہیں۔

پہلا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ وہ یورپ سے واپس آئے تھے۔ اور ۱۹۲۴ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کی پانچ تصنیفات یعنی اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، بانگِ درا اور زبورِ عجم شائع ہو چکی تھیں، اور ایک مبصر کی عمیق نگاہ اور تصنیفات میں ایسے تمام موضوعات کو پا لیتی تھی جو مغربی تہذیب کے خلاف ہیں۔

اس دور میں علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے خلاف جو کچھ کہا وہ اکثر و بیشتر الفاظ کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ اس دور میں ان کا لہجہ نرم اور ان کی زبان ملائم تھی۔ اور ان کے کلام کے خاص مطالعہ ہی سے وہ باریک نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو انہوں نے الفاظ کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں یہ نقوش واضح بھی ہیں۔

مغربی تہذیب کے خلاف علامہ اقبال کے فکری جہاد کا دوسرا دور ۱۹۲۴ء سے شروع ہوتا ہے اور ان کی زندگی کے خاتمے پر تمام ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کی دوسری چار مشہور تصانیف یعنی جاوید نامہ، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پس چہ باید کرد، شائع ہوئیں۔ البتہ ان کا آخری کلام ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے بعد مدون اور مرتب ہو کر "ارمغانِ حجاز" کے نام سے شائع ہوا۔

اس دور میں انہوں نے مغربی تہذیب کے خلاف اپنے نظریات کی تکمیل کی، اور اس موضوع کو اپنی تمام تصنیفات میں مختلف پیرایوں میں نہایت پُرزور الفاظ میں پیش کیا۔ لیکن اس ضمن میں جو اہمیت ان کی "ضربِ کلیم" کو حاصل ہے وہ ان کی کسی دوسری تصنیف کو نہیں۔ بلکہ خود ان کے اپنے الفاظ میں ان کے افکار کا یہ نادر مجموعہ دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ" ہے۔

اس سلسلہ میں ان کی ایک اہم نثری تصنیف کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جو انگریزی زبان میں ہے اور جس کا موضوع "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" ہے یہ ان چھ فلسفیانہ لکچروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اس موضوع پر دئیے لیکن ان لکچروں میں بھی انہوں نے مختلف مقامات پر مغربی تہذیب کے خلاف اظہار رائے کیا ہے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اسباب کو ایک ترتیب سے پیش کر دیا جائے جن کی بنا پر علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے خلاف جہاد کیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کا خاندانی، دینی، صوفیانہ اور تعلیمی ماحول تھا جس سے وہ متاثر ہوئے اور یہ اثرات آخری دم تک ان کے قلب پر باقی رہے۔

یورپ کے قیام کے دوران میں مغربی تہذیب کے برے اثرات نے ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑا اور وہاں سے واپسی پر اس برصغیر کی سیاسی کشمکش بھی ان کی فکر پر اثر انداز ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں کی فتنہ انگیزیاں اور مسلمان ممالک پر ان کے بے پناہ مظالم کے دلدوز مناظر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔

لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے علامہ اقبال کے قلب کو متاثر کیا وہ مغربی تعلیم کے وہ بُرے اثرات تھے جو مسلمان نوجوانوں پر ہوئے۔ اور جن سے ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو مسلمان قوم تباہی کی تکمیل خود اُن کے اپنے ہی ہاتھوں سے ہو جائے گی۔

یہ تھے وہ چند اہم امور جنہوں نے علامہ کے قلب وجگر پر ایک کاری ضرب لگائی اور چونکہ وہ بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ اس لئے وہ تڑپ اٹھے اور ان کے افکار ان کی اسی تڑپ کی صدائے بازگشت ہیں۔

اب وہ موضوعات پیش کئے جاتے ہیں جن پر علامہ اقبال نے اظہار رائے فرمایا ہے۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے جس مغربی نظریہ کی مخالفت کی وہ نظریہ وطنیت اور قومیت" تھا۔ اگرچہ یہ وہی نظریہ ہے جس کی تبلیغ وہ یورپ جانے سے پہلے کر چکے تھے۔ اور جس کا ثبوت ان کی اُس مشہور نظم سے ملتا ہے جس کا عنوان "ترانۂ ہندی" ہے۔

لیکن یورپ کے قیام کے دوران میں اس نظریہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے بعد وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے اور انہوں نے واپس آکر اپنے عقیدہ کا اظہار مختلف منظومات میں کیا۔ چنانچہ "بانگِ درا" کی ایک مشہور نظم "وطنیت" میں وہ فرماتے ہیں۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے ۔۔۔ غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے ۔۔۔ اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے ۔۔۔ قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسی نظریہ کے متعلق انہوں نے پھر ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے :-

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اسی سلسلہ میں انہوں نے نظریۂ "قومیت" کی بھی تشریح کی ہے اور ملتِ اسلامیہ اور مغربی اقوام کا مقابلہ کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کی حقیقت کو اس طرح سے پیش کیا ہے :-

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟ — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسی ضمن میں انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "رموزِ بے خودی" میں اس نکتہ کی تفسیر بھی کی ہے کہ توحید اور رسالت "نہایتِ مکانی" سے نادرا ہیں اور چونکہ ملتِ اسلامیہ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے۔ اس لئے ملتِ اسلامیہ بھی "نہایتِ مکانی" نہیں رکھتی۔

اسی سلسلے میں انہوں نے "ہجرتِ نبوی" کا وہ فلسفہ پیش کیا ہے جو ان سے پہلے کسی نے اس طرح سے پیش نہیں کیا۔ اور جس میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو یہ درس دیا ہے کہ وہ قیدِ مقام سے آزاد ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ "وطن" اس کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔

دوسری وہ چیز جس کے متعلق انہوں نے اپنے افکار میں اپنے عقائد کو پیش کیا ہے۔ یورپ کی "جمہوری طرزِ حکومت" ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں؟ — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

علامہ اقبال جس امر کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوئے اور جس کا اظہار انہوں نے بار بار اپنے افکار میں کیا ہے وہ "جدید مغربی تعلیم" اور مسلمان نوجوان مردوں اور عورتوں پر اس کے برے اثرات ہیں اس برصغیر میں مغربی تعلیم کے جو اثرات ہوئے ان سے ان کی رائے میں مسلمان قوم کے افراد کو نفع کم اور نقصان زیادہ ہوا چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ایک دوسرے مقام پر ایک جدید تعلیم یافتہ فرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

تری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ — ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ؟

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

علامہ اقبال ایک مغرب زدہ نوجوان کے عادات و اطوار پر معترض ہوتے ہوئے نہایت دردناک الفاظ میں اپنے قلبی احساسات کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں:۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟ — نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں — کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

علامہ اقبال نے مسلمان عورتوں پر جدید تعلیم کے اثراتِ بد کا ذکر اپنی تصنیفات میں اکثر مقامات پر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ چونکہ نوعِ انسانی کی بقا ''امومت'' سے ہے، اس لیے اس جذبہ کا تحفظ اور احترام اصلِ اسلام ہے اس لئے انہوں نے جہاں ''امومت'' کے اوصاف بیان کئے ہیں وہاں عصرِ جدید کی ان مغرب زدہ عورتوں کے خلاف بھی اظہارِ رائے کیا ہے جو جذبۂ ''امومت'' سے بیزاری کو ''نسائیت'' کا کمال سمجھتی ہیں۔

انہوں نے اپنی مشہور تصنیف ''ضربِ کلیم'' میں ''عورت'' کا خاص عنوان باندھا ہے اور اس باب میں عصرِ حاضر میں عورت سے متعلق چند اہم مسائل کو پیش کیا ہے، چنانچہ ایک نظم میں جس کا عنوان ''عورت اور تعلیم'' ہے فرماتے ہیں:۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

تہذیبِ جدید کے اثراتِ بد سے ''مذہب'' کو جو نقصان پہنچا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کو اپنے افکار میں خاص طور پر بے نقاب کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کی وہ بنیادی فکر، جس کا تعلق دین سے ہے، خاص طور پر نمایاں ہے۔ ''ضربِ کلیم'' میں وہ آنحضرت کی روحِ مبارک سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے؟

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے؟

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ — آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

"عقل و عشق" علامہ اقبال کا ایک خاص موضوع ہے جس کو انہوں نے اپنی تمام تصنیفات میں اکثر مقامات پر پیش کیا ہے۔ اور نہایت ہی حسین الفاظ میں "عقل و عشق" کے مبارزہ کی تصویر کھینچی ہے۔

مغربی اقوام کے عقیدے میں تمام ترقیوں کا سرچشمہ "عقل" ہے۔ اور مادیت کے غلبہ کی وجہ سے وہ "عشق" کی عظمت کو پہچانتے اور اس کی معنوی کارفرمائیوں پر یقین کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں لیکن اس کے برعکس علامہ اقبال قوتِ عشق کے طرفدار ہیں اور وہ مسلمان کی ترقی اور عظمت کا راز "عشق" ہی کی پہچان میں پاتے ہیں چنانچہ "بالِ جبریل" میں وہ "عشق" کے اوصاف اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

ضربِ کلیم" میں "علم و عشق" کے عنوان سے انہوں نے ایک معرکۃ الآرا نظم پیش کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں — عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں — عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب

علامہ اقبال اسلام کے سچے فرزند اور پیغمبر اسلام کے سچے شیدائی تھے، وہ مفکرِ اسلام اور مبلغِ اسلام تھے۔ ان کی طرزِ فکر کی بنیاد اسلام پر تھی اور وہ اسی بنا پر تمام عمر تہذیبِ مغرب کے بُرے اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔

امیر قافلۂ فکرِ نو بہ راہِ قدیم

از جناب کنور اعظم علی خاں خسروی

(۱)

وہ ایک شخص نوا جس کی نغمۂ جبریل
وہ ایک شخص صدا جس کی صورِ اسرافیل
وہ ایک شخص کہ رومیؒ کا ہند میں جو مثیل
وہ ایک شخص کہ فکر و شعور کی قندیل
وہ شخص جو شبِ ملت میں صبح کا پیغام
شعورِ مسلمِ ہندی پہ یثربی الہام

(۲)

امامِ فلسفہ و منطق و کلامِ جدید
نگاہ جس کی بسیط اور فکر جس کی حدید
خرد بھی تیز تھی جس کی جنوں بھی جس کا شدید
خودی سے درس میں جس کے تھی بیخودی کی نشید
صنم کدے میں حرم کا سفیرِ خوش گفتار
پیامِ حق کا مبلغ بہ پردۂ اشعار

(۳)

افق پہ ذہنِ مسلماں کے فکرِ نو کی کرن
دلِ فسردۂ ملت میں آرزو کی چبھن
سکوتِ سینۂ مسلم میں اہتزازِ سخن
ضمیرِ امت خفتہ میں جستجو کی لگن
پیام جس کا کلامِ خدا کا آئینہ
شعورِ حکمتِ قرآں کا ایک گنجینہ

(۴)

حدیثِ عشق زبانِ خرد سے جس نے کہی
قلم سے ہوش کے جس نے جنوں کی بات لکھی
ہر ایک لفظ میں جس کے رچا ہے رنگِ وحی
ہر ایک حرف ہے آئینہ دارِ فکرِ نبیؐ
ہر ایک نقطہ ستارہ ہے چرخِ عرفاں کا
کلام پیکرِ لفظی ہے روحِ قرآں کا

(۵)

قلوبِ مردہ کو ہر بات جس کی جامِ حیات
مذاقِ تلخ کو ہر شعر جس کا شہد و نبات
نظر پہ جس کی یہاں شیوہ ہائے ذات و صفات
کھلی ہیں فکر پہ جس کی وجود کی آیات
وہ حق نگاہ و حقائق شناس و حق آواز
خودی کو جس نے سکھائے خدائی کے انداز

(۶)

وہ رندِ میکدۂ ساقیٔ شرابِ خودی
وہ مستِ نشۂ خود آگہی و خود طلبی
وہ نشہ جو ہے سرورِ کمالِ دیدہ وری
کمالِ دیدہ وری کیا سوائے خود نگری؟
کمالِ خود نگری، اپنی ذات کا عرفاں
شناخت اپنی نہ ہو گر، تو ہر یقیں ہے گماں

(۷)

خودی بلند کہ خدا پہ یقین سے تھی جس کی
جنونِ عقل کی معراج صرف عشق سے تھی
وہ عشق جس کی نہایت محمدؐ عربی
کہ جس کی ذات ہے ماورائے ہر جلی و خفی
اُسی کی فکر کی تشہیر تھی کلام اُس کا
اُسی کے قول کی تبلیغ تھی پیام اُس کا

(۸)

امیرِ قافلۂ فکرِ نو ، براہِ قدیم
وہ راہِ عقل جنوں ہی فقط ہے جس میں ندیم
وہ راہِ عشق کہ ہے جادۂ عقولِ سلیم
وہ راہِ حق کہ مسافر ہے جس کی روحِ عظیم
وہ روحِ دہر کہ پیکر بدلتی جاتی ہے
ہر ایک عہد کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

(۹)

وہ روح پیکرِ اظہار کی تلاش میں تھی
خود اپنی بات بھی سننے کو جو ترستی رہی
کسی بھی فکر و نظر میں جسے جگہ نہ ملی
لباسِ نطق جو اُس شخص کا پہن کے کھلی
وہ شخص جس نے خودی کو خدا کا راز کہا
خودی کو نغمۂ حق ، بیخودی کو ساز کہا

(۱۰)

وہ بیخودی ، کہ خودی کی ہے کاشفِ اسرار
وہی خودی ، کہ خدا جس کا محورِ ادوار
صفات و ذاتِ خدا کا جو مراۃِ اظہار
وجود اور عدم دونوں جس کا ہیں قرار
خودی کو جس نے خدائی کا اہتمام کہا
شیونِ غیب و شہادت کا انضمام کہا

(۱۱)

نگاہ و فکر کے محضر پہ ایک مُہرِ دوام
خرد بھی جس کا ہے موقف جنوں بھی جس کا مقام
دیارِ کفر میں واردِ سفارتِ اسلام
بتوں کے دیس میں لایا تھا جو خدا کا پیام
اُسی کی شمع سے جلتے رہیں گے دل کے چراغ
اُس کے بادۂ افکار سے بھریں گے ایاغ

(۱۲)

نظر نے جس کی چنا تھا وہ گوہرِ نایاب
جو تیرہ وقتیٔ مسلم میں تھا دُرِ شب تاب
رہا جو بحرِ حوادث کی تہ میں تھا بیتاب
ہر ایک موج سے لیکن بڑھی تھی جس کی آب
وہ دُرجِ ملتِ مسلم کا لولوئے شہوار
محمدؐ اور علیؓ کا وہ مجمعِ کردار

(۱۳)

وہ اک ستارہ کہ جو اپنے دور سے تھا خفا
غبارِ شرق سے نالاں فضائے غرب میں تھا
نگاہِ مردِ قلندر نے جس کو ڈھونڈ لیا
سمائے ہند پہ لایا اُسے تو دُھند چھٹا
تفکر اور تدبر بہم ہوئے ایسے
صنم کدے و کلیسا کے جوڑ کھلنے لگے

(۱۴)

وہ ایک شخص کہ اقبالِ ملتِ اسلام
وہ دوسرا کہ رہا قائدِ خواص و عوام
وہ دونوں شخص کہ فکر و عمل کے تھے پیغام
بیک زمانہ تھے ملت پہ حق کے دو انعام
جمالِ عشق و جلالِ خرد کے دو پیکر
سلام ربِ جمال و جلال دونوں پر

(ختم)

بزمِ کانفرنس

جناب پروفیسر رحمت فرخ آبادی
اسلامیہ کالج سکھر

آپ نے میرے مقالہ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے بڑا انعام مجھے نہیں مل سکتا۔ آپ کے جذباتِ محبت نے میری کاوش و جستجو کو مزید تقویت بخشی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ شکریہ ادا کر سکوں۔

بات دراصل یوں ہے کہ محترم پروفیسر ایوب قادری صاحب سندھ پر ہی مقالہ چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے یہ مزید عنایت کی کہ صفحات کی پابندی ختم کر دی، جو کچھ میرے پاس تھا، اس کی مدد سے یہ مقالہ لکھا گیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی، بعض واقعات تشنہ ہیں اور کچھ کا تو تذکرہ بھی نہیں ہے اور سکھر جیسے شہر میں رہ کر مطلوبہ مواد کا حصول بھی تو کارِ دشوار ہے۔ بہرحال اب گذشتہ تین چار ماہ میں اسی موضوع "قائدِ اعظم اور سندھ" پر مزید مواد ملا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ وقت ملنے پر اسے نئے سرے سے ترتیب دوں۔ اور پھر ایک نیا سلسلہ مضامین بعنوان "قائدِ اعظم کے ہم عصر سندھ کے سیاسی رہنما" لکھوں۔

آپ نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میں یہ اخذ کر پایا ہوں کہ سندھ کی دورِ جدید کی تاریخ ۱۸۴۳ء سے قیامِ وطن تک قلم بند کی جائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس موضوع پر مواد اس بری طرح بکھرا ہوا ہے کہ اس کا حصول قلیل عرصہ میں سکھر میں رہتے ہوئے ناممکن ہے۔ ویسے اسی دور پر کچھ تحقیقی کام ہوا ہے۔ مثلاً سندھ مسلم لیگ پر ایک صاحب نے امریکہ سے پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۵ء کے دور پر غالباً ۱۹۶۴ء میں لندن سے ڈاکٹریٹ کر چکی ہیں۔ تحریکِ پاکستان ریکارڈ جامعہ کراچی اور مرکزی وزارتِ تعلیم میں محفوظ ہے۔ موجودہ حالات میں اس موضوع پر ڈیڑھ دو سو صفحات کی کتاب ہی تیار ہو سکتی ہے جو اس لحاظ سے اپنی افادیت رکھے گی کہ سندھ کے جدید دور پر پہلا کام ہو گا جو کسی زبان میں کیا گیا ہو۔ بہرحال میں اس موضوع پر لکھنے کا حتمی وعدہ اس وقت کروں گا جب آپ موضوع کی وضاحت فرمادیں گے۔

سردست ذہن ایک اور موضوع کی طرف مائل ہے۔ عنوان ہے "سندھ میں مسلمانوں کے علمی و ادبی کارنامے"۔ گذشتہ دو ماہ میں دو صد سے زائد کتب و رسائل پر نشان لگا چکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ مواد مکمل دستیاب ہو جائے تو لکھنا شروع کروں۔ اسی طرح اردو میں سندھی ادب کی تاریخ بھی لکھنے کا خیال ہے۔

یہ سال اقبال ہے۔ العلم کے لئے "اقبال کے تعلیمی نظریات" پر ایک مقالہ کے لئے تیاری کر رہا ہوں۔ رفتہ رفتہ مواد جمع ہو رہا ہے اور نقل ہو رہا ہے۔ دعا کریں کہ اس مقالہ کو مکمل کر کے جلد روانہ کر دوں۔ اور کیا لکھوں خط کافی طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اب بند کرتا ہوں اور بواپسی ڈاک آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ آپ نے ایک خط میں چوتھی دنیا ارسال کرنے کے بارے میں لکھا تھا۔ مجھے کتاب نہیں ملی یاد دہانی کرا رہا ہوں، اگر مناسب سمجھیں تو ارسال کر دیں۔ باقی سب خیریت ہے۔

(۳)

آپ نے قائدِ اعظم نمبر نکالا، خاصے کی چیز ہے بعض ایسے نکات آپ نے پیش کئے جن سے ہم اب تک بے خبر تھے۔ صحیح ہے علم کسی کی میراث نہیں۔ میں نے رسالے کو مکمل پڑھا، اس قدر معلومات حاصل ہوئیں کہ خط لکھنا بھول گیا۔ بہرحال اب میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ ایک عالم اور ایک طالب علم کے مبارکباد دینے میں بڑا فرق ہے۔ میں طالب علم ہوں اور اسی نسبت سے اتنا عظیم قائدِ اعظم نمبر نکالنے پر اس کے مدیر عالم کو مبارکباد دے رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

گذشتہ جنگ کے دو سنڈے ایڈیشنوں میں آپ کی آپ بیتی پڑھی، لیکن ان کی اقساط شائع ہونے سے قبل ہی مجھے اس بارے میں نہ صرف اطلاع بلکہ بعض واقعات کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ میرا گمان تھا کہ شاید کتابی شکل میں شائع ہو گی۔ لیکن جنگ نے یہ سلسلہ اچھا شروع کیا ہے کہ کم از کم ہر ہفتے ایک قسط تو پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اپنی شگفتگی اور دلآویزی کو بڑے والہانہ انداز میں برقرار رکھا ہے اور بعض واقعات کا جس آسان اور دلنشین پیرائے میں

موجودہ حالات سے موازنہ کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ ابھی تو دو[1] اقساط ہی شائع ہوئی ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ آپ کی آپ بیتی نصف صدی سے زائد عرصہ کی نہ صرف ادبی اور تعلیمی ڈائری بلکہ مسلمانان پاک و ہند کی ایک انداز سے انسائیکلوپیڈیا ہوگی۔ یہ آپ کا حق ہے کہ اس دور کے حالات و واقعات اپنی آئندہ نسل کے گوش گذار کریں۔

درحقیقت ہماری تاریخ کی سب سے بڑی بدقسمتی تحریک آزادی کے دور کی یہ رہی کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے اس حق کو فراموش کر دیا۔ وہ خود تو گوشۂ گمنامی میں جا پڑے لیکن اپنی نسلوں کو بھی ایک حد تک ماضی سے بیگانہ کر گئے۔ ہمارے بزرگوں کی اس کوتاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم اپنے نظریۂ حیات تک سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ بات دراصل یوں ہے۔ ہندو قوم اور کانگرس پارٹی کے سیکنڈ گریڈ لیڈر نے اپنی سرگرمیوں سے اپنی قوم کو بیگانہ نہ رکھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے مبالغہ آرائی سے کام کیا اور اس طرح اس قوم نے تحریک آزادی میں اپنے رول کی ایک بھاری بھرکم (یہ الفاظ میں ناپ اور تول کے معنوں میں لکھ رہا ہوں) کمبالغہ آمیز تاریخ مرتب کر لی۔

درحقیقت ہر نسل کو ایک سرسید کی ضرورت ہوتی ہے۔ دلستان سرسید سے وابستہ ہونے کی صورت میں اب یہ کام آپ کے سپرد ہے، اور آپ اسے جس خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، وہ آپ ہی کا حق ہے۔ خدا تعالیٰ تادیر آپ کا سایہ ہم لوگوں کے سروں پر قائم رکھے اور آپ کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں پیروئ سرسید کو پیروئ مغرب پر فوقیت دیتا ہوں۔

"العلم" کے اقبال نمبر کے اقبال کے تعلیمی نظریات پر ایک مقالہ کی تیاری کر رہا ہوں۔ یہ بالکل اسی انداز پر ہوگا جس انداز سے قائد اعظم پر ہے۔ اور ہو سکتا ہے اپنے انداز میں انوکھا مقالہ ہو۔ اب تک میں نے زیادہ تر اس موضوع پر اتنا پڑھا ہے کہ اب یہ موضوع کسی کتاب میں میں آ جائے تو دل گھبراتا ہے اور کیا لکھوں۔ آپ کی کتاب "چوتھی دنیا" مجھے مل گئی تھی۔ کچھ صفحات پڑھے۔ مطالعہ کے بعد فرصت سے مضمون لکھوں گا اور آپ کو ارسال کروں گا۔ فقط: والسلام

[1] ۲۱ اکتوبر تک چھ قسطیں شائع ہوئیں۔ (ایڈیٹر)

جنرل سکریٹری صاحب علامہ سید سلیمان ندوی لائبریری نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

ہمارے ملک کے اندر خواندگی تو یقیناً بڑھ رہی ہے مگر مطالعہ و کتب بینی کا مذاق انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اس مذاق کو عام کرتے ہیں لائبریریوں کا قیام ہمیشہ سے ایک مستحسن اقدام رہا ہے۔ ہمارے یہاں بھی لائبریریاں تو ہیں مگر مختصر سے مذاق کی تشنگی کو دور کرنے والی لائبریریاں چند ہی ہیں۔ پھر ان کا مقام وقوع ایسی جگہوں پر ہے جہاں پر ہر کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ چنانچہ ان باتوں کے پیش نظر سید صاحب مرحوم کے معتقدین نے ایک خصوصی لائبریری کی بنا ڈالی ہے جس کے ساتھ آپ کے تعاون کے ہم سب متمنی ہیں۔ اگر آپ اپنی مطبوعات سے ہمیں نوازتے رہیں تو یہ ایک بالمقصد تعاون ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ لاہور

آداب۔ دونوں خط مل گئے۔ بہت بہت شکریہ۔ میں خلیفہ شجاع الدین مرحوم کے اعزا کو نہیں جانتا۔ البتہ اپنے کتب خانہ میں تلاش کروں گا۔ اور اگر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے تعلق رکھنے والا لٹریچر ملا تو حاضر خدمت کروں گا۔ بہرحال اس میں وقت لگے گا۔

"مسلمانان پنجاب کی تعلیم" مل گئی۔ میرے پی ڈی میں تو تبصرے ایک سال سے بند ہیں۔ بہرحال کوئی اور تدبیر کروں گا۔

آپ نے والد (مولانا عبدالمجید سالک مرحوم) کی تحریر کا جو عکس بھیجا اس کے لئے شکریہ۔ والد آپ کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔

جناب ناصر الدین ناصر۔ لاہور

۹ اگست تک کوئٹے میں تھا۔ وہاں غالباً "جنگ" کے سنڈے ایڈیشن میں آپ کا تعلیم پر ایک نہایت فکر انگیز مضمون نظر نواز ہوا۔ جی چاہا کہ فوراً اپنے تاثرات قلمبند کر کے بصورت عریضہ مصنف کی دست بوسی کی سعادت حاصل کروں۔ کسب معاش میں آپ کے ہم مسلک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لاکھ بے لیفی اور بے دلی ہو۔ یہ یقینی ہے دل میں کبھی گھر نہیں کیا۔ اللہ کی رحمت ہی پر نظر رہی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک سرزمین سے (جدہ) ایک فرشتۂ غیب بشکل انسان شیخ محمد ریاض نامی وسط نومبر میں بھیجا اور اس نے

رن کیے وہ کچھ کر دیا کہ نقاش، نقشِ ثانی، بہتر کشد ز اول۔ پھر بھی دل شکستہ نہ ہوا، معلوم نہیں کیوں، اسی دوران آپ کے سلور جوبلی نمبر، قائدِ اعظم نمبر درِ دل پر دستک دیتے رہے اور ایک بے وجہ سی اداسی کا طلسم نہیں توڑ سکے۔ دل ہی دل میں شرمندہ بھی تھا کہ آپ کیا سوچتے ہوں گے۔ کہ یکایک پردۂ غیب سے T.V. کے پردے پر آپ کا چہرہ جلوہ افروز ہوا، اس سے آنکھیں بھی منور ہوئیں اور گویا دلِ افسردہ بھی یوسف کے زنداں کا چہرہ بن گیا۔ اور یہ اسی ضیاءِ مستعار کا اثر ہے کہ آج پردۂ انوار شیخوپورہ سے جہاں آجکل بیگم پرنسپل ہیں۔ ان چند الفاظ کا ہدیہ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

سالِ اقبال بھی ہے، شاید شعر و نغمہ کی کشش دامنِ دل کو پوری طرح کھینچ سکے۔ اور "العلم" کی محفلِ اقبال میں شرکت مجھے پھر سے اپنی جنتِ گمشدہ میں لے آئے۔

جناب وارث سرہندی
کنجرُوڑ (سیالکوٹ)

میری علمی اردو لغت پر اب تک پروفیسر شفیق جالندھری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور میرزا ادیب صاحبان بہت اچھے اور حوصلہ افزا تبصرے لکھ چکے ہیں۔ جن کی نقول مجھے مل گئی ہیں۔

ماہر صاحب کو لغت بحیثیت مجموعی بہت پسند ہے۔ مگر وہ اس کا دوسرا رُخ دکھانے یعنی اس کی غلطیاں تلاش کرنے میں بہت محنت سے ایک ایک لفظ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ تین چار نہایت نامے مجھے لکھ چکے ہیں جن میں بعض غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں سے کچھ غلطیاں تو کتابت کی ہیں جن کی انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔ کچھ غلطیاں ہمارے نقطۂ نظر کے اختلاف پر مبنی ہیں۔ یعنی میں جس کو غلط کہتا ہوں وہ اس کو صحیح کہنے پر مصر ہیں۔ اور جس کو میں صحیح کہتا ہوں، اس کو وہ غلط کہنے پر مصر ہیں۔ اور ہمارا یہ اختلاف دور ہوتا نظر نہیں آتا۔ وہ فاران میں ان غلطیوں پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں میں نے ان کو لکھا ہے کہ ایسی صورت میں وہ میرا جوابی مضمون شائع کرنے پر بھی تیار رہیں تاکہ میں بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کر سکوں۔ ویسے میں ان کا شکر گزار رہوں گا وہ لغت کا مطالعہ بہت وقتِ نظر سے کر رہے ہیں۔ ایسی چھیڑ چھاڑ تو ہم لوگوں میں ہوتی ہی رہتی ہے میں ان باتوں کا برا نہیں مانتا۔ بہرحال ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں گیا۔

میرا ناشر لغت کی تعارفی تقریب بہت شاندار طریقہ سے منعقد کرنے پر مصر ہے۔ اس میں لاہور کے تمام مشہور معروف اہلِ قلم کو مدعو کیا جائے گا۔ اس پر خرچ بھی بہت ہوگا۔ میں نمود و نمائش سے بیزار ہوں۔ اس تقریب کے سلسلے میں ناشر نے مجھے لاہور بلایا ہے۔ میں نے بالفعل انکار کر دیا ہے کہ میں فوری طور پر لاہور نہیں آ سکتا۔

میں نے ناشر کو یہی مشورہ دیا ہے کہ وہ اس تقریب پر خواہ مخواہ روپے ضائع کرنے سے باز رہے۔ لیکن امید نہیں کہ وہ میرا مشورہ قبول کرے۔ بصورت دیگر فروری کے وسط یا انتخابات کے بعد کوئی تاریخ مقرر کرے۔ اگر تقریب منعقد ہوئی تو میری شرکت لازمی ہوگی۔ خیر دیکھا جائے گا۔

میں آپ کی تحریر کی اصلاح کیا کروں گا۔ بہرحال یہ آپ کی نوازش ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں۔ جسٹس قدیر الدین صاحب کے پاس سے لغت واپس آنے تو ان کے تاثرات سے مطلع فرمائیے۔ آپ کی صحت کے لئے [illegible]

جناب پروفیسر سید عبدالرشید فاضل

"العلم" کا موقر "قائد اعظم نمبر" موصول ہوا۔ پرچے کے ظاہری حسن و جمال کو دیکھ کر ہی صحیح قیاس کن "گلستانِ من بہار مرا" کے پیشِ نظر میں نے سمجھ لیا تھا کہ آپ نے اس خاص نمبر کی تیاری کے لئے خاصا اہتمام کیا ہے۔ اور آپ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب ٹائٹل سے گزر کر لکھنے والوں کی فہرست پر نظر پڑی تو میرا قیاس صحیح ثابت ہوا کہ آپ کو ایسے بلند پایہ لکھنے والے مل گئے جن کے قیمتی خیالات نے پرچے کی ظاہری آرائش و زیبائش سے کہیں زیادہ اس کی معنوی خوبیوں کو پُرکشش بنا دیا ہے۔

قائدِ اعظم پر ہر سال جو اخبارات و رسائل کے خاص نمبر نکلتے رہتے ہیں ان میں قائدِ اعظم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کثرت سے مضامین پڑھنے میں آ چکے ہیں۔ اس کے باوجود یقین کیجئے، میں نے آپ کے اس نمبر سے اپنی معلومات میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے۔ اس لئے میں آپ کو اس کامیاب

شمارے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور آپ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ اور ایسے گرانقدر تحفے سے نوازا۔ امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔

جناب کنور اعظم علی خاں خسروی

ایک قطعہ کہا تھا یہ اور لوگوں کو نہیں سنا سکا۔ مگر آپ سن لیجئے۔

بریلی کے گناؤں کیا میں اوصاف
جہاں ہر عہد میں بستے تھے اشراف
اگر ہے تجھ کو اُن کا شوقِ دیدار؟
تو آ! تجھ کو دکھاؤں سید الطاف

حاشا کہ یہ خوشامد نہیں بلکہ قلبی احساس کا اظہار ہے۔

جناب پروفیسر وقار احمد رضوی
شعبۂ تاریخ - کراچی یونیورسٹی

العلم کا قائدِ اعظم نمبر ملا۔ بہت شکریہ۔ کیا دیدہ زیب، خوشنما، نفیس اور بھاری بھرکم نمبر آپ نے ترتیب دیا ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ خاص طور سے سرورق نہایت خوش رنگ اور جاذبِ نظر ہے۔ میں آپ کو اس قدر ضخیم اور شاندار نمبر نکالنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شروع میں "قائدِ اعظم کی جہدِ مسلسل" کے عنوان سے جسٹس (ر) بدیع الدین احمد صاحب کا مقالہ نہایت معلومات آفرین ہے۔ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں تھیں اور ابنائے وطن خاص طور سے ہندوؤں اور انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ جو ناروا سلوک تھا اس کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ جسٹس صاحب کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ انہوں نے تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے محرکات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور یہ انہیں کا حصہ ہے۔ سید محمد تقی نے اپنے مخصوص انداز میں نظریۂ پاکستان کا منطق اور سائنسی نہج سے تجزیہ کیا ہے۔ اور وہ اپنے اس اسلوب میں بہت کامیاب ہیں۔

سید مصطفیٰ علی بریلوی صاحب کا مضمون "قائدِ اعظم ایک تاریخ ساز ہستی" پسند آیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ قائدِ اعظم نے نہ صرف ایک قوم و ملک کو جنم دیا بلکہ تاریخ کے دھارے کو بدل دیا۔ ممتاز حسن صاحب مرحوم کی تحریر اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں یہ جملہ بہت اہم ہے کہ "جناح ناقابلِ خرید تھے" اور یہ کسی بھی سیاسی اور قومی رہنما کی بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ نازک سے نازک موقع پر بک نہ سکے۔

جلیل قدوائی بڑے کہنہ مشق اور مشاق ادیب ہیں۔ ان کی تحریر جو کچھ دیکھا اس کو بیان کردیا کے مصداق مشاہدہ کا مزہ دیتی ہے اور اس کو پڑھ کر لطف آتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا اس بات کی بڑی اچھی نشاندہی کی ہے کہ ہمیں قائدِ اعظم کی تمام تقریروں کو بے کم و کاست شائع کردینا چاہیے۔ کیونکہ وہ تاریخی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مرزا علی اظہر برلاس نے تو تحریکِ پاکستان کی بعض اہم شقوں کی وضاحت کی ہے۔ جیسے انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء وقف علی الاولاد بل ۱۹۱۳ء ابتدائی تعلیم بل ۱۹۱۰ء اجلاس مسلم لیگ کلکتہ ۱۹۱۰ء یہ اور دوسرے موضوعات ایسے ہیں، جن کی وضاحت ضروری تھی، مثلاً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وقف علی الاولاد بل ۱۹۱۱ء کا تھا۔ مرزا صاحب کے مضمون کو پڑھ کر اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

آخر میں آپ نے مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں بڑا معلومات آفریں مضمون شائع فرمایا ہے۔ اس کو پڑھ کر لائبریری کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اچھا ہوا کہ یہ سب کچھ ریکارڈ ہوگیا۔ اب محققین کو آئندہ اپنے ریسرچ کے کام میں اس سے مدد ملے گی۔

اچھا ہوتا اگر آپ اسرار الحق مجاز کا وہ ترانہ بھی شائع فرماتے جو مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کے بارے میں مجاہدانہ روح کی ترجمانی کرتا ہے اور جس کا ایک مصرعہ مجھے یاد رہ گیا ہے۔

ع: یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

یہ مسلم یونیورسٹی کا یونیورسٹی ترانہ بھی ہے اور ہر کانووکیشن کے موقع پر طلبہ یہ ترانہ پڑھتے تھے۔ اب معلوم نہیں یہ روایت باقی ہے یا نہیں۔

آخر میں، میں ایک بار پھر اس قدر ضخیم علمی اور شاندار نمبر نکالنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جناب حبیب احمد صدیقی
سابق ممبر پبلک سروس کمیشن - یو پی بہار

العلم کا قائدِ اعظم نمبر ملا۔ میں آپ کی اس عنایت کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ شمارہ آپ نے بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ اور قائدِ اعظم کے بارے میں معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ یکجا کردیا ہے۔ جس سے پڑھنے والے قائدِ اعظم کی زندگی کے جملہ حالات سے واقفیت حاصل کرسکتے

ہیں۔ میں آپ کو بہت بہت مبارکباد دیتا ہوں۔

جناب پروفیسر جلیل احمد قدوائی (علیگ)

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیان ہیں!

آپ کا مرسلہ پیکٹ بذریعہ ڈاک ملا۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔ کتنا اچھا اور شاندار اور بھرپور نمبر حضرت قائدِ اعظم پر نکالا ہے۔ تعریف نہیں ہوسکتی۔

میرے مضمون میں بعض نہایت اہم مقامات پر غلطیاں ہوگئی ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں میرا خط خراب ہے مگر کاتب صاحبان کم علمی استعداد کے لوگ ہوں۔ پروف پڑھنے والے تو صاحبان علم و فضل ہونے چاہئیں۔ آپ کی مجبوریاں میں سمجھ سکتا ہوں مگر مجھے بھی اپنا مضمون پڑھنے والوں سے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ میرا منہ کالا ہو گیا۔ مرا ہرگز نہ تھا تیں۔ براہِ کرم کم از کم حسبِ ذیل اغلاط کا تو اگلے نمبر میں اغلاط نامہ شائع کردیں۔

صفحہ ۵۹۔ کالم ۱ مضمون کی سطر ۱۰۔ "علی گڑھ میں میرے مرکزی" کے بجائے "علی گڑھ میں نیز مرکزی" ہونا چاہیے۔

"	" ۲	" ۱۳۔	"پائدار" کے بجائے "تابدار"
۹۷"	۱ "	۱۷۔ "	"۲۳ رجون" کے بجائے "۲ر جون"
" "	۲ "	۱۵ "	"ایسے وقت کو گھر" کے بجائے "ایسے وقت کہ گھر کا"
۹۸"	۱ "	۲ "	"مگر یہ میں نے کہا تھا" کے بجائے "مگر یہ میں نے کیا کہا"
" "	۲ "	۸ "	"تجیف" کے بجائے "نحیف"
" "	" "	۱۷ "	"ہر صدی" کے بجائے "اس صدی"
۱۰۰"	۱ "	۱۱ "	"دنیا کی سب سے بڑی مملکت" کے بجائے "دنیا کی ایک سب سے بڑی مملکت"

باوجودیکہ احتمال ہے کتابت کی غلطیاں ہوجائیں گی مگر نہ صرف میری اجازت بلکہ خواہش اور تمنا ہے کہ اسے آپ کے پرچہ کے اگلے نمبر میں مطبوعہ پڑھوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے شبیر علی کاظمی صاحب کے بار بار تقاضوں کے باوجود قائد پر مضمون میں نے "العلم" میں اشاعت کے لئے بھیجا "قومی زبان میں نہیں شائع کرایا۔ نہ اس پرچہ کے لئے دوسرا مضمون اس موضوع پر لکھ سکا۔ میں کہاں کا ایسا "لکھاڑ" ہوں۔ اس سے اپنے عالمانہ پرچہ کے لئے جھگڑ

تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ!

جناب پروفیسر ابو سلمان شاہجہاں پوری

نیشنل کالج کراچی

"العلم کا قائدِ اعظم نمبر" دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ اس کا سرورق دیدہ زیب اور مضامین فکر انگیز ہیں۔ میں ان شاء اللہ اس پر مفصل تبصرہ کروں گا۔ "علم و آگہی" کا قائداعظم نمبر بھی زیرِ ترتیب ہے۔ ایک مضمون میں اس موقع پر شائع شدہ اخبارات و رسائل کے تمام نمبروں کا تعارف بھی کرانے کا ارادہ ہے۔ یہ خط آپ کی عنایت و شفقت کا جواب نہیں پرچہ کی صرف رسید ہے۔

خدا کرے مزاج سامی بخیر ہوں۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

جناب ایس۔ ایم یامین نقش

گلِ اُمید تو دائم شگفتہ
بچشمِ دشمنانت خار بادا

بعد دعا عرض اس قدر کرنا ہے کہ آج کی ڈاک سے آپ کا سہ ماہی کراچی "العلم" کا پرچہ پہونچ کر جاذبِ نظر ہوا۔ اس عنایت کا شکریہ کس زبان اور کن الفاظ میں ادا کروں۔ میں نے جستہ جستہ مضامین پر سرسری نگاہ ڈالی ہے بعض تو بہت ہی محنت اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ آپ نے بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ خدا مبارک کرے اس میں علیگی بھائی اور بہنوں کے نام کچھ کم ہی ہیں۔ ویسے تو خدا کے فضل سے لکھنے لکھانے والوں میں اور شعرا میں کافی علیگی بھائی موجود ہیں۔ مگر شاید ادھر ملتفت ہونے کا موقعہ نہیں ملتا اپنے دوسرے کاموں سے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو جو کچھ ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجرِ عظیم مرحمت فرمائے آمین۔

آپ تو مسلم یونیورسٹی بننے کے بعد علی گڑھ پہونچے تھے۔ یہ مجھے محبوب عالم صاحب نے بتایا جن سے آج فون پر میری گفتگو ہو رہی تھی۔ اور آپ کی اس نوازش کا ذکر آیا۔ میں تو اسی سال الہ آباد یونیورسٹی سے ایف۔ ایس کر کے گلاسگو انجینیرنگ کے لئے چلا گیا تھا۔ میں ۱۹۰۹ء میں بعمر سات سال کالیجیٹ اسکول میں

دوسری کلاس میں داخل ہوا تھا۔ بارہ برس وہیں پلا بڑھا۔ بنا اور سنورا اور اس کی محبت دائمی دل میں لئے پھرتا ہوں۔ میرے بڑے بھائی پروفیسر ایس ایم شفیع صاحب بعمر ۱۳ سال میرے ہی ساتھ علی گڑھ سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہوئے اور پھر ۱۹۳۲ء میں لندن گئے اور وہاں سے واپس آتے ہی یونیورسٹی میں ریڈر اکنامکس میں لگ گئے ماشاء اللہ ۳۲ سال وہاں پڑھایا اور ۵۸ میں ریٹائر ہوکر پاکستان آئے اور پھر جامعہ ملیہ کراچی میں دس بارہ سال پرنسپل رہے اور اب ایبٹ آباد میں تشریف فرما ہیں۔

۱۹۷۳ء میں بھائی صاحب کا سہارا لے کر علی گڑھ کے طلباء نے کاروان علی گڑھ کی مہم شروع کی مگر کچھ کام بھی نہ ہوا۔ ادھر میں ریٹائر ہوکر ریلوے سے پشاور انجینئرنگ کالج میں تین سال کے لئے اور ویسٹ پاکستان انجینئرنگ یونیورسٹی میں چھ سال کے لئے پروفیسر لگا مگر ۱۹۶۸ء میں دل نے دغا دی تو سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس پہ کچھ عرصہ کے بعد بھائی صاحب مصر ہوئے کہ میں اس کام کو ہاتھ میں لے لوں۔ میری منت سماجت کام نہ آئی۔ اور یہ عظیم کام میرے سپرد کیا گیا۔ کہ اس کو پروان چڑھاؤں۔ دیکھا کہ چارہ غیر از اطاعت نہیں سر تسلیم جھکانا ہی پڑا مگر امید یہ تھی کہ علیگی بھائی ساتھ دیں گے۔ اور پہلا مجلہ جو نکالا اس میں کافی مدد ملی مگر پھر علیگی بھائیوں نے پہلو تہی شروع کی۔ بہرحال ہمت اور استقلال سے کام چل رہا ہے۔ پہلا مجلہ محض ۱۲۵ کاپیاں نکلوائیں، اس خیال سے کہ ان کا کوئی خریدار ہے بھی یا نہیں۔ مگر خلاف توقع یہ سب کی سب ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں اور اس کے بعد احباب نے ادھر رجوع کرنا شروع کیا۔

اب میں دور دوم اور سوم کے احباب کی سوانح حیات بھی تیار کر چکا ہوں اور عنقریب دور دوم اور دور اول میں اضافہ کرکے چھپوا رہا ہوں۔ یہ سب کام ڈونیشن ہی پر ہو رہا ہے۔ جب بھی تنگی محسوس ہوتی ہے کبھی اپنے پاس سے کبھی دیگر احباب سے لڑ جھگڑ کے اس قدر روپیہ وصول کرتا ہوں کہ مجلہ چھپ جائے۔ بہرحال کام چل رہا ہے۔ میرا یہ کام ہے۔ جہاں کسی بھی علیگی بھائی کا علم ہوا اسے ایک پروفارما بھیج دیا۔ اور کچھ یاد دہانیاں کیں اور وہ نہ جاگے تو پھر تین حرف بھیج کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ ان شاء اللہ جیسے ہی دور دوم اور دور اول کے مجلے شائع ہوئے اس کی کاپی پیش کروں گا۔

اور سردست اس قدر عرض کرتا ہے کہ آپ بھی پروفارما کو پڑھ کر اپنے کوائف مرحمت فرمائیں۔ تاکہ دور اول یا دوم جس میں بھی آپ بعمر رکھے جاسکیں۔ اس میں داخل کرکے خوش ہوں۔ اسے آپ ایک ضروری استدعا سمجھیں۔ یاد دہانی کی اذیت نہ دی جائے کہ تن تنہا سارا کام کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس قدر سرمایہ ہے ہی نہیں کہ کوئی ٹائپسٹ یا کلرک یا مددگار تنخواہ دے کر لگا لوں اس کام کے لئے۔ آپ تو خود مؤلف ہیں۔ آپ کو ان مصائب کا اندازہ ہی ہوگا۔ اور پھر جب علیگی بھائی بھی۔ ہر حال میں اپنی سے کئے ہی جاؤں گا۔ جب تک ہاتھ میں طاقت ہے اور دماغ کام کرتا ہے صحت مددگار رہے ؎

ہمت مرداں مدد خدا

اس فہرست مطبوعات میں جو آپ نے آخر میں دی ہے میں نے جن علیگی بھائیوں کے نام دیکھے ہیں ان کو بھی الگ الگ خط آپ کی معرفت لکھے ہیں۔ جب بھی آپ کے پاس پہنچیں ان کا موجودہ پتہ لکھ کر ان کو ان کی طرف روانہ فرما دیں تو اس تکلیف کی معذرت بھی کرتا ہوں اور شکر بھی ادا کرتا ہوں۔

حرفے چند کے تحت آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ العلم کے اگلے شمارے میں کچھ اور قائد اعظم مرحوم و مغفور کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔

میں اپنی ایک نظم جو میں نے قائد اعظم پر لکھی تھی مگر کہیں چھپ نہ سکی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اس کو العلم میں ٹانک دیا جائے۔ تو میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھوں گا۔

پھر زینت افلاک ہے اسلام کا پرچم
پھر نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھے دو عالم
پھر فخر سے اونچا ہوا مسلم کا سر خم
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائد اعظم!

پھر جذبۂ احساس ہوا قلب میں بیدار
پھر کانوں میں آنے لگی تلواروں کی جھنکار
پھر ورد زباں ہے "مدد اے حیدر کرار"
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائد اعظم!

بدلی ہوئی دنیا کی نظر آئی یہ صورت
بھیڑوں کو میسر ہوئی شیروں کی شجاعت
پھر دل میں ہے احساس خودی نفس کی عزت
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائد اعظم!

صف بستہ ہوئے لیلیٰ اسلام کے مجنوں!
ہے برق رواں کی طرح رگ رگ میں رواں خوں
تنگ اس کی نگاہوں میں ہے اب وسعتِ گردوں
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائداعظم

احساس کے جذبات کا اٹھا ہوا احساس
خارِ خسِ اعدا کو بہانے کو ہے بیتاب
طوفان یہ وہ ہے جو نہ ہوگا کبھی پایاب
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائداعظم

کیا غم ہے اگر مائلِ پیکار ہیں اغیار
غدار زمانہ ہیں مٹا دینے کو تیار
کچھ خوف نہیں اپنے بھی ہاتھوں میں ہے تلوار
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائداعظم

اللہ جو حامی تھا نبیؐ بھی ہوئے یاور
نصرت کا ہما سایہ فگن ہوگیا سر پر
دشوار تھی گو ہو گئی لیکن یہ مہم سر
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائداعظم!

اس عہد کے فرعون بھی ہیں دشمن اسلام
اور قتل بھی کرتے ہیں تو ہوتے نہیں بدنام
اب موسیٰ صفت آپ ہیں ہم دافعِ آلام
جن کی یہ کرامت ہے وہ تھے قائداعظم

سعید ملت، حکیم محمد سعید دہلوی

اہل فکر و نظر اور صاحبان قلم ایک ملت اور مملکت کی تعمیر میں جو اساسی حصہ لیتے ہیں، اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ان کے اثرات آج بھی مرتب ہوتے ہیں اور مستقبل بھی۔ بہرحال اور بہرصورت ان کے افکار اور ان کی نگارشات سے متاثر ہوتا ہے۔ صاحبان فکر و قلم افراد ملت کے اذہان کو بلاشبہ جلا بخشتے ہیں اور ملت کے افکار کا رُخ متعین کر کے ان کی تربیت کا سامان کرتے ہیں، اس اعتبار سے مفکرین کا اور اہل قلم کا مقام ایک ملت میں اعلیٰ ہوتا ہے اور ارفع۔ اس مقام کو متعین ہونا چاہیے آج اگر یہ مقام متعین نہیں ہوتا اور ملت اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس فرض سے صرف نظر کرتی ہے تو مستقبل کا مورخ ان محبان وطن اور دل دادگان ملت کے مقام ارفع کو متعین کرے گا اور تاریخ ان کو خراجِ تحسین پیش کرے گی۔

میں نے برصغیر کے ان اہل فکر و نظر اور صاحبان تصنیف کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن کے بارے میں مجھے یقین و اطمینان ہے کہ انہوں نے برصغیر میں انقلاب فکر پیدا کیا ہے اور تعمیر و تقدیر اذہان میں ناقابل فراموش اور موثر و مثبت حصہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فہرست میں آپ کا اسم گرامی بھی ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہے اور مسرت کہ آپ کی نگارشات میرے پاس موجود ہیں۔ بلاشبہ یہ میرے پاس ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ مگر میں اس سے ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی کم سے کم ایک تصنیف و تالیف کا مسودہ بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ برصغیر میں اہل فکر و قلم کی تحریرات کو محفوظ کرنے کا تخیل صرف اس حد تک ہے کہ سیاسی رہنماؤں کے بارے میں اس قسم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک سیاسی رہنما سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ شخصیات ہیں جو افکار کو جنم دیتی ہیں اور علم و عمل کی راہوں کو ہموار کرتی ہیں۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں ایسی تمام تحریرات کو جمع کر کے ان کو محفوظ کر دینے کا انتظام کر دوں۔ بلاشبہ یہ تحریرات آج بھی قیمتی ہیں اور آج سے پچاس اور سو سال بعد ان کی قیمت و قدر کئی گنی زیادہ ہوگی۔ کہ ان کو ایک اثاثہ ملی کی حیثیت حاصل ہوگی، پچاس اور سو سال بعد میں تو اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گا مگر میں فکر و نظر کے لئے آنے والی ملت کے لئے یہ تاریخی سرمایہ محفوظ کر جاؤں گا۔ کہ جو متعدد اعتبارات سے موضوع فکر بن سکتا ہے۔

میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اپنی کسی ایک تصنیف کا مکمل مسودہ اصل حالت میں (یعنی جس حال میں کہ کتابت یا طباعت کے لئے دیا گیا تھا) مجھے عطا فرما دیجئے۔ اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسے مجلد کرا کے محفوظ کر دوں، آپ کے اس تعاون و عطا سے مجھے ایک ملی خدمت کا موقع مل جائے گا اور میں ہدیہ تشکر و امتنان بھی آپ کو پیش کر کے مطمئن ہوں گا۔

میری ایک اور درخواست یہ ہے کہ آپ مجھے اپنے حالات (بابوڈیٹا = حیات نامہ) سے بھی مطلع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ تاکہ میں اس مسودے کے ساتھ اسے بھی محفوظ کر سکوں۔

احترامات فائقہ کے ساتھ

جناب اخلاص حسین زبیری ایم اے

آپ کا عنایت کردہ کتابچہ "نظام مصطفےٰ کیا ہے؟" مصنفہ جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب شروع سے آخر تک بغور پڑھا اور لطف حاصل کیا۔ آپ ہی کی کرم فرمائی سے مصنف موصوف کے کئی دوسرے مضامین پڑھنے اور تقریریں سننے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ میرا شروع سے یہ تاثر ہے کہ موصوف اسلام سے قلبی لگاؤ رکھنے کے علاوہ اپنی قوم کی ذہنی اور اخلاقی حالت بہتر بنانے کا غیر معمولی ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ کانفرنس کے سابق صدر جناب ممتاز حسن صاحب مرحوم بھی اسی روش پر چلنے والے ایک نہایت بلند مرتبہ شخص تھے۔

دراصل ان درخشندہ نقوش کے پیش نظر جو مرحوم نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کئے تھے یہ متوقع نہ تھا کہ ان کے بعد آنے والے صدر ان کی جیسی محنت اور لگن کو بروئے کار لاسکیں گے لیکن مجھ ناچیز کی رائے میں حقیقت یہ ہے کہ جناب قدیر الدین احمد صاحب نے جس محنت شاقہ اور دلی لگن کا اپنے زمانۂ صدارت میں مظاہرہ فرمایا ہے اس کے اثرات و تاثرات سابق صدر کے درخشندہ نقوش سے بھی زیادہ حیرت افزا اور تابناک ہیں۔ مذکورہ بالا کتابچہ کے متعلق چند خیالات بطور تبصرہ درج ذیل ہیں۔

کتابچہ "نظام مصطفےٰ کیا ہے؟" ایک سیاسی پارٹی "قومی اتحاد" کے نعرہ نظام مصطفےٰ کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ مصنف موصوف نے اس نعرہ کے اثرات اور مضمرات پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ مجھ ناچیز کی رائے میں یہ روشنی ملک کے ہر گروہ کے اشخاص کے لئے جو اسے بغور پڑھیں گے بصیرت افروز ثابت ہوگی۔ اس میں سب سے پہلے اس گروہ کو سمجھایا گیا ہے۔ جو نظام مصطفےٰ یا نظام شریعت اسلامی کے نام سے گھبراتے ہیں۔ اور ڈرتے ہیں کہ یہ نظام کوئی ایسی چیز ہے جس سے ان کی موجودہ آسائشوں میں فرق آجائے گا۔ اس خوف کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام کے نقیبوں نے کسی مرحلہ پر اس کی کماحقہٗ توضیح و تشریح نہیں کی۔ زیر نظر کتابچہ میں اس خوف کے وجوہ اور اسے دور کرنے کی تدابیر کو ایسے عالمانہ اور دلنشین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہ اسے مصنف موصوف کا منفرد حصہ ہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ ایسی جامع اور عام فہم تشریح کسی دوسری جانب سے متوقع نہیں ہے۔

ایک جگہ مصنف موصوف فرماتے ہیں۔

"ہم کو ملک کے علمائے دین کا احسان ماننا چاہیئے کہ انہوں نے ایسے زمانے میں جو تنگ و تاریک تھا مسلمانوں کا ایمان من حیث القوم قائم رکھا۔" بعض متشرع اشخاص نیز صوفی مشرب بزرگوں کی زبان سے یہ مقولہ سننے میں آتا ہے کہ "مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب" جبکہ دراصل اسلام کے فروغ کے لئے جد و جہد کرنے کا زمانہ اسی وقت موجود ہے اور بقول مصنف کتابچہ ہذا ہر وقت موجود رہے گا۔ کیونکہ وہ مولانا رومی کے اس مقولے کے قائل معلوم ہوتے ہیں "گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزو است" میرے نزدیک عقیدہ توحید میں اور اسلامی عبادات کے اسالیب اور اصول میں کوئی ایسی خوبی اور ولولہ ہے جو عوام کو بھی اپنی طرف کھینچتا ہے اور اسی باعث چودہ سو سال سے دین اسلام دنیا میں باوجود بے شمار آفتوں اور مخالفتوں کے موجود ہے اور ایک موثر طاقت بنا ہوا ہے۔ اسی چیز کو دیکھ کر علامہ اقبال نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جبکہ اسلام کئی صدیوں تک سیاست اور علم و دانش میں دنیا کا پیشرو رہا ہے تو افراط اور تفریط کے گرداب سے نکلنے کے بعد وہ پھر امامت کے مرتبہ پر فائز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا :-

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ شعر علامہ اقبال کی جس نظم سے لیا گیا ہے اس کا نام طلوع اسلام ہے۔ یہ بارہ صفحات کی نظم ایسے جواہر پاروں سے بھری ہوئی ہے جن پر عمل کر کے موجودہ زمانے کے مسلمان یقیناً اپنے عظیم المرتبت اسلاف کے مرتبہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس لئے نظام مصطفےٰ کے نام سے گھبرانے یا ڈرنے کی کسی مسلمان کو کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ ہرگز کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

داعیان نظام مصطفےٰ کو اسلام کی پوری تاریخ پر مکمل عبور ہونا چاہیئے تاکہ ان میں رواداری اور ملکی معاملات

کی سمجھ بوجھ پورے طور پر پیدا ہو جائے وہ اجتہاد اور تدبر کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کی مدد اور تقویت حاصل ہونے کے باوجود اپنے ذاتی تدبر سے بہت کام لیا تھا۔ خلفائے راشدین اجتہاد کے ساتھ ساتھ صبر و ایثار سے بہت کام لیتے تھے۔ اسی چیز کی اس وقت ضرورت ہے۔ کوئی تبدیلی عجلت میں نہ کی جائے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سابقہ حکومت نے جو اصلاحیں عجلت میں کیں ضرر رساں ثابت ہوئیں۔

ایک جگہ تاریخی واقعات کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے "نظام مصطفیٰ فقط حدود قائم کرنے یعنی چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے یا سود کا لین دین روکنے یا زکوٰۃ جاری کرنے یا جوئے اور عیش و عشرت کے اڈے بند کرنے سے قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اصل چیز وہ روح اور دلی لگاؤ ہے جو ان نتائج کو پیدا کرے۔"

"اسلامی معاشرہ کی روح اہل اسلام کا ایمان اور ان کی خدا پرستی ہے۔" سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ داعیان نظام مصطفیٰ حسن عمل کے اعلیٰ نمونے پیش کریں۔ محض زبانی تعلیم و تلقین کافی نہیں ہوتی۔ دوسری ضرورت انتظامیہ کی بے راہ روی کو روکنا ہے۔ اس گروہ سے رشوت ستانی اور نخوت و تکبر کا رجحان دور ہونا چاہیے۔ بداعمالیوں کی کبھی کبھی سزا دینا کافی نہیں ہے۔ بداعمالی کے راستے بند ہونے چاہئیں۔ محکموں کے اعلیٰ افسران اپنے اپنے محکموں کے عمال کی ذمہ داری کے ساتھ نگرانی کریں۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہر فرقے اور ہر گروہ سے پورا پورا انصاف کیا جائے۔ اور رواداری برتی جائے مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں غیر مسلم رعایا بھی مسلمانوں کی حکومت کو ایک نعمت سمجھتی تھی۔ چوتھی ضرورت صبر و ایثار کی ہے۔" بڑی بڑی ترقیاں پھونک مارنے سے نہیں ہو جاتیں ان کے واسطے صبر و ایثار اور ہمت کی اہل اقتدار اور عوام دونوں کو ضرورت ہے۔" ہمارے عوام دنیا کی قوموں میں بے مثال ہیں اگر ان سے نیک نیتی، خلوص اور سچائی سے بات کی جائے تو وہ یقیناً اسے ماننے کو تیار ہو جائیں گے۔ ہم ان کی آزمائش سو بار کر چکے ہیں۔" آخر میں مصنف موصوف فرماتے ہیں کہ نظام مصطفیٰ اپنے ملک میں لانے کے لئے "صبر، ہمت اور کوشش پیہم چاہیئے۔ آن کی آن میں کایا پلٹ نہیں جائے گی۔ ہر اصلاح کے لئے صبر چاہیئے۔ اگر بے تابی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

"نہ تھی تاب اے دل تو کیوں چاہ کی تھی"

اخبار جنگ نے جو تبصرہ اس کتابچہ پر کیا ہے وہ نہایت موزوں اور مبنی بر حقیقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب (مدظلہ) کو اس عظیم کوشش کا اصل معاوضہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ ہی سے ملے گا!

بقیہ صفحہ ۲۵۶ کا:

۸۱۔ چوتھی دنیا۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ... ۸ روپئے

۸۲۔ شیخ الاساتذہ۔ از اشتیاق حسین اطہر مولانا غلام یحییٰ ہزاروی ۸ روپئے

۸۳۔ نظام مصطفیٰ کیا ہے؟ اور کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے؟ از جسٹس قدیر الدین احمد ۲ روپئے

۸۴۔ تاریخ شاہ عالم۔ تصنیف ڈبلو فرینکلن مترجمہ ثناء الحق صدیقی ایم اے ۲۴ روپئے

رسالہ **العلم** کراچی

پرنٹر ایجوکیشنل پریس کراچی ایڈیٹر پبلشر سید الطاف علی بریلوی
مقام اشاعت۔ دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
10/45-ل-۱ ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی

نقد و نظر

تمناء الحق صدیقی ایم اے (علیگ)

علمی اُردو لغت (جامع)

مؤلف:۔ وارث سرہندی ایم اے
ناشر علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
ضخامت ۱۶۲۰ صفحات، سائز ۲۰×۳۰ ، قیمت مجلد مع پلاسٹک ۔/۱۵۰ روپے

کوئی زبان اُس وقت تک نہ اپنا اعتبار قائم کر سکتی ہے اور نہ علمی مقام حاصل کر سکتی ہے جب تک کہ اس کا کوئی جامع اور مستند لغت اور گرامر نہ ہو۔ اُردو زبان کے لئے اس نکتہ کو اب سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے اُس وقت سمجھ لیا گیا تھا جب اس زبان کو برصغیر کی لنگوا فرینکا سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو جو اس ملک میں تازہ وارد ہوئے تھے سکھانے کا فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں انتظام کیا گیا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے جہاں اردو نثر کی کتابیں تیار کرانے کا پروگرام بنایا تھا وہیں اس زبان کا ایک لغت بھی مرتب کیا۔ ان کے اس اقدام سے اور لوگوں کو بھی تحریک ہوئی۔ چنانچہ انیسویں صدی میں بعض حضرات نے لغت کی چند اور کتابیں مرتب کیں لیکن اس کام میں زیادہ تیزی بیسویں صدی میں آئی اور چھوٹی بڑی بے شمار کتبِ لغت تیار ہو گئیں۔ ان میں نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ کو نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ ان کے بعد جامع اللغات کا نمبر آتا ہے۔ یہ بھی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک بڑی ڈکشنری ہے۔ اور اس کی بعض انفرادی خصوصیات ہیں۔ جو اسے نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ سے کسی قدر ممتاز کر دیتی ہیں۔

بہر حال اس سلسلہ میں جتنا کام ہوا ہے وہ سب کسی نہ کسی اعتبار سے لائقِ ستائش ہے تاہم یہ بات کسی حالت میں نہ بھولنی چاہیئے کہ یہ سب نمونے انسان کی سعی کوشش کے نتائج ہیں۔ اور اس لئے خامیوں اور نقائص سے یکسر پاک نہیں ہو سکتے۔

پچھلے کاموں میں جو نقائص رہ گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے اور زبان میں توسیع و ترقی اور نئے نئے الفاظ و مصطلحات کی شمولیت کی وجہ سے بعض اہلِ علم اب اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں کہ پرانے کاموں پر اکتفا کر کے بیٹھنا مناسب نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کے لغات تیار کئے جائیں۔ چنانچہ حال ہی میں "علمی اُردو لغت" نام کی لغت کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو ایک جلد میں ہونے کے باوجود نہایت جامع ہے۔ اس کے مؤلف جناب وارث سرہندی ہیں جو پاکستان کے تمدنی مراکز سے دور ضلع سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے قصبہ کنجروڑ میں مقیم رہ کر اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ

اردو زبان و ادب کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے ہیں اور زبان اُردو کی توسیع و ترقی میں دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مروجہ اردو لغات کی بعض کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے جدید طرز پر لغت کی ایک کتاب مرتب کرنا ضروری سمجھا اور اس ضرورت کے پیشِ نظر زیرِ تبصرہ کتاب تالیف کی۔ خود مؤلف موصوف کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ کہتے ہیں ــــــ

"کوئی بھی لغت کی کتاب ایسی جامعیت
کی حامل نہیں کہ اردو کے ایک عام قاری
اور اردو ادب کے طالب علم کی جملہ علمی
ضروریات پوری کر سکے اور وہ اس کی
موجودگی میں دوسری کتب لغت سے
بے نیاز ہو سکے۔"

اس لغت کی خوبیوں اور خصوصیات پر تفصیلی بحث کرنا مشکل کام ہے۔ خود مؤلف نے اس کی ۲۹/۳۰ خصوصیات گنوائی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا مختصر الفاظ میں ان کو حسب ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

نصاب کی کتابوں میں شامل الفاظ، مصطلحات، محاورات، مشہور اُردو شعراء کے کلام میں استعمال ہونے والے اکثر الفاظ، فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں شائع ہونے والی کتابوں اور اخبارات، مشہور اُردو شعراء کے کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ اور مصطلحات دکنی اُردو کے الفاظ، بیان و بدیع کی اصطلاحات۔ اسلامی اصطلاحات۔ جدید الفاظ و مصطلحات۔ انگریزی کے وہ تمام الفاظ جو اُردو میں عام ہیں (۱) لغت میں شامل کئے گئے ہیں۔

(۲) انگریزی اصطلاحات کے اُردو ترجمے جن پر ابھی تک سب کا اتفاق نہیں ہوا ہے ان میں سے زیادہ معقول ترجمے دے کر اُن کے آگے انگریزی زبان کے اصلی الفاظ دیدیئے گئے ہیں۔

(۳) اُردو کی بعض ایسی ترکیبیں جو قاعدہ کے لحاظ سے غلط ہیں مگر عام طور پر استعمال ہوتی ہیں اُن کو اس کتاب میں شامل کر کے ان کی غلطی بتادی گئی ہے۔

(۴) اعلام بہت کم دیئے گئے ہیں۔ البتہ جو اعلام اُردو ادب میں عام طور پر مذکور ہوتے ہیں ان کو شامل کر لیا گیا ہے۔

(۵) الفاظ پر اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔ تاکہ تلفظ میں غلطی نہ ہو۔

(۶) الفاظ کی صرفی حیثیت واضح کر دی گئی ہے۔ یعنی یہ بتا دیا گیا ہے کہ کونسا لفظ اسم ہے، کونسا فعل اور کونسا صفت۔

(۷) ہر لفظ کے آگے یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ لفظ اصلاً کس زبان کا ہے۔

(۸) الفاظ کی تذکیر و تانیث واضح کر دی گئی ہے۔

(۹) ایک لفظ سے بننے والے تمام محاورات ایک جگہ دیدیئے گئے ہیں۔

غرض اس لغت کو ہر طرح مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اگرچہ بعض الفاظ جن کے معنی اور مطلب کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں نہ پاکر کسی قدر

مایوسی ہوتی ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر اس کتاب کا درجہ بہت اونچا ہے۔

شروع میں مختصرات و مخففات۔ اشارات اور توضیحات دے کر بڑی سہولت پیدا کر دی گئی ہے۔

کتابت، طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ سفید اور گیٹ آپ نہایت شاندار ہے۔ لیکن آجکل کے زمانہ میں جبکہ تمام چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت بھی اتنی زیادہ ہے کہ اوسط درجہ کا آدمی بھی اس کو خریدنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

بنگال میں اُردو

از جناب وفا راشدی
ناشر مکتبہ اشاعتِ اُردو حیدر آباد سندھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۹۶ صفحات
قیمت ۵ روپیے۔

برصغیر کی تمام زبانوں میں صرف اُردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی ترقی و ارتقا میں اس سرزمین کے مختلف علاقوں نے یکساں حصہ لیا ہے۔ اسی لئے ہر علاقہ کی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے اس علاقہ کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق ایک جداگانہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ پنجاب میں اردو۔ دکن میں اُردو۔ مدراس میں اردو۔ گجرات میں اردو۔ سندھ میں اُردو۔ بہار میں اُردو۔ بنگال میں اُردو نام کی کتابیں ان علاقوں میں اُردو زبان کی نشو و نما کی دلچسپ کہانیاں سناتی ہیں۔

بنگال میں اُردو ۱۹۵۴ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جب مصنف کی عمر محض ۲۶، ۲۷ سال تھی۔ اتنی تھوڑی عمر میں ایک ایسے سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھانا جس میں مصنف کو اپنے لئے زمین بھی خود ہی ہموار کرنا پڑے۔ نہایت قابلِ قدر بات ہے۔ واقعات کو اِدھر اُدھر سے جمع کرنے اور ان کو ترتیب دینے میں وفا راشدی صاحب نے جس سلیقہ مندی کا اظہار کیا ہے اس کے لئے وہ بجا طور پر تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ایسے کام بغیر تائیدِ ایزدی کے انجام پانا ممکن نہیں۔ بقول شاعر؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کتاب زیرِ تبصرہ میں بنگال میں اُردو کی ڈھائی سو سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس طویل مدت کو مصنف نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان ادوار کی تفصیل یہ ہے۔ (پہلا دور) فورٹ ولیم کالج اور اس کے عہد کے دیگر مصنفین (دوسرا دور) بنگال میں اُردو شاعری کا عروج (تیسرا دور) شمس الشیخ اور خالد کا زمانہ (چوتھا دور) آزاد، وحشت۔ ناطق اور آرزو کا زمانہ۔ اُس کے بعد سات ابواب اور ہیں۔ ان ابواب میں بعض ایسے موضوعات دیئے گئے ہیں جو ان چار ادوار میں شامل نہیں کئے جا سکے۔

کتاب کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہے۔ تاہم بعض سنین غلط ہیں مثلاً بنگال کے ہندو شعرا کے عنوان کے تحت راجہ رام موہن رائے کی اُردو خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ موسیو گارساں دتاسی سے ملے اور ۱۸۵۳ء میں کلکتہ آئے اور ۱۹۵۳ء میں ایک اُردو اور

انگریزی اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ حالانکہ راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۳ء میں برسٹل میں فوت ہو گئے تھے۔ اُمید ہے کہ آئندہ کتاب پر نظر ثانی کرکے مصنف موصوف اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے۔

مجموعی حیثیت سے کتاب اچھی ہے۔ اس میں بنگال کی خدمات کا بھرپور جائزہ لے کر ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا گیا ہے۔

سیر العارفین

تصنیف۔ حامد بن فضل اللہ جمالی
ترجمہ و ترتیب۔ محمد ایوب قادری
ناشر: مرکزی اردو بورڈ۔ گلبرگ۔ لاہور۔ سائز ۲۳×۳۶/۱۶
ضخامت ۴۵۱ صفحات۔ قیمت ۱۵ روپے

اولیائے ہند کا یہ پہلا مستقل تذکرہ ہے اور خاندان مغلیہ کے دوسرے بادشاہ نصیر الدین ہمایوں کے عہد حکومت کے ابتدائی سالوں میں لکھا گیا تھا۔ اس تذکرہ کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی تھے۔ جو مشائخ اور صوفیہ کے معتقد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور شاعر ادیب، سیاح اور صوفی مشرب الشان تھے۔ شاعری میں ان کا مقام اس قدر بلند تھا کہ مولانا جامی نے ایک دیوان مرتب کرنے کے علاوہ مراۃ المعانی اور مہر و ماہ جیسی بلند پایہ مثنویاں بھی لکھیں۔

سیر العارفین کے لکھے جانے کی وجہ جمالی نے خود بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جب یہ احقر الانام زمانۂ دراز کے بعد اللہ کے کرم سے بیت اللہ، روضۂ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کی زیارت اور زمین مغرب (افریقہ) یمن، بیت المقدس، روم، شام، عراق عرب، عراق عجم، آذربائیجان، گیلان، مازندران اور خراسان کے سفر سے واپس ہوا اور ہندوستان کے دار الخلافہ یعنی شہر پُر نور و سرور حضرت دہلی پہنچا۔ تو اکثر اہل صدق وصفا نے مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنی مسافرت کے دلچسپ حالات تحریر میں لاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ گفت گو جس کا ذکر اذکار ہوتا ہے۔ ضبط تحریر میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے لکھنے کے لئے بڑا وقت چاہئیے لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ اُن عارفانِ اہلِ کمال کے حالات قلمبند کروں کیونکہ ان اہلِ کمال کے احوال، واقعات اور طریقوں کے متعلق بعض جاہل مجاور اور نا اہل معتقد ناواقف عوام الناس سے مختلف خلاف واقعہ باتیں بیان کرتے ہیں۔ اور ان سننے والوں کو جو ان کی گفتگو پر اعتقاد کر لیتے ہیں۔ باز رکھوں اور جو کچھ مجھے سنجیدہ اور متین اہلِ اخبار اور دین و دانش کی پاک کتاب سے یقینی طور پر معلوم و مفہوم ہے اس کو تحریر میں لاؤں۔"

جمالی نے اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اور اس زمانہ کی مروجہ زبان فارسی میں یہ تذکرہ لکھا ہے میں انھوں نے تیرہ مشائخ کا حال تفصیل سے اور بہت سے بزرگوں کا حال مجملاً تحریر کیا ہے۔ ان تیرہ میں سے چھ مشائخ چشتیہ سلسلہ کے اور سات سہروردی سلسلہ کے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شیخ علاء الدین صابر کلیری جن کو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا بھانجا اور مخصوص خلیفہ بتایا جاتا ہے۔ اور چشتیہ سلسلہ کی دو اہم شاخوں میں سے ایک کا سرخیل قرار دیا جاتا ہے۔ اس تذکرہ کے صفحات پر کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ حالانکہ ان کے سلسلہ کے کئی بزرگ مثلاً احمد عبد الحق ردولوی

اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس وقت تک ان کے نام کو کافی شہرت دے چکے تھے۔ بلکہ مؤخر الذکر نے تو ان کی قبر بھی دریافت کر لی تھی۔ جمالی کی اس سلسلہ میں اتنی خاموشی نہایت معنی خیز ہے۔ ممکن ہے ان کو ان بزرگ کے حالات دستیاب نہ ہو سکے ہوں۔

بہرحال اس تذکرہ میں اولیاء اللہ کے حالات عام روش سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ کشف و کرامات سے زیادہ ان بزرگوں کے خصائل و شمائل، عبادت و ریاضت، زہد و ورع اور تقدس و تقوی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو انسانیت کے پیکر بنا کر پیش کیا گیا۔ کہیں کہیں کرامتوں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ لیکن ضمناً ان کو مقصود بالذات نہیں سمجھا گیا۔ غرض حالات بیان کرنے میں مصنف علام نے نہایت توازن سے کام لیا ہے۔ اور عوام کے لئے اس کو مفید بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔

چونکہ اصل کتاب فارسی زبان میں تھی اور اب برصغیر میں اس زبان کا رواج کم ہو گیا ہے۔ اسلئے مرکزی اردو بورڈ کے ارباب حل و عقد نے عام لوگوں کے فائدہ کے خیال سے اس کو اردو زبان میں منتقل کرانے کی طرف توجہ کی اور ملک کے مایۂ ناز مورخ اور مصنف جناب محمد ایوب قادری کو یہ کام سپرد کیا جس کو موصوف نے نہایت سلیقہ سے انجام دیا۔ ترجمہ نہایت سلیس، بامحاورہ اور رواں ہے۔ لائق مترجم نے بیش قیمت حواشی دے کر کتاب کی افادیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ شروع میں نہایت معلومات افزا ابتدائیہ اور آخر میں عہد سلطنت کے فرمانرواؤں کی مکمل فہرست مع سنین، کتابیات اور اشاریہ دے کر کتاب کو ہر طرح مکمل کر دیا ہے۔

اس ترجمہ کی ایک اہم چیز اس کا گراں قدر مقدمہ ہے جو محترم پیر حسام الدین راشدی نے تحریر فرما کر مصنف کتاب حامد بن فضل اللہ جمالی کی سیرت و سوانح کا تفصیلی خاکہ پیش کر دیا ہے اور بقول مترجم کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ مقدمہ کتاب کے ۱۱۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور غالباً اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کے طویل ترین مقدمات میں سے ایک ہے۔

کتاب زیر تبصرہ کی اشاعت کو مترجم، مقدمہ نگار اور ناشر سب ہی نے کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس لئے یہ سب ہی مبارکباد اور تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔

برگ گل
قائداعظم نمبر

سرپرست۔ جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ (پرنسپل) نگراں۔ پروفیسر محمد ایوب قادری، مدیر اعلیٰ۔ پروفیسر امتیاز حسین مفتی۔ مدیر۔ محمد رضی راہی۔ ناشر وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی۔ ضخامت ۴۵۲ صفحہ سائز

برگ گل کا یہ ضخیم شمارہ اپنی سابقہ روایت کو قائم رکھتے ہوئے نہایت آب و تاب سے منظر عام پر آیا ہے۔ رسالہ "نقوش" (لاہور) کی طرح اس میگزین کے بھی صرف خاص نمبر دیکھنے میں آتے ہیں۔ غالباً عام نمبر ابھی تک کوئی نہیں نکلا۔ بہرحال اس کی کو یہ خصوصی شمارے نہ صرف پورا کر دیتے ہیں۔ بلکہ عام نمبروں کے تصور کو بھی قارئین کے ذہن کی سطح پر ابھرنے نہیں دیتے۔ ابھی تک اس میگزین کے جتنے بھی شمارے برآمد ہوئے ان میں سے ہر ایک خوب سے خوب تر ثابت ہوا۔ یہ شمارہ بھی جو قائداعظم کے صد سالہ جشن ولادت پر شائع ہوا ہے۔ ملک کے دوسرے رسالوں کے قائداعظم نمبر سے کسی طرح بھی

دوسرے درجہ پر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ دعویٰ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ شمار صفِ اول میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس موقع پر جب کہ ملک کے تمام قابلِ ذکر رسالے قائداعظم کے صد سالہ جشن ولادت پر خصوصی شمارے نکالنے کی فکر میں تھے کسی ایک رسالے یا میگزین کے لئے اتنا مختلف النوع اور قیمتی مواد فراہم کر لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن جہاں پروفیسر ایوب قادری جیسے دھنی موجود ہوں وہاں ناممکن چیز بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ملک کے مشہور اہلِ قلم حضرات سے مضامین حاصل کر لئے اور یہ نمبر شایانِ شان طریقہ سے نکال ڈالا۔

جملہ مضامین چند عنوانات کے تحت مرتب کئے گئے ہیں۔ پیش لفظ سخن ہائے گفتنی، اداریہ اور حرفِ چند کے بعد ان عنوانات کی ترتیب یہ ہے۔

۱۔ پس منظر۔ اس عنوان کے تحت ۳ مضامین ہیں۔
۲۔ حیات اور کارنامے۔ اس میں ۹ مضمون شامل ہیں۔
۳۔ جدوجہد پاکستان۔ مضمونوں کی تعداد ۱۳ ہے۔
۴۔ حضورِ قائد میں باریابی۔ کل ۸ مضامین ہیں۔
۵۔ شہروں البستی لستی۔ مضامین کی کل تعداد ۴ ہے۔
[عنوان اچھوتا اور نہایت ترقی پسندانہ ہے]
۶۔ شخصیت کا سحر ــــ ۸ مضامین ہیں
۷۔ رہے نام اللہ کا ــــ ۴ مضمون ہیں
۸۔ منظومات ــــ نظموں کی تعداد ۸ ہے

مجموعی طور سے یہ نمبر بہت خوب ہے اور بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ مواد نہایت قیمتی گیٹ اپ دیدہ زیب کاغذ سفید اور کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ فوٹو بھی کافی تعداد میں شامل کئے گئے ہیں اور اس طرح قائد کی تربت پر چڑھانے کے لئے نہایت حسین اور تر و تازہ پھول فراہم ہو گئے ہیں۔

تذکرِ سجاد

مرتب: پروفیسر عبدالقوی دسنوی
ناشر: سیفیہ کالج بھوپال سائز $\frac{۲۳ \times ۳۶}{۱۶}$
ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

سجاد بھائی ان پاک و مقدس نفوس میں سے تھے جن پر آیۃ من آیات اللہ کا بجا طور پر اطلاق ہوتا ہے انہوں نے وہ کام کیا جس کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے وسط ہند کے ایک چھوٹے سے شہر سرونج میں آنکھ کھولی۔ وہیں معمولی سی تعلیم حاصل کی۔ پھر نہایت کم سنی میں بھوپال آ گئے اور وہاں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔ نیت سالم تھی۔ اللہ نے برکت دی اور کاروبار خوب چمکا۔ بہت کچھ کمایا۔ لیکن انہوں نے اپنی سادہ وضع کو عمر بھر ترک نہیں کیا۔ عاجزی اور فروتنی اُن کے کردار کی اہم خوبیاں تھیں۔ اس کے ساتھ قومی خدمت کا جذبہ اُن میں حد سے فزوں تھا۔ اس جذبہ کا اظہار دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اللہ کی قدرت بہت بڑی ہے سجاد بھائی کے دل میں قدرتی طور پر یہ بات جم گئی کہ قوم کی سب سے اہم خدمت نونہالانِ قوم کو زیورِ علم سے آراستہ کرنا ہے۔ اگرچہ وہ خود بڑی حد تک اس دولت سے محروم رہے تھے۔ لیکن انہوں نے آئندہ نسلوں میں یہ دولت تقسیم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اپنے ارادہ میں پختگی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ایک ابتدائی مدرسے

اپنے کام کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ اس مدرسہ نے سیفیہ کالج کی شکل اختیار کرلی۔ اور اب یہ وسطِ ہند کے ان اہم کالجوں میں سے ایک ہے جہاں پوسٹ گریجویٹ کے مرحلہ تک نہایت اعلیٰ معیار کی تعلیم ہوتی ہے اور ہر مذہب ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے نوجوان اس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سائنس، کامرس اور آرٹس کے تمام مضامین وہاں پڑھائے جاتے ہیں۔ کالج کی عمارت بھی کافی شاندار ہے۔ ۱۹۷۳ء میں سجاد بھائی بیاسی سال کی عمر پاکر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مگر اُن کی یادگار یہ کالج قائم ہے اور بے شمار تشنگانِ علم کو سیراب کر رہا ہے۔ کالج کے ساتھ سجاد بھائی کو بھی حیاتِ ابدی نصیب ہو گئی ہے اور وہ حافظ کے اس شعر کا مصداق بنے ہوتے ہیں۔ ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ایک زندۂ جاوید ہستی کی بے لوث خدمات کو سراہنا احسان شناسی ہے اور زیرِ تبصرہ کتاب اسی احسان شناسی کا تحریری ثبوت ہے۔ اس کتاب میں کچھ مضامین ہیں اور کچھ منظومات لیکن سچ پوچھئے تو یہ عقیدت کے وہ پھول ہیں جن سے سیفیہ کالج سے منسلک اساتذہ اور طلبہ نے ایک گلدستہ تیار کر کے اپنے اس محسن کے روضہ پر چڑھائے ہیں۔ ان پھولوں کو جمع کرنے اور ان سے یہ گلدستہ تیار کرنے کا اصل کام محترم عبدالقوی صاحب دسنوی نے کیا ہے۔ لہٰذا وہ بجا طور پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

مضامین و منظومات کا یہ مجموعہ جس کو نذرِ سجاد کا نام نہایت موزوں و مناسب دیا گیا ہے ۔۔۔ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تمام مضامین کو چند خاص عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ جن کی تقسیم یہ ہے۔ نذرانۂ عقیدت میں ۳۰، ترتیب میں ۱۳، تعمیر میں ۷، ماحول میں ۹ اور مطالعہ میں ۲ مضامین شامل ہیں۔ محسنِ اعظم کے عنوان سے تعارف جناب عبدالقوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ تقریباً تمام مضامین اخلاص و عقیدت کے آئینہ دار ہیں۔ بعض مضامین نہایت وقیع ہیں۔ غرض نذرِ سجاد ایک اچھا نذرانہ ہے۔

المعارف قائدِ اعظم نمبر	مجلسِ ادارت (صدر) پروفیسر محمد سعید شیخ (مدیر حصہ اردو) محمد اسحاق بھٹی (مدیر حصہ انگریزی)

محمد اشرف ڈار ناشر۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔

قیمت ۲۵ روپے۔

۱۹۷۶ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ولادت کو ایک صدی مکمل ہو گئی۔ اس صد سالہ جشن ولادت کو شایانِ شان طریقہ پر منانے کے لئے حکومت نے ۱۹۷۶ء کو قائدِ اعظم کا سال قرار دیا۔ ملک کے مختلف رسالوں اور میگزینوں کے خصوصی شمارے شائع ہوئے۔ اسی سلسلہ میں المعارف کا بھی قائدِ اعظم نمبر نکلا۔ ضخامت زیادہ نہ ہونے کے باوجود اس نمبر کے مضامین نہایت وقیع اور معلومات افزا ہیں۔ چونکہ قیامِ پاکستان کا قائدِ اعظم کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس تحریک سے متعلق بھی مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ بہت سی باتیں جن کا تحریکِ پاکستان سے تعلق ہے بڑے بوڑھوں کے علم میں تو ہیں لیکن نئی نسل ان سے قطعاً

ناواقف ہے۔ ضروری ہے کہ اس تحریک کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے اُن چیزوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ زیرِ نظر شمارے میں اسی بات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور کئی مضمون اسی نوعیت کے شامل کئے گئے ہیں۔ مثلاً میثاقِ لکھنؤ۔ قائدِ اعظم کے پیش کردہ چودہ نکات۔ قائدِ اعظم اور اسلامی صحافت۔ آخر الذکر مضمون میں اسلامی

صحافت کا ماضی۔ ۱۹۵۲ء میں اسلامی صحافت کی کیفیت اسلامی صحافت کی ضرورت و اہمیت۔ ڈان۔ منشور۔ نوائے وقت۔ عصرِ جدید (بنگالی) مسلم ٹائمز اور پاکستان ٹائمز (انگریزی) کے اجراء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پاکستانی قومیت کی تشکیل میں اُردو کا کردار جائزہ، مسائل اور تجاویز بھی ایک اچھا مضمون ہے۔ قائدِ اعظم کا ایک انٹرویو مختصر ہونے کے باوصف خاصہ کی چیز ہے۔ مگر اس میں جو سوالات اور ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے سوال ۵ اور اس کے جواب کا ربط کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ممکن ہے اس میں کوئی ایسا باریک نکتہ ہو جہاں تک ناچیز تبصرہ نگار کی نظر نہ پہنچ سکی ہو۔

اس شمارے کی ایک خصوصیت اور بھی ہے وہ یہ کہ اس کے ایک سو بارہ صفحات انگریزی مضامین کے لئے وقف ہیں۔ یہ سب مضامین بھی قائدِ اعظم سے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون تو وہ تقریر ہے جو ۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو قائدِ اعظم نے عید کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی تھی۔ باقی پانچ مضامین ملک کے دیگر سربرآوردہ لوگوں کے ہیں۔

بہرحال پورا شمارہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور ہر اس شخص کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جو قائدِ اعظم کی حیات، اُن کے کارناموں اور تحریکِ پاکستان کے متعلق صحیح باتیں جاننے کا خواہشمند ہو۔

کرشمۂ قدرت

مؤلف:۔ ہمایوں مرزا لکھنوی
طابع و ناشر:۔ مرزا اخلاق حسن لکھنوی۔ گلزارِ فاطمہ ۶/۱-۵ ۔۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۱۸
سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۲۰۰ صفحات

کتاب کا موضوع سرورق کی اس عبارت سے ظاہر کیا گیا ہے۔

"افعال و خواصِ سنگ و جواہر مثلاً فیروزہ، عقیق، دُرِ نجف، نیلم اور ہیرا وغیرہ کے اثرات پر مفید و دلچسپ کتاب۔"

لیکن کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ صرف سنگ و جواہر کے افعال و خواص اور اثرات سے بڑے دلچسپ انداز میں بحث کی گئی ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو واقعی قدرت کا کرشمہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً دنیا کے ان تمام پتھروں کی بھی نشان دہی کر دی گئی جو کسی نہ کسی اعتبار سے کسی اہمیت، انفرادیت یا ندرت کے حامل ہیں۔ جیسے حجرِ اسود، مقامِ ابراہیم اور کوہِ نور یا خانہ کعبہ۔ تاج محل۔ اہرامِ مصر اور ابوالہول کے مجسمے پتھر سے بنائے یا پتھر سے تراشے گئے ہیں۔ یا زمانہ قدیم میں انسان پتھر کے اوزار ہتھیار بناتا تھا۔ اور چقماق پتھر سے آگ پیدا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں

علاج شمسی کے بارے میں تفصیلی طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانی تیار کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سفید بوتل نیلی بوتل، زرد بوتل، سرخ بوتل اور سبز بوتل کے پانی کے الگ الگ خواص بیان کرکے چاند کی روشنی کے فوائد بھی گنا دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد میٹھے پانی بارش کے پانی، دریاؤں کے پانی، چشمے اور گہرے کنوئیں کے پانی کی خاصیت اور افادیت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پھر نام کے لحاظ سے نگینہ کے انتخاب اور بواسیر کے لئے چھلے کے استعمال کا مشورہ دیا گیا ہے۔ آخر میں فاتحہ، نذر و نیاز، تعویذ گنڈوں اور عملیات کے فوائد بتا کر انسانی زندگی کے لئے مفید اور مجرب باتوں کی ایک خاصی طویل فہرست دی گئی ہے جن میں سے اکثر اثنا عشری فرقہ کے ائمہ سے منسوب ہیں۔ اس طرح جن مسائل حیات سے عام انسان سرسری طور پر گزر جاتا ہے اُن کے معارف و حقائق بیان کرکے ہر فرد کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

بعض باتوں کو چھوڑ کر جو ایک مخصوص فرقہ کے عقائد سے متعلق ہیں، کتاب ہر فرد کے لئے مجموعی طور پر مفید اور مؤلف کے گہرے مطالعہ اور دقت نظر کی آئینہ دار ہے۔ البتہ جن اُمور سے ایک عام قاری کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ پتھروں کے ان خواص سے متعلق ہیں جو انسان کی قسمت اور اس کے مزاج و طبیعت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً فیروزہ کے اجزائے ترکیبی اور بعض امراض میں اس کا مفید ہونا تو قبول لیکن یہ باتیں عقیدہ کے سہارے کے بغیر ذہن میں نہیں سماتیں۔

(۱) اس پتھر کے پہننے سے دل میں رحم اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

(۲) فیروزہ کو ہمراہ رکھنا قتل اور غرقابی دریا اور بجلی کے صدمہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۳) یہ پتھر چشم زخم (نظر بد) سے حفاظت کرتا ہے۔

(۴) اس نکتہ کو صبح اور شام دیکھنے والا خوشی میں زندگی بسر کرتا ہے۔

(۵) جس کے ہاتھ میں فیروزہ کی انگوٹھی ہوگی اس کی حاجت پوری ہوگی اور دعا مستجاب ہوگی۔

(۶) ربیع الاول کے ماہ میں چاند دیکھ کر فیروزہ پر نظر کرنے سے مہینہ خیر و خوبی سے گذرتا ہے۔

(۷) حضرت امام علی نقی کا خادم صافی فیروزہ کی انگوٹھی پہن کر حضرت امام رضاؑ کی زیارت کو چلا۔ راستہ میں ایک شیر مل گیا۔ خادم نے اس سے کہا کہ میرے مولا نے ارشاد فرمایا ہے کہ تو راستہ سے دور ہوجا۔ وہ چلا گیا۔

(۸) امام موسیٰ کاظمؑ نے ارشاد فرمایا کہ یہ نگینہ جبرئیلؑ ختمی مرتبت کے لئے بہشت بریں سے لائے تھے اور یہی فیروزہ آنحضرتؐ نے حضرت امیر المومنینؑ کو عطا فرمایا تھا۔

اسی طرح صفحہ ۲۴۸ پر درج تسبیح عیسیٰ بھی ایک مخصوص فرقہ کو ہی متاثر کر سکتی ہے۔

کتاب میں بعض تاریخی تسامحات بھی ہیں مثلاً صفحہ ۱۶۶ پر اہرام مصر اور ابوالہول کے متعلق لکھا ہے کہ یہ تقریب ۸۰۰ ق۔م میں تعمیر کئے گئے تھے۔

حالانکہ کتب تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اہرام مصر تمام کے تمام ۲۵۰۰ ق۔م سے پہلے بنے اور اس کے بعد ان کی تعمیر کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کتاب زیر تبصرہ میں جن اہرام اور ابوالہول کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا زمانۂ تعمیر ڈھائی اور تین ہزار ق۔م کے درمیان کا ہے۔

گلِ صد برگ
(غزلیات کا مجموعہ)

مصنف: حبیب احمد صدیقی۔
ناشر: حبیب احمد صدیقی مکان ۲۶ الف شالیمار ۶/۳ اسٹریٹ ۱۲۔ اسلام آباد۔

سائز ۳۶×۲۳/۱۶ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۲ روپے

ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب کا جو خیر سے شاعر بھی تھے یہ شعر کافی شہرت پا چکا ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

معلوم نہیں اس شعر کے کہنے کے بعد ان ڈپٹی کلکٹر صاحب کا کیا انجام ہوا۔ اپنے عہدہ میں کچھ اور ترقی کی یا نہیں۔ بہرحال یہ تو ماضی کی بات ہے۔ ہمارے سامنے جناب حبیب احمد صدیقی کی ایک زندہ مثال موجود ہے۔ موصوف شعر کہتے کہتے نہ صرف ڈپٹی کلکٹر ہوئے بلکہ ان حدود سے کہیں آگے بڑھ کر پبلک سروس کمیشن کی ممبری تک جا پہنچے۔ اور وہاں سے ریٹائر ہو کر اب بھی شعر کہہ رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب گلِ صد برگ دراصل اسی سرمایۂ شعری کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے ملازمت کے دوران بھارت میں تخلیق کیا تھا اور جو ریٹائر ہونے کے بعد پاکستان میں آکر جمع کیا ہے۔

کلام کی ترتیب پرانے روایتی انداز سے ہٹ کر ہے۔ شروع میں حمد اور نعت دے کر روایت کو قائم رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد غزلیات کو ردیف وار دینے کے بجائے تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے لیکن یہ ترتیب معکوس ہے۔ یعنی جو غزل سب سے بعد میں کہی گئی وہ سب سے پہلے دی گئی ہے۔ اور جو سب سے پہلی ہے وہ سب سے آخر میں۔ اس طرح پاکستان میں کہی گئی غزلیں شروع میں ہیں اور ہندوستان کا کلام بعد میں۔

تاریخ کے علاوہ ہر غزل کے ساتھ اس مقام کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ جہاں وہ غزل کہی گئی تھی ہندوستان کا سرمایہ لکھنؤ، الہ آباد، نینی تال، اناؤ، بلیا، جموں اور سری نگر کی یاد دلاتا ہے۔ اور پاکستان کا کلام کراچی، سکھر، ڈہرکی (ضلع سکھر) اور اسلام آباد میں منصۂ شہود پر آیا۔ اگرچہ باعتبار کمیت ہندوستان کا سرمایہ کہیں زیادہ ہے۔ لیکن کیفیت کے لحاظ سے ہندوستانی اور پاکستانی کلام میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ پورا کلام ہی خوب اور بہت خوب ہے۔

حبیب احمد صاحب کی غزلوں کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ ہر غزل میں مطلع موجود اور مقطع غائب ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انہوں نے حکمت لکھنوی کی تقلید کی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود انہیں کوئی نیا تخلص دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے انہوں نے تخلص اور مقطع کے بغیر ہی کلام چلایا ہو۔

حبیب صاحب کی شاعری کا اہم وصف

حقیقت نگاری اور سلجھا ہوا اندازِ بیان ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کو صرف حسن و عشق کے اظہار کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ بلکہ ان میں زندگی کے مختلف حقائق کو سمویا ہے۔ گویا ان کا کلام ایک ایسا شیشہ ہے جس میں زندگی کی شراب اپنے اصلی رنگ اور کیف کے ساتھ بڑی چھلک رہی ہے۔ پھر موجودہ ترقی پسند شاعری کی سی ایمائیت و اشاریت کو کام میں لاکر شاعر نے اپنے کلام کو ناقابلِ فہم نہیں بننے دیا۔ بلکہ خیالات سلجھے ہوئے ہیں۔ اور ان میں شعریت اور تغزل کی جلوہ فرمائی موجود ہے۔ کلام کا حسن تکلف اور آورد سے پاک ہے۔ اور برجستگی اور بے ساختگی ہر قدم پر نمایاں ہے۔ اکثر غزلیں اتنی ہموار ہیں کہ ان میں اچھے اشعار کا انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔

پہلی ہی غزل اول سے آخر تک حقائق سے لبریز اور ترنم و نغمگی کی کیفیت سے مالا مال ہے۔ مطلع ہی سن کر آدمی پھڑک جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہیں نا شناسِ راہ کوئی ہمسفر نہیں
لے جائے سیلِ زیست کہاں کچھ خبر نہیں

اس غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

جب اپنے بال و پر تھے کٹی وہ قفس میں عمر
باہر قفس سے آگئے تو اب بال و پر نہیں

آخر کے دو شعر قطعہ بند ہیں۔ ان میں موجودہ دور کی سطحیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

اب مقصدِ حیات حصولِ نشاط ہے
سمجھیں جو زندگی کو وہ اب دیدہ ور نہیں
یہ تیرگیٔ جہل مقدر ہی بن نہ جائے
کوئی کہیں نشانِ نمودِ سحر نہیں

دوسری غزل چھوٹی بحر میں ہے مگر ہر شعر میں کیسے نشتر بھر دیئے ہیں۔ دو تین اشعار میں ان نشتروں کی چبھن ملاحظہ ہو۔

ہے محبت کی زندگی بھی عجیب — بے قراری ستم قرار غضب
آزمائش سی آزمائش ہے — نگہ شوق اور شرطِ ادب
ان کے جینے کو زندگی کہیے — جن کے دل میں نہ آرزو نہ طلب
نغمہ و رقص و مطرب و ساقی — ان پہ تہذیب کا مدار ہے اب

موجودہ دور کے دانشوروں کی دانش و بینش کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جن میں الجھے ہوئے ہیں فرزانے — کچھ ہیں اوہام کچھ ہیں افسانے
بڑھ رہی ہے جہاں میں دانائی — بڑھ رہے ہیں دلوں کے ویرانے

حبیب احمد صاحب کی شاعری میں طنز کا عنصر بھی ملاحظہ ہو۔

بات ناصح کی جب کبھی مانی — بڑھ گئی اور بھی پریشانی
خونِ انساں کی ایسی ارزانی — اللہ اللہ عروجِ انسانی
لگے وقتوں کی یہ تو باتیں ہیں — ظلم پر اب کہاں پشیمانی

. . . .

قصر و ایواں تو جگمگاتے ہیں — زندگی میں نہیں ہے تابانی

دوسرے شعرا کے کلام میں سے اچھے اشعار کا انتخاب مشکل ہوتا ہے۔ حبیب صاحب کے یہاں سے ناپسندیدہ اشعار کو چھانٹنا دشوار ہے۔ جناب ماہر القادری صاحب نے اس مجموعہ کلام پر ایک اچھا پیش لفظ لکھا ہے۔ لیکن بخوفِ طوالت انہوں نے گیارہ صفحات کے بعد

یہ کہہ کر کہ "خوفِ طوالت اور گنجائشِ صفحات نے میرے قلم کو روک دیا ہے!" اس بیش لفظ کو ختم کر دیا ہے ناچیز تبصرہ نگار بھی ان ہی کی تقلید میں یہ مصرع گنگناتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ ع

داماںِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

علامہ اقبالؔ نے کسی موقع پر کہا تھا۔ ع

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

تبصرہ نگار بھی اسی معذرت کے ساتھ اس تحریر کو ختم کرتا ہے۔

نظرات از:۔ وقار احمد رضوی۔ ناشر: ملک نورانی۔ مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی سائز $\frac{23 \times 36}{16}$ ضخامت ۲۳۷ صفحات۔ قیمت ۱۲ روپے اور ۲۰ روپے۔

یہ کتاب چند ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو بظاہر مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے۔ باب اول کا موضوع ادب ہے۔ باب دوم میں نقدِ ادب سے بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں شعر کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ باب چہارم نقد الشعر سے متعلق ہے اور باب پنجم میں ارکانِ نقد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان تمام موضوعات کا تعلق وجدان اور ذوقِ سلیم سے ہے۔ خصوصاً شاعری اور ادب کی ماہیت و حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دینا ایک دقیق مسئلہ ہے لیکن قابل مصنف نے اس مرحلہ کو نہایت کامیابی سے طے کیا ہے۔ اور ہر بات کو اس انداز سے پیش کر دیا ہے کہ قاری کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی چنانچہ پہلے باب کو دو فصلوں میں تقسیم کر کے پہلی فصل میں بتایا ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور دوسری فصل میں ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ ادب کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے مصنف نے بھی اس سعیٔ لاحاصل سے اجتناب کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ایک مجموعی تاثر قائم کیا ہے۔

نقدِ ادب کے سلسلہ میں اول ادبی تنقید کا مفہوم سمجھایا ہے۔ پھر نقد کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی، ماہیت کو واضح کیا ہے۔

اسی طرح شعر اور نقد الشعر کے بھی لوازمات سے بحث کر کے ان کی حقیقت و ماہیت کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چونکہ مصنف کا عربی ادب کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور اپنی اس کتاب کے لئے بنیاد عربی ادب شاعری اور نقد کو بنایا ہے اس لئے ان کو جانچنے کے لئے اصول ضوابط عربی ہی سے مستعار لئے ہیں۔ اور چونکہ بقول مصنف نقد الشعر میں قدامہ بن جعفر کو اولیت کا فخر حاصل ہے اس لئے اس کے خیالات اور نظریات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

آخری باب میں ارکانِ نقد سے بحث کی گئی ہے۔ سہولت کے لئے اس باب کو دوسرے ابواب کے خلاف پانچ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اول میں جذبہ، فصل دوم میں خیال، فصل سوم میں مواد،

فصل چہارم میں ہیئت اور فصل پنجم میں اسلوب کی وضاحت ہے۔
غرض پوری کتاب ادبی نوعیت کی ہے۔ خود مصنف نے ان مسائل پر برسوں غور وفکر کیا ہے۔ اور پھر بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تحریر میں ادبیت کی چاشنی موجود ہے۔ اور خالص فلسفیانہ انداز نہ ہونے کی وجہ سے قاری کے ذہن پر بوجھ نہیں پڑتا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے مشمولات کو سمجھنے کے لئے مذاقِ سلیم کا سہارا درکار ہے۔

مُصحفی حیات وکلام

از۔ افسر صدیقی امروہوی۔ ناشر۔ مکتبۂ نیا دور۔ کراچی ۵۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۳۳۸ صفحات قیمت ۱۵ روپے

اُردو شاعری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی حیثیت ایک اہم کڑی کی سی ہے۔ وہ اُردو شاعری کے دو مختلف ادوار کو ملاتے ہیں۔ انہوں نے میر و سودا کے دور میں آنکھ کھولی۔ اس دور کے شعراء کے درمیان رہ کر ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔ قائم چاندپوری کے ساتھ وہ ٹانڈے کے مقام پر کچھ روز ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ اور ان کی صحبت کے فیض سے انھوں نے اُس دور کی شاعری کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کیا۔ پھر شعرائے متوسطین یعنی انشاء اور جرأت کے ساتھ مل کر گیسوئے اُردو کو بنایا سنوارا۔ غالباً ان ہی مختلف اثرات کا نتیجہ ہے کہ ان کے کلام میں متقدمین اور متوسطین بلکہ بعض اوقات متاخرین کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔

مصحفی ایک پُرگو شاعر اور ایک عظیم استاد تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد نہایت کثیر ہے۔ وہ سخن سنج ہونے کے ساتھ ساتھ سخن فہم بھی تھے چنانچہ جہاں انہوں نے آٹھ دیوانوں کے بقدر کلام پیش کیا ہے۔ وہاں شعراء کے تین تذکرے لکھ کر ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ اُن کے مرتب کئے ہوئے تذکروں میں سے دو یعنی تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا اُردو شعراء کے اور عقدِ ثریا فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔

مصحفی کا ذکر سب سے پہلے تذکرہ آبِ حیات میں سید انشاء اللہ خاں انشاء کے حریف کی حیثیت سے پڑھا تھا۔ اگرچہ اس میں انشاء کی طرفداری کا رنگ نمایاں تھا تاہم مصحفی کی پُرگوئی اور استادی کا بھی پوری طرح اندازہ ہوتا تھا۔ پھر مولانا محمد فیح صاحب کی تالیف "اُردو کا سب سے پہلا محسن شاعر" نظر سے گذری اور اس سے اُس عظیم شاعر کے کارنامے زیادہ نکھر کر سامنے آئے۔ کافی عرصہ کے بعد نگار کا مصحفی نمبر جو بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں دیگر مضامین کے علاوہ صاحب "یادگار انیس" امیر احمد علوی مرحوم کا بھی ایک طویل مضمون تھا جس سے مصحفی کی عظمت کا دل پر گہرا نقش قائم ہوگیا۔ پھر ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی کی کتاب "مصحفی اور اُن کا کلام" نے متاثر کیا۔ اب افسر صدیقی امروہوی صاحب کی کتاب سامنے آئی ہے۔ اس کو پڑھ کر جہاں شاعر کے متعلق وسیع معلومات حاصل ہوئی ہیں وہاں مؤلف کتاب کی محنت وکاوش کا بھی پوری طرح اندازہ ہوا ہے۔

یہ کتاب اس قسم کے لٹریچر میں محض ایک اضافہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کو ایک اہم تحقیقی مقالہ کہنا

زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ مؤلف موصوف نے تمام قابلِ ذکر ماخذوں کو سامنے رکھا ہے۔ اور اُن سے یہ قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ پھر انہوں نے دوسروں کی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے غور و خوض کے بعد خود فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے شاعر کے اجداد، مولد، وطن، سنہ پیدائش، تعلیم و تربیت۔ امروہہ، لکھنؤ، دہلی وغیرہ میں قیام کا زمانہ انشاؔ سے ان کی معرکہ آرائی، اخلاق و عادات۔ مذہب و مشرب اور تاریخ وفات پر تفصیلی بحث کی ہے اور روایت و درایت کی روشنی میں صحیح نتائج نکالے ہیں۔ پھر تصنیفات، تلامذہ اور اصلاحی کارناموں کا پوری طرح جائزہ لیا ہے۔ اور آخر میں ان کے کلام پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ اُن کی شاعری میں متقدمین، متوسلین اور بعض متاخرین کا رنگِ سخن صاف طور پر جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سے ان کی وسعتِ نظر اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر دوسرے شاعروں سے ان کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے خصوصاً میرؔ اور غالبؔ کے کلام کو اُن کے کلام کے سامنے رکھ کر جانچا ہے۔ اور دونوں میں یکساں عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ مصحفیؔ اور غالبؔ کے بہت سے ہم مضمون اشعار منتخب کر کے یکجا کر دیئے ہیں اور دونوں میں یکسانیت کی وجہ مؤلف موصوف نے یہ بتائی کہ "یہ اثر شاید اس بات کا ہے۔ کہ شیخ مصحفیؔ کی طرح مرزا غالبؔ بھی غزل گوئی میں نظیریؔ نیشاپوری کے مقلد و متبع تھے۔" اس مقابلہ کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

مصحفیؔ کا شعر ہے۔

فصلِ گل سو بار آئی ہم نہ چھوٹے قید سے
بند ہیں کنجِ قفس میں ایک مدت ہو گئی

مرزا غالبؔ کا شعر ملاحظہ ہو

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مصحفیؔ کا ایک اور شعر ہے۔

کوچہ ہو ترا یا کسی مقتل کی زمیں ہو
مرنا ہی ہمیں مدِ نظر ہے تو کہیں ہو

غالبؔ کا مشہور شعر ہے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

محبوب کی بزمِ نشاط اور عاشق کی گریہ و زاری کا نقشہ مصحفیؔ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

شب تری مجلس میں واں دورِ قدح چلتا رہا
تا سحر یاں آنسوؤں سے سبحہ گردانی ہوئی

غالبؔ اسی سے ملتے جلتے مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

آخر میں اشاریہ۔ کتابیات اور غلط نامہ دے کر کتاب کو مکمل کر دیا ہے۔

غرض یہ ایک اچھی کاوش ہے اور اس کے لئے مؤلف تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔

ـــــ ، ـــــ ، ـــــ ، ـــــ ، ـــــ

مہران گرامی نمبر | سندھی ادبی بورڈ، ملک کا مشہور علمی ادارہ ہے۔ اس سے فارسی عربی کی بہت اہم کتابیں ماضی قریب میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں سندھ کی سیاسی وعلمی تاریخ کے اہم ماخذ ہیں۔ سندھی ادب پر یہ ادارہ کثیر تعداد میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ اس کا ایک علمی وتحقیقی سہ ماہی رسالہ "مہران" نکلتا ہے۔ اس کے کئی وقیع خاص نمبر مثلاً مشاہیر نمبر وغیرہ شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے نامور مدیر مولانا غلام محمدؒ گرامی تھے۔ قدیم دارالعلوم کے تعلیم یافتہ تھے مگر وہ جدید رجحانات سے بخوبی مستفیض تھے۔ ایک عرصے تک وہ مہران کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۵۸ء میں بحیثیت مدیر مہران مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے نہ صرف مہران نے ترقی کی بلکہ اس نے ایک تحریک برپا کردی۔ پچھلے سال اچانک مولانا گرامی کا انتقال ہوگیا۔ مہران کا یہ خاص نمبر گرامی نمبر اُن کی یاد میں نکالا گیا ہے۔ اس میں نامور علماء، ادیبوں اور گرامی مرحوم کے ساتھیوں کے مضامین اور مقالات شامل ہیں۔ جو انہوں نے مرحوم کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ مضمون نہایت وقیع ہیں۔ اس سے مولانا گرامی کی شخصیت کا ایک حسین اور وقیع مرقع سامنے آتا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ اس خصوصی نمبر کی اشاعت پر علمی دنیا کی طرف سے مبارک باد کا مستحق ہے۔ حکیم ریحان الزمان اکبرآبادی

تذکرۃ المحدثین | تالیف مولانا غلام رسول سعیدی سائز ۱۲×۱۸/۸ مجلد صفحات ۳۲۸ قیمت ۱۶/۵۰ روپیہ۔ ناشر مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور (اشاعت ۱۹۷۷ء)

مولانا غلام رسول سعیدی ملک کے مشہور عالم اور مصنف ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کئی وقیع تصانیف منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ انہوں نے زیر تبصرہ کتاب محدثین کے حالات میں لکھی ہے جس میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمدؒ حنبل، امام محمد، امام طحاوی، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ جیسے اجل محدثین کرام کے حالات نہایت صحت وتحقیق کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔ ان کی تصانیف کا پورے طور سے تعارف کرایا ہے۔ مولانا کے قلم میں زور ہے اور بعض جگہ انہوں نے نقد وتبصرہ بھی کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ دارالمصنفین نے اس سلسلہ میں اچھا کام کیا تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پاکستان میں بھی دارالمصنفین کے انداز پر علماء ومحققین نے کام شروع کردیا ہے۔ تذکرۃ المحدثین اسی پایہ کی کتاب ہے۔ یہ کتاب کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے لئے بھی مفید ہے۔ حکیم ریحان الزماں اکبرآبادی

۱۔ **راج ترنگنی** از ملا شاہ محمدؒ شاہ آبادی مرتبہ ڈاکٹر صابر آفاقی صفحات ۵۲۰

۲۔ **کتاب خانہ ہائے پاکستان** از محمد حسین تسبیحی صفحات ۵۳۰

۳۔ **قران السعدین** از امیر خسرو مرتبہ ڈاکٹر احمد حسن دانی صفحات

ادارہ مرکز تحقیقات ایران وپاکستان فارسی کا صدر دفتر اسلام آباد میں ہے۔ یہ ادارہ علم وادب کی

(بقیہ صفحہ ۲۵۶ کالم نمبر ۲ پر)

مطبوعات

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نظامت تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) کراچی سے منظور شدہ کتابیں

۱۔ انگلستان میں ہمارا سفر۔ مصنفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۲۴ روپیے

۲۔ رسم الخط اور پاکستان۔ مصنفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ا روپیہ

۳۔ قدیم ہنشاہیاں۔ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ۶ روپیے

۴۔ نقد ادب۔ مترجمہ۔ ل احمد اکبرآبادی ۶ روپیے

۵۔ سرسید کا علمی کارنامہ۔ مصنفہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳ روپیے

۶۔ اردو زبان اور اسالیب۔ مصنفہ سید محمد محمد رضوی مخمور اکبرآبادی ۱۸ روپیے

۷۔ مشرقی و مغربی تہذیب۔ مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں ایم اے پی ایچ ڈی (لیڈز) ۶ روپیے

۸۔ راہی اور راہ نما۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۲ روپیے

۹۔ ثقافت اور انتشار۔ مترجمہ۔ اخلاص حسین زبیری ایم اے، نظام عظیم برنی ایم اے ۱۲ روپیے

۱۰۔ طالب علم کی ڈائری۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۶ روپیے

۱۱۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ مصنفہ محمد امین زبیری ۴ روپیے

۱۲۔ نواب خاں بہادر خاں شہید۔ مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۸ روپیے

۱۳۔ عہد بنگش کی علمی سیاسی اور ثقافتی تاریخ۔ مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبرآبادی ۲۴ روپیے

۱۴۔ اصول تدریس۔ مترجمہ۔ اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۰ روپیے

۱۵۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی ۵ روپیے

۱۶۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ مصنفہ محمد حسین خاں زبیری ۸ روپیے

۱۷۔ اسرار کائنات۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ ۱۲ روپیے

۱۸۔ مفکرین تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر ضیاء الدین احمد ۱۴ روپیے

۱۹۔ اصول اور اساسِ تعلیم ۔ مترجمہ انعام عظیم برنی ایم اے اخلاص حسین زبیری ایم اے وغیرہ ۱۴ روپیے

۲۰۔ تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ ۔ مصنفہ پروفیسر وحید الحق صدیقی سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۸ روپیے

۲۱۔ عظیم علمائے نفسیات ۔ مترجمہ ۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۴ روپیے

۲۲۔ مادری زبان کی تعلیم ۔ مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم اے ۶ روپیے

۲۳۔ جان ڈیوی کا فلسفہ تعلیم ۔ مترجمہ سید عین الدین علوی ایم اے (علیگ) ۵ روپیے

۲۴۔ تعلیمی مسائل ۔ پس منظر و پیش منظر ۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۶ روپیے

۲۵۔ مقاصد تعلیم ۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ ۱۲ روپیے

۲۶۔ ارتقائے انسانی ۔ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد (موجودہ سائنس کی روشنی میں) منگلوری (علیگ) ۴ روپیے

۲۷۔ چند عظیم علمائے جرائم ۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۰ روپیے

۲۸۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم ۔ مصنفہ پروفیسر سعید احمد رفیق ایم اے ۶ روپیے

۲۹۔ خط و خطاطی ۔ مصنفہ شیخ ممتاز حسین جونپوری ۳ روپیے

۳۰۔ جمہوریت اور تعلیم ۔ مترجمہ ۔ سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ جلد اول ۲۰ روپیے

۳۱۔ جمہوریت اور تعلیم ۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ جلد دوم ۱۵ روپیے

۳۲۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی ۔ مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۱۶ روپیے

۳۳۔ بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقاء ۔ مرتبہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و پروفیسر وحید الحق صدیقی ۱۴ روپیے

۳۴۔ تعلیم و تربیت ۔ مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی ۔ ۱۰ روپیے

۳۵۔ سائنس کے کرشمے ۔ مصنفہ مسرور احمد توقیر ایم اے ۸ روپیے

۳۶۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) و پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ۲۴ روپیے

۳۷۔ ان کی کہانیاں ۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۔ ۴ روپیے

حوالجات منظوری

+1. NO-D.I.G.S./A(12164)/67 DATED 28.5.1967.

+2. NO.D.E/F-PUB/(126)/(7820-8170)/60 DATEDED, 20.5.1969.

+3. NO.D.E.F.PUB/(11-A)/(1308-1630)/72 DATED 8.1.1972.

۳۸۔ مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم ۔ تالیف ۔ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی۔ مقدمہ ۔ مرزا علی اظہر برلاس بی اے بی ایل - ۱۰ روپیے

۳۹۔ تعلیم و تعلم ۔ مرتبہ ۔ سید الطاف علی بریلوی ۔ مقدمہ سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱۴ روپیے

۴۰۔ تعلیم بالغان اور اُس کی قومی اہمیت ۔ تصنیف مولوی مظہر الرحمان بچھرایونی ۔ مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین پی ایچ ڈی ۶ روپیے

۴۱۔ تعلیم کے ابتدائی اصول ۔ تصنیف ۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین (حصہ اول و دوم) ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ ۔ مترجمہ مولوی سبطین احمد بدایونی ۲۰ روپیے -

۴۲۔ پاک و ہند میں تعلیمی ترقی ۔ مترجمہ سید احسن یارہردی ایم اے (علیگ) ۵ روپیے

۴۳۔ اقبال کے تعلیمی نظریات ۔ تصنیف محمد احمد صدیقی بی اے (آنرز) ایم اے بی ٹی (علیگ) تعارف و مقدمہ ۔ سید الطاف علی بریلوی و اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۶ روپیے

۴۴۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن ۔ تصنیف (بزبان انگریزی) پروفیسر محمد حامی الدین (جلد اول ۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء) خاں ایم اے ۲۴ روپیے

۴۵۔ رفقائے عظیم (گریٹ کمپینس) تصنیف میکس ایسٹ مین مترجمہ ۔ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے علیگ ۔ ۲۰ روپیے

۴۶۔ حیاتِ مابعد ۔ تصنیف ۔ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی ۔ مقدمہ ڈاکٹر ایم ایم احمد چیرمین شعبۂ فلاسفی کراچی یونیورسٹی ۵ روپیے

۴۷۔ تجدد امثال ۔ تصنیف ۔ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی ۔ مقدمہ ۔ ڈاکٹر ایم ایم احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۴ روپیے

۴۸۔ مقدر انسانی (ہیومن ڈسٹنی) تصنیف لی کامٹ دو نوائے مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی (علیگ) ۱۶ روپیے

۴۹۔ یادیں اور خاکے ۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۔ مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۶ روپے

۵۰۔ تاثرات و مشاہدات ۔ تصنیف ۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۔ مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے پی ایچ ڈی ۔ ۶ روپیے

۵۱۔ پاکستان کا معاشی پس منظر ۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی پیش لفظ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے ڈی لٹ ۷ روپیے

۵۲۔ مولانا محمد علی جوہر حیات اور تعلیمی نظریات ۔ مصنفہ ۔ ثناء الحق صدیقی ایم اے ۸ روپیے

۵۳۔ مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم ۔ مصنفہ ۔ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۲۰ روپیے

۵۴۔ تجزیۂ کلامِ غالب ۔ مصنفہ ۔ سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ ۱۲ روپیے

۵۵۔ ادب منزل بمنزل ۔ مصنفہ ۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۲ روپے

۵۶۔ مکاشفاتِ کشفی ۔ مصنفہ ۔ میجر غلام بہادر مرزا ابوجعفر کشفی پیش لفظ خان بہادر رضا علی وحشت

تعارف و تبصرہ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر
جمیل مظہری ایم اے ۶ روپیے

۵۷۔ **وادیٔ نیل** ۔ تصنیف ۔ محمد قطب الدین
ایم ایس سی عثمانیہ
مقدمہ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۲۴ روپیے

۵۸۔ **تاریخی شہ پارے** ۔ از مرزا علی اظہر
برلاس بی اے بی ایل ۲۰ روپیے

۵۹۔ **مسلمانانِ بنگال کی تعلیم** ۔ از سید مصطفیٰ علی
بریلوی بی کام ایل ایل بی ۲۰ روپیے

۶۰۔ **فرحت الناظرین** ۔ مصنفہ ۔ محمد اسلم خلف
محمد حافظ پسروری ۔ مترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری
ایم اے ۱۶ روپیے

۶۱۔ **مقالاتِ بریلوی** ۔ از سید الطاف علی
بریلوی بی اے (علیگ) ۲۰ روپیے

۶۲۔ **چند محسن چند دوست** ۔ مقدمہ ۔ ڈاکٹر
ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی (ستارۂ پاکستان)
تصنیف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپیے

۶۳۔ **حکیم عمر خیام** ۔ تالیف ابو المکارم سلیم الدین فہمی
مقدمہ سید الطاف علی بریلوی ۵ روپیے

۶۴۔ **صوفیائے بہار اور اردو** ۔ تصنیف پروفیسر
محمد معین الدین دردائی ایم اے (علیگ) ۸ روپیے

۶۵۔ **صوفیائے سندھ اور اردو** .... ۱۴ روپیے

۶۶۔ **مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں** ۔ از پروفیسر
محمد یعقوب بخش راغب بدایونی
.. .. ۴ روپیے

۶۷۔ **ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں** ۔ مترجمہ ڈاکٹر
زبید احمد ایم اے
بزبانِ انگریزی پی ایچ ڈی
۱۴ روپیے

۶۸۔ **ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں** ۔ از مولانا
(بنگالی ترجمہ) غلام محی الدین
ایڈیٹر 'آج' ڈھاکہ ۳ روپیے

۶۹۔ **مشاہیر کے تعلیمی نظریئے** ۔ تالیف مولوی
(انگریزی ترجمہ) محمد حسین خاں
زبیری ایم اے ۔ مترجمہ عظیم الدین خاں ایم ۔ اے
(علیگ) اخلاص حسن زبیری ایم ۔ اے ۔ پیش لفظ
سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۶ روپیے

۷۰۔ **حاصلِ مطالعہ** ۔ تصنیف سید الطاف علی
بریلوی ، مقدمہ ، پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم اے
پی ایچ ڈی لٹ ۱۶ روپیے

۷۱۔ **انشائیے** ۔ تصنیف رشید احمد صدیقی
ایم اے مقدمہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی
تعارف : سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپیے

۷۲۔ **غالب نمبر (العلم)** مرتبہ سید الطاف علی
بریلوی ۲۰ روپیے

۷۳۔ **علمائے سلف و نابینا علماء** ۔ تصنیف ۔ نواب صدر
یار جنگ مولانا
حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۔ تعلیقات و حواشی
مفتی انتظام اللہ شہابی و ثناء الحق صدیقی ایم اے
تعارف علامہ سید سلیمان ندوی ۱۸ روپیے

...حیات حافظ رحمت خاں۔ تالیف سید
لطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) مقدمہ۔ مولوی
نظام الدین حسین نظامی (بدایونی) ۲۰ روپیے

۷۵۔ لائف آف حافظ رحمت خاں
(انگریزی ترجمہ) تالیف سید الطاف علی بریلوی
ترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے ۳ روپیے

۷۶۔ علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی)۔ مولفہ مولوی
عبد القادر برلاس جلد اول و دوم
ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی۔ ترتیب و حواشی
پروفیسر محمد ایوب قادری تعارف نواب صدر یار جنگ
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۳۲ روپیے

۷۷۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات تعارف سید الطاف علی بریلوی
مولف مولانا اعجاز الحق قدوسی۔ تعارف۔ ڈاکٹر
این میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی (مغربی جرمنی)
پیش لفظ جمیل جالبی ایم اے ناشر سید الطاف علی بریلوی ۳۰ روپیے

۷۸۔ عہد اسلامی میں علمی ترقی۔ مصنف ڈاکٹر
ین این لا مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و
سلطان فاطمہ بلخی ایم اے ۱۶ روپیے

۷۹۔ تعلیمات حضرت شاہ مینا۔ مولف۔ الحاج
(تلخیص و ترجمہ فوائد سعدیہ) محمد خصلت حسین
صابری ایم اے (علیگ)۔ مقدمہ مفتی محمد انتظام اللہ
شہابی اکبر آبادی ۶ روپیے

۸۰۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن ۔ از پروفیسر
حصہ دوم ۷۵۱ء / ۱۸۵۴ھ محمد حامی الدین خاں ایم اے
۲۴ روپیے

بقیہ صفحہ ۲۵۱ کالم ۲ کا
گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اب تک اس کی دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہیں۔ خصوصًا فارسی فرہنگ نویسی و ادب کے سلسلے میں اس ادارے نے بلاشبہ بڑا کام کیا ہے۔ ادارہ کا ایک وقیع کتب خانہ ہے جس میں بلاشبہ ہزاروں مخطوطات جمع کئے گئے ہیں۔ اس وقت ادارہ کی تین کتابیں پیش نظر ہیں۔ جو اپنے موضوع پر نہایت اہم ہیں۔ راج ترنگنی کشمیر کی قدیم تاریخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سنسکرت زبان میں تھی۔ جس کو ملا شاہ محمد نے فارسی کا جامہ پہنایا۔ یہ کتاب ادارہ نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ فارسی ادب و تاریخ میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔

محمد حسین تسبیحی کتابیات و کتابداری کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے پاکستان کے کتب خانوں پر بڑا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا نام اور کام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ انہوں نے پاکستان کے کتب خانوں پر دو جلدیں لکھی ہیں جس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب آپ اپنی مثال ہے۔ ادارہ نے امیر خسرو کی مشہور مصور مثنوی قران السعدین کو عکسی صورت میں نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس پر ملک کے مشہور مورخ و محقق ڈاکٹر درانی نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت پر ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے آج کل مرکز کے ڈائریکٹر علی بیرنیا ہیں جن کی سرکردگی میں ادارہ خوب کام کر رہا ہے۔ حکیم ریحان الزماں اکبر آبادی۔

Dr. Sir Mohd. Iqbal. Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اقبال

دین و سیاست

نظم بخطِ علامہ اقبالؒ
جو سر سید راس مسعود صاحب کو بھیجی گئی تھی
(عطیہ: پروفیسر جلیل احمد قدوائی (علیگ)

قومی پبلک لائبریری
صدر دفتر
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کراچی

